غزل قدیم

متغزلین جدید

مینائے غزل

اختتامیہ

۴۰۶ – عشق رکن الدین، ۵۱۷
۴۰۷ – شاعر مہر کلو، ۵۱۸
۴۰۸ – جوہر بادصو رام، ۵۱۸
۴۰۹ – جوہر جواہر سنگھ، ۵۱۹
۴۱۰ – ذاکر ذاکر علی، ۵۱۹
۴۱۱ – سحر اقبال بہادر، ۵۲۰
۴۱۲ – عزیز ولایت حسین، ۵۲۰
۴۱۳ – احسن لکھنوی، مہدی حسن، ۵۲۱
۴۱۴ – سرور درگا سہائے، ۵۲۱
۴۱۵ – تشنہ حافظ ولی یوسف خاں، ۵۲۲
۴۱۶ – شوق جگموہن ناتھ، ۵۲۲
۴۱۷ – طالب لطافت علی، ۵۲۳
۴۱۸ – نور محمد وزیر علی، ۵۲۳
۴۱۹ – مہجور ... پرشاد، ۵۲۴
۴۲۰ – کمی رضی الدین حسن، ۵۲۴
۴۲۱ – آسی ... تعلیم، ۵۲۵
۴۲۲ – مراد میر مراد شاہ، ۵۲۵
۴۲۳ – وسیم محمد عسکری، ۵۲۶
۴۲۴ – کامل علی میاں، ۵۲۶
۴۲۵ – جگر بسوانی، ۵۲۷
۴۲۶ – ثاقب بسوانی، ۵۲۷
۴۲۷ – فیروز حکیم فیروز الدین ۵۲۸
۴۲۸ – طالب بشارت علی ۵۲۸
۴۲۹ – ذکی، محمد دین، ۵۲۹
۴۳۰ – حامی پیر وزیر علی، ۵۲۹
۴۳۱ – نیرنگ میر غلام بھیک، ۵۳۰
۴۳۲ – ازل عبدالمجید، ۵۳۰
۴۳۳ – شوق ظہیر حسن ۵۳۱
۴۳۴ – ناظم میر ناظر حسین، ۵۳۱
۴۳۵ – حنیف احمد حسین خاں، ۵۳۲
۴۳۶ – سجاد سجاد علی، ۵۳۲

۴۳۷ – شیدا رام رچپال سنگھ، ۵۳۳
۴۳۸ – شمس مینائی، عبدالرحمن، ۵۳۳
۴۳۹ – اشک واجد علی خاں، ۵۳۴
۴۴۰ – اظہر خدا بخش، ۵۳۴
۴۴۱ – زاہد عابد حسین، ۵۳۵
۴۴۳ – عیش ... خاں، ۵۳۵
۴۴۴ – نیر واسطی، حکیم سید علی احمد، ۵۳۶
۴۴۵ – عبرت محمد تبارک علی، ۵۳۶
۴۴۶ – ہادی مچھلی شہری، ۵۳۷
۴۴۷ – رسا ... خاں، ۵۳۷
۴۴۸ – رنا پنڈت میلا رام، ۵۳۸
۴۴۹ – نظیر ... حسین، ۵۳۸
۴۵۰ – طالب بدایونی، ۵۳۹
۴۵۱ – ثاقب محمد صدیق، ۵۳۹
۴۵۲ – حرماں فرید احمد، ۵۴۰
۴۵۳ – عاصی کرنالی، ۵۴۰
۴۵۴ – لطیف انور گورداسپوری، ۵۴۱
۴۵۵ – منظور چودھری منظور احمد، ۵۴۱
۴۵۶ – پیام محمد یامین خاں، ۵۴۲
۴۵۷ – کورڈ نیازی، محمد حیات خاں، ۵۴۲
۴۵۸ – کسری منہاس، غلام حسن، ۵۴۳
۴۵۹ – تبسم عبدالرشید، ۵۴۳
۴۶۰ – ضیا جعفری، سید عنایت علی شاہ، ۵۴۴
۴۶۱ – ولی شاہ ولی الرحمن، ۵۴۴
۴۶۳ – اختر اورینوی، سید اختر احمد، ۵۴۵
۴۶۴ – جگر شاہ نصیر الدین، ۵۴۵
۴۶۵ – تمنا ... الدین مجیبی
۴۶۶ – وفا محمود عالم، ۵۴۶
۴۶۷ – شمس منیری، حافظ شمس الدین، ۵۴۶
۴۶۸ – بیدل عبدالمنان، ۵۴۷

حصۂ نثر

اُردو غزل اور متغزلین
(صنفِ غزل کے بارے میں نقادانِ فن کا اظہارِ خیال)

(۲)
(تذکرہ نویسوں کی آرا ممتاز شعرا کے بارے میں)

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس اُردو بازار لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اُردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ، اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کے انتخاب سے شعر بہ شعر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتح پوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے وہ خلوص نیت سے ایسا ہی سمجھتے ہی ہوں گے۔ یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومن غالب سے بڑا شاعر تھا یا غالب مومن سے۔ کلیم الدین احمد نے تو اس صنف سخن ہی کو نیم وحشی قرار دے دیا ـــ ہم ایسے تمام جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں ہمیں تو نقادوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ ان میں سے بیشتر لکیر کے فقیر بننے میں پوری سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہوا کہ جو بعض اچھا کہنے والے رہ گئے تو بس رہ ہی گئے۔ حالانکہ ژرف نگاہ نقاد کے پاس مسیحائی کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو مرے ہوئے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے ہم میں سے بعضوں کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ یہ غزل ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

ظفر کی نہیں ہے بلکہ ایک اُمی شاعر حسامی کی ہے۔ ہم میر و غالب کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ بعض شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں :-

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
(آصف)

میں نے آنکھوں سے لیا اس کو
پھول جو دست باغباں سے گرا
(میر حسن خلیق)

آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
(میر امانی اسد)

اس نمبر میں جتنے بڑے بڑے شعراء ہیں ان کی غزلوں پر بیشک جھوم جھوم جائیے۔ لیکن ان شعراء کو ضرور پڑھئے جن کی ایک ایک یا دو دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ افسوس کہ اتنے مختصر وقت میں ہمیں ایسے شعرا کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ہم اپنی تمام تر توجہ اس حصّہ پر صرف کر دیتے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ان زندہ رہنے والے گمنام شاعروں پر کام کرے۔ جب مجھ ایسا شعر دشمن بھی اس کلام کی افادیت سے منکر نہیں ہو سکا تو اُردو شاعری پر کام کرنے والے کیوں خاموش ہیں؟

ہم نے اس نمبر کی ترتیب میں کن کن امور کا خیال رکھا، اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گذرے اور کون کون سے تذکروں سے استفادہ کیا، اس کی کہانی کافی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ موجودہ دور کے شعراء کی فنی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ منزل ہی پیچھے رہ گئی۔ بعض شاعروں کو ہم اس نمبر میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کوتاہی کے باعث ہماری دسترس ان کے کلام تک نہ ہو سکی اس لیے بادلِ نخواستہ انھیں چھوڑنا پڑا ——— نہ جانے ہم اتنی احتیاطوں کے باوجود کہاں تک کامیاب ہوئے؟

اس نمبر میں بعض شعرا کی دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی ——— اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ایک غزل والا شاعر بہر حال چھ غزلوں والے شعراء سے کمتر کہنے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں ایسی تھیں جن کی بنا پر ایسا کرنا پڑا ——— ویسے ہماری کوشش یہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولی، میر، سودا درد ایسے درجہ اوّل کے شعرا کے ساتھ دورِ متاخرین کے درجہ اوّل کے شعرا اقبال، حسرت، حفیظ اور فراق تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے۔ اس طرح ہم نے درجہ دوم اور سوم کے مرتبہ کے شعرا کو ایک ساتھ لانا چاہا۔ یہاں یہ اعتراف کرا یا جائے تو بہتر ہو گا کہ پرانے شعرا نے اس حدبندی میں ہم سے ضرور زیادتی ہوئی ہے (یہ ایک مجبوری تھی اس لیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے بعض اہم شعرا کے ہمیں دواوین ہی نہیں ملے) لیکن حتی الامکان موجودہ شعرا کے ساتھ پورے دیانتدارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے۔

اس شمارہ کا سرورق عبد الرحمٰن چغتائی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک تابندہ مثال ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

اگر اس نمبر کے سلسلہ میں حبیب اشعر، ملک اسلم، کلیم احسن کلیم، محمد عبد اللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھر پور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔

محمد طفیل
۱۰ رمئی ۱۹۵۴ء

(۲)

بچپن کی بات ہے کہ جب مجھے معاملاتِ حسن و عشق کا کچھ بھی پتہ نہ تھا (پتہ تو خیر اب بھی نہیں ہے) میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی خریدی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بعد کے صفحات میں، وہ تمام اشعار لکھے تھے۔ جو مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند آئے تھے۔ بچپنے کی عادت نے "بڑھاپے" میں بھی پیچھا نہ چھوڑا! دسمبر ۱۹۵۲ء میں، میں نے غزل نمبر کے نام سے نقوش کا ایک نمبر شائع کر دیا۔ جو خلافِ امید اتنا مقبول ہوا کہ میں "حیران" رہ گیا تھا — معلوم ہوا۔ ابھی میری طرح کے صاحبانِ دل موجود ہیں — جی بہت خوش ہوا۔

۱۹۵۶ء میں جب میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسے اور "معتبر" بنانے کے لیے غزل سے متعلق، تراکار آمد قسم کا نثر کا حصہ بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی جو جو کام کے شعرا پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔ انہیں بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا بٹھایا۔ پہلے شمارہ کی ضخامت ۴۸۰ صفحات تھی۔ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ۵۶۰ صفحات تک پہنچی۔ موجودہ ایڈیشن کی ضخامت ۷۵۲ صفحات ہے۔ (پہلے ایڈیشن میں ۲۱۸ شعرا کا کلام درج تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں ۲۶۶ شعرا کا اور موجودہ ایڈیشن میں ۴۷۰ شعرا کا کلام پیش کیا جا رہا ہے) غرض میں نے جس کام کو پہلے ہنسی ہنسی مذاق میں کیا تھا۔ اُسے اب پوری توجہ اور سنجیدگی سے نبھانا پڑا۔ میرے ذہنی ترازو کے مطابق، اب تو یہ نمبر ایک کارآمد قسم کا تذکرہ — اور بے شمار دوستوں کے دل کی دھڑکن بن جائے گا۔

میں نے اس نمبر کی ترتیب پھر بدل دی ہے۔ جو میرے نزدیک پچھلے ایڈیشنوں سے بہرحال بہتر ہے ممکن ہے اب بھی بعض پرانی روش کے دوستوں کو یہ ترتیب بھی پسند نہ آئے۔ مگر میں کیا کروں۔ ذہنی فاصلے ہوتے ہوتے ہی کم ہوں گے — اور پھر میری دشواریاں، اسے کون جانے!
بچپن میں جو شعر اپنی کاپی کے پہلے صفحے پر لکھا تھا — اس کی صداقت آج معلوم ہوئی!

محمد طفیل

۱۵ر جنوری ۱۹۶۰ء

اساتذۂ غزل

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دُھوم ہماری زباں کی ہے

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ترے کلام کا جن کو مزا نہیں اے شادؔ
یقین مان کہ دل ہی نہیں گداز اُن کے

جگر! میں نے چھپایا لاکھ اپنا درد و غم لیکن
یاں کردیں مری صورت نے سب کیفیتیں دل کی

بہت جی خوش ہؤا اے ہم نشیں کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل، دردِ مجسم

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

آپ بھُولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

ولی دکنی

○

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نئیں
دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

○

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر
باعثِ جمعیتِ جاں بوجھ کر

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن کوں تیرے گلستاں بوجھ کر

دل چلا ہے عشق کا ہو جوہری
لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر

ہر نگہ کرتی ہے نظارے کی مشق
خط کو تیرے خطِ ریحاں بوجھ کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار
تجھ کوں اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب
حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر

رحم کر اُس پر کہ آیا ہے ولی
درد دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

○

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحب لفظ اس کو کہہ سکیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

○

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتش غم کوں
کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھیں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک
جسے یار جانی سوں یاری لگے

نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

○

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے
بہار سنبلستاں یاد آوے

ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے کوں
مجھے فردوس رضواں یاد آوے

تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے
اُسے شمع شبستاں یاد آوے

جو کُئی دیکھے میری انکھیاں کوں روتے
اُسے ابر بہاراں یاد آوے

جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے
اُسے گرداب گرداں یاد آوے

ولی میرا جنوں جو کُئی کہ دیکھے
اُسے کوہ و بیاباں یاد آوے

○

میر تقی میر

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

○

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

○

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا وے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آب حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا، یاں بہت دن کم رہا

○

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جاگے تھے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا
صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

○

گیا خیال زلف سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں

رہیں خاک کو کہ اس کی تو صبا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگر جگر فگاراں

رکھے تاج زر کو سر پر چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

نہیں تجھ کو چشم عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

تو جہاں سے دل اٹھا یاں نہیں رسم دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سنا تھا میر ہم نے کہ فسانہ خواب لائے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خواب یاراں

○

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک قرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جام شراب پر نہ کرو میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

○

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

○

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریٔ دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اسارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

سودا

○

ند و رہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
ں شمع سراپا ہوا اگر صرف زباں کا

ے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
ھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ب دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ!
وں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

س گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

ق

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو
مضموں یہی ہے جرس دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

○

دل! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیر، ہو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابر جب تلک
پانی گلوں کے منہ سے چوایا نہ جائے گا

ق

ظالم ابھی کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

داماں داغ تیغ جو دھویا، تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ ہٹایا نہ جائے گا

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ، خدا جانیے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار!
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○

جوں غنچہ تو چمن میں بندِ قبا کو کھولے
پھر گل سے لے پیالے بلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی سے کشتی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل پیالے گلوں کے دھولے

باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے بھی نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہو لے

کر بولنا ادا ہے ہر چند پہ نہ اتنا
مند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشمِ پُر آب دل میں جوں آئینہ حبابی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کون ایسا اب کہے ہے سودا گلی میں اس کی
آ تجھ کو لے چلیں ہم، دل کھول کر تو رو لے

○

○

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

اے دل! یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

انصاف اپنا سونپیے کس کو بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے

نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھرے ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

○

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو! کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور، مرا عجز، تا کجا ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں، کہیں وفا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا: خیر! یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب! آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے، جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتنوں کا لو ہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

○

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ! بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

○

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ! میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعدِ مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جاچکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہُو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہرچند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

○

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمتِ امکان زائل ہو
چھڑاوے آہ کوئی کیونکہ زنگی سے سیاہی کو

عجب عالم ہے ادھر سے ہمیں ہستی ستاتی ہے
ادھر سے نیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو

نہ رہ جائے کہیں تو زاہدا محروم رحمت سے
گنہ گاروں میں سمجھا کر یو اپنی بے گناہی کو

نہ لازم نیستی اس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجیے اے دردؔ ممکن کی تباہی کو

○

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ، خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں ہیں اے خفتگیٔ طالع!
سرسبز تو ہیں، لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت! رہ اودھر ہی، میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دلِ شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا! بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ بھی عالم گو ہووے تو ہو، لیکن
یارب! نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے دردؔ! یہ تیرا تو ہر مصرعِ پیچیدہ

○

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اٹھا غلاف، اگر تو اٹھا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ! چاہے لائے بخود پھر، نہ لا سکے

○

○

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا — ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے
دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس — تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
آہ! بس جی مت جلا تب جانیئے — جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے
ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست — زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے — وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے
ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے — ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے
جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں — بارے! ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے؟

○

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ
یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر! منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

کب ہے دماغِ عشقِ بتانِ فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قیدِ فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہرچند صلحِ کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں درد
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور رنگ ہے

مصحفی

○

سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخِ نقاب اٹھا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اٹھا

میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا
وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اٹھا

مہِ چاردہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اس نے پردہ منہ سے شبِ ماہتاب اُٹھا

جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شبِ وصل
سحر اُٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب اُٹھا

بہ سوالِ بوسہ اُس نے مجھے رُک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُٹھا

میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے
کہ مجھے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اٹھا

میں عجیب رسم دیکھی کہ بہ روزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اٹھا

نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ
یہ زمانے کا رہا ہے یونہی انقلاب اٹھا

○

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اُس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اُس کے ہے اک آب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کل شبِ تاریک میں جوں ہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر روئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کا کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خونناب سا

سو سو طرح کا حادثہ مجھ پر گزر چکا
پر اے دل ایک روز نہیں تو نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا یہاں
بس رکھو آئینہ کہاں مکھڑا سنور چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلی ہوا دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اوپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقت چہرہ خراشی و مو کنی
کیا کیا نہ تیرے ہاتھ سے مجھ پر گزر چکا

اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بسار ملوں اُسے دیکھ مصحفی
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

○

جی جائے گا رائگاں کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ
کیا فائدہ ہو زیاں کسی کا

بجز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ
دل مفت نہیں یاں میاں کسی کا

تا فصل دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

○

○

نازِ چمن میں جب وہ گُلِ اندام آگیا
گُل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا

اُٹھا جو صبح خواب سے وہ مستِ پُرخمار
خورشید کف کے بیچ لئے جام آگیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اُس کو یاد مرا نام آگیا

سے جانے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو ٹوٹتے ہی ہوا سے تہِ دام آگیا

گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان
بارے ٹک ایک دل کو تو آرام آگیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
دو دن اگر کسی کے کوئی کام آگیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا، وہیں پھر شام آگیا

○

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھُل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں
و لیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرامِ صبر
وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گُل گیا

وہی رنگِ گُل ہے وہی چہچہے
چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا

لگی چوٹ دل کو مرے داغ سے
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو کھُل گیا

○

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

○

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کو دکھا خوبی سرمے کو لگا رکھا
سویا تھا لپٹ کر میں اُس ساتھ دلے اس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا
کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھا دیں گے
ہم میں تری اُلفت نے کہہ تو ہی کہ کیا رکھا
قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو پھر اس نے
نامے کے کئے پُرزے قاصد کو بٹھا رکھا
کس لب کے تبسم نے چھڑکا تھا نمک اُن پر
زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا
کیا جانئے کب کا تھا یہ میرا فلک دشمن
جو اس مہ تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا
اے مصحفی میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں میں نے جو انداز نیا رکھا

میر حسن

○

عشق کا راز گر نہ کھل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

آ کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسن
دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

○

جاتا تھا اس کے کھوج میں میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہیں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خون جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سن سن کے میں خفا ہو، وہیں روٹھ کر چلا
غصہ میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے : اور لو!
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چلا
اب کوئی آوے یا کہ نہ آوے حسن کو کیا
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گزر چلا

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یارب
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یارب!

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب!

بلاتی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے و لیکن
کیا جانئے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یارب

جان و دل و دیں کھوٹے اک اس کی نظر پر
ایسا بھی کوئی اور بشر ہووے گا یارب!

رونے سے مرے سنگ تلک ہو گئے پانی
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یارب

داغوں کو ترے غم کے جو رکھتے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یارب!

روتے ہی گزرتی ہے شب و روز حسن کو
اور اس سے تو کیا حال بتر ہووے گا یارب

○

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانند حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار! تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

○

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

حسن میں جب نہیں گرمی نہ ہو اجی دیوے کون
شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں!

دل کو بس بوقلموں جلوہ نے ہے خون کیا
اشک آنکھوں سے جو یہ رنگ برنگ آتے ہیں

آہ تعظیم کو اٹھتی ہے مرے سینے سے
دل پہ جب اس کی نگاہوں کے خدنگ آتے ہیں

شرط گر پوچھو، تو ہے اس میں بھی قسمت ورنہ
عاشقی کرنے کے ہر ایک کو ڈھنگ آتے ہیں

حیرت افزا ہے عجب کوچۂ دلدار حسن!
جو وہاں جاتے ہیں اس طرف سے دنگ آتے ہیں

○

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

اے خوشا مست! کہ تابوت کے آگے جس کے
آب پاشی کے بدل مے کو چھڑکتے جاویں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

غیر کو راہ ہو گھر میں ترے سبحان اللہ!
اور ہم دور سے در کو ترے تکتے جاویں

وقت اب وہ ہے کہ ایک ایک حسن ہو کے تنگ
صبر و تاب و خرد و ہوش کھسکتے جاویں

○

مجھ کو عاشق کہہ کے اُس کے روبرو مت کیجیو!
دوستاں! گر دوست ہو تو یہ کبھو مت کیجیو!

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ ہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو جتنا دل سے خوب رُو مت کیجیو!

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو!

میں تو یوں ہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو!

زلف کے کوچے سے ہو گلشن میں گزرے ہے صبا
آج واں جا کر گلوں کو کوئی بو مت کیجیو!

گل کے جھگڑے میں بھلا ہے کس کے یارو احق بطرف؟
واجبی جو ہو، سو کہیو! میری رُو مت کیجیو!

واں حسن ہرگز نہیں ہے ڈھیل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسہ اس کی تو مت کیجیو!

○

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے؟ غرض اک بلا ہے وہ
جز روبرو ہو اس کے سو جانے کہ کیا ہے وہ

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے، آشنا ہے وہ

ہجراں تو ہے، پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جدا ہیں کہ ہم سے جدا ہے وہ

پھر پھر کے پوچھتے ہو عبث آرزوئے دل
تم جانتے تو ہو کہ مرا مدعا ہے وہ

میں نے تو بات بھی نہیں کی اس سے ہم نشیں!
اک یہ بھی چوچلا ہے کہ ناحق خفا ہے وہ

معذور رکھ حسن کو جو بے طاقتی کرے
عاشق ہے، دردمند ہے اور مبتلا ہے وہ

○

○

سیر ہے تجھ سے مری جان! جدھر کو چلئے
تو ہی گر ساتھ نہ ہووے، تو کدھر کو چلئے

خواہ کعبہ ہو کہ بت خانہ غرض ہم سے سُن
جس طرف دل کی طبیعت ہو، اُدھر کو چلئے

زلف تک رُخ سے نگہ جاوے نہ اک دن کے سوا
شام کو پہنچیے منزل، جو سحر کو چلئے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھر کے کہتا ہے: اِدھر کو چلئے

ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسن
صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلئے

○

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے، اب کے بچھڑے
کیا جانئے! اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسن تبھی تو ہوگا،
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

سچ تو یہ ہے بے جگہ ربط ان دنوں پیدا کیا
سوچ ہے ہر دم یہی ہم کو کہ ہم نے کیا کیا

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں ادھر حیران سا
اوس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

میری اور اوس شوخ کی صاحب سلامت جوں ہی ہوئی
صبر و طاقت نے کہا لو ہم نے تو مجرا کیا

دمبدم حسرت سے دیکھوں کیوں نہ سوئے چرخ میں
اس نے اوروں کا کیا اوس کو ہمیں جس کا کیا

مل گئے تھے ایک بار اوس کے جو میرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

جب تلک کرتے رہے مذکور اوس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

دل ملے پر بھی ملاپ ایسی جگہ ہوتی رہی
ہم ادھر تڑپا کئے اور وہ ادھر تڑپا کیا

سوزشِ دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
ایک انگارا سا پہلو میں میرے دہکا کیا

○

خیالِ وصل میں اوس کے عجب باتیں بناتا ہوں　　مگر میٹھا ہے وہ گویا اور اوس کو میں مناتا ہوں

گلی میں اوس کی جب جاتا ہوں تب اک نہ اک چرچا　　پھر ایسا ہی سُن آتا ہوں کہ بس سُن سے سُن آتا ہوں

گلے لگتا نہیں گر عیدِ قرباں کو بھی تو میرے　　تو لے خنجر ہی کو اپنے گلے سے میں لگاتا ہوں

تماشا ہے کہ ہے مدہوش وہ تو نشۂ مے سے　　پھر اس محفل سے میں اوٹھتے ہوئے کیوں لڑکھڑاتا ہوں

کہے سے کس کے رنجیدہ ہوئے ایسے یہ بندے سے　　ذرا کہو تو صاحب میں تو آپ ہی کا کہاتا ہوں

کہے گر کوئی وہ ناگن نہیں پر دل کو ڈستی ہے　　تو اوس کی زلف کی میں یہ پہیلی بوجھ جاتا ہوں

کہوں کیا دردِ ہجراں سے مری کیا شکل ہے جرأت　　کسی صورت نہیں آرام کیا ایذا اُٹھاتا ہوں

کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اُس کا　　تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں

کبھی اوس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے　　تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کیدھر کو میں جاتا ہوں

کبھی گھبرا کے سر اپنا پٹکتا ہوں میں بالیں سے　　کبھی بستر پہ بیتابی کے مارے تلملاتا ہوں

کبھی آواز اوس کی سی جو آ جاتی ہے کانوں میں　　تو دل پہ ہاتھ رکھ کر دھیان اودھر کو لگاتا ہوں

پھر اوس میں گر تسلی کو کوئی پاس آن بیٹھے ہے　　تو مطلع پڑھ کے یہ روتا ہوں اور اوس کو رلاتا ہوں

قرار اوس شعلہ رُو کے ہجر میں کیا خاک پاتا ہوں
نظر آتی ہے اک آتش جدھر کو آنکھ اُٹھاتا ہوں

○

[...]یشہ اوس محل میں ٹک لطف اُٹھانے دے مجھے
اے ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے

[...]ر گزشت آتے ہی کیا پوچھے ہے اے جانِ جہاں
سب سناؤں گا مجھے آپ میں آنے دے مجھے

[...]ب تو دم رکنے لگا ضبطِ محبت سے ہے
ایک دو اشک تو آنکھوں سے بہانے دے مجھے

[...]ھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری
کچھ تو اسے بے خبری بات بنانے دے مجھے

[...]شکی باندھنے سے بات نہ کھل جائے کہیں
حیرتِ حسن پلک تک تو ہلانے دے مجھے

[...]ہ دل جس کا ملا ہووے نہ دل سے میرے
لب سے پھر اپنے وہ لب کیونکہ ملانے دے مجھے

[...]رمی وار لگاتے اوسے کیا لگتا ہے
جو کہ زخموں پہ نہ مرہم بھی لگانے دے مجھے

[...]گلیاں پاؤں کی اپنے وہ دبوائے ہے
کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

[...]ر پاس اوس کے نہ دوں بیٹھنے جی میں دلا
ضبط کر ضبط وہ رہ ضبط بٹھانے دے مجھے

[...]رہا وہ بھی مزہ ہائے فلک سے وہ عدو
کہ نہ رنجش کا بھی کچھ لطف اُٹھانے دے مجھے

[...]بامنت سے بٹھاتا وہ اور اوس کا یہ کہنا
پھر نہیں آنے کا یاں میں نہیں جانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سببِ حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے میں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاتا پہ کروں کیا کہ کہیں
دل بیتاب لئے جائے ہے دوڑائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے مشکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
دو گنہ گار ہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آئے تم دست بہ قبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا
سرِ تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے

آج بھی اوس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اوس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پہ مرے جن کی خاطر
رنگ رو کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

ابرِ تصویر کے مانند ہم اوس محفل میں
رو نہیں سکتے ہیں اشک آنکھوں میں ہیں لائے ہوئے

لوگ گو ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے سب اوس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں ہم سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں تم تو نکلوائے ہوئے

کر کے موزوں او نفیس جرأت غزل ایک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامیں ہیں ٹھہرائے ہوئے

[illegible] دل خرام ناز پہ ہر آن لوٹے ہے
ترا دامن بھی قدموں پہ ترے اے جان لوٹے ہے
[illegible]یہ چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم
وہ منظر کیا درون خانہ ویران لوٹے ہے
[illegible]ے ہے چاندنی کی سیر جب وہ بیٹھ کشتی میں
تو کیا کیا موج پر عکس مہ تابان لوٹے ہے
[illegible] خانۂ قاتل میں کس بے چین کو جانے
جو در پر نیم بسمل سا پڑا دربان لوٹے ہے
[illegible]ے ہے جب کہ تیرے مضطرب کے چشم سے آنسو
تو کیا کیا خاک پر جوں گوہر غلطان لوٹے ہے
چھپاتا ہے گل نرگس سے تو جو اپنے مکھڑے کو
تری اس بات پر کیا کیا ترا حیران لوٹے ہے
[illegible] اب طرز اوس مطرب کے کا رقص لاتا ہے
کہ ہر اک بجلی سے اوس کی سن کے تان لوٹے ہے
نہ مجھ سے نہ ہو گر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر
کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے
[illegible]ے گا کام آخر اب وہ پاجامہ تمامی کا
کہ اک بجلی سی چلنے میں تہ داماں لوٹے ہے
تصور میں جو دل کے زلف کا اوس کی ہے لہرانا
تو اک چھاتی پہ اس کی سانپ سا ہر آن لوٹے ہے
[illegible]ورتا ہے جو سونا یاد با ہم بستر گل پر
تو ساری رات انگاروں پہ دے دے جان لوٹے ہے
کہے اشعار بیتابی کے تو نے ایسے اے جرأت
کہ پڑھ کر ہر سخنداں اب ترا دیوان لوٹے ہے

دل میں کیا کیا کہ آئے ہے بات اور کیا کیا جائے ہے
کان میں آوازہ اوس کی سی جوں ہی آ جائے ہے
بستر اندوہ پر جب یاد آتے ہیں وہ عیش
پھر نہ لیٹا جائے ہے مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے
بزم میں آنکھوں تلے پھر جائے ہے جب اوس کی شکل
آنکھ بھر کر پھر کسو سے کس کو دیکھا جائے ہے
چھیڑنے کو مجھ سے یہ آزردہ وہ ہوتا نہیں
وقت رنجش تو بھلا کیوں مسکراتا جائے ہے
کیا ہجوم بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب یہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے
بس دل عشاق پر بجلی سی پڑ جاتی ہے آہ
جب سمند ناز کو اپنے وہ چمکا جائے ہے
دیکھ کر تصویر اوس کی ہو گیا تصویر میں
اب نہ دست و پا ہی ہلتے ہیں نہ بولا جائے ہے
بیٹھے یاں مت سج بناؤ تو خبر عاشق کی تم
زندگی کا اوس کی واں نقشہ تو بگڑا جائے ہے
لے گیا اک راہ چلتا دین و دل صبر و قرار
اب وہ یاد آتا ہے تو بس جی ہی نکلا جائے ہے
کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی
جوں کسی کا قافلہ رستہ میں لوٹا جائے ہے
اشک خونی دیکھ چہرے پر مرے بولا وہ شوخ
دن بدن رنگ اب تو جرأت کا چمکتا جائے ہے

○

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

مشغول کیا چاہیے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈ اور کوئی یار ہم اچھا

گرمی نے کچھ آگ اور بھی سینے میں لگا دی
ہر طور غرض آپ سے ملنا ہے کم اچھا

اغیار سے کرتے ہو مرے سامنے باتیں
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا

کہہ کر گئے: آتا ہوں کوئی دم میں میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھ کو دم اچھا

اس ہستیٔ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا
واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

○

اے آتشِ فراق! مرا بلبلے سوزِ داغ
جھلکے ہے دل میں دور سے جوں دیر کا چراغ

آنکھوں میں تاکہ نشۂ وحدت کا ہو طلوع
ساقی! مئے مغانہ سے بھر دے مرا ایاغ

بیٹھا ہے آج مجلسِ زنداں میں شیخ یوں
طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

پیدا لگاوٹ آہ کسی ساتھ کیجیے
لیکن دل و دماغ کہاں کس کو یہ فراغ

پہنچوں میں کس کی کہنہ حقیقت کو آج تک
انشا مجھے ملا نہیں اپنا ہی کچھ سراغ

دل مجھ سے لے لے پری! مجھے انسان کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیماںؑ کی قسم!

حور و پریاں کی تجھ کو قسم اور عرش کی
جبریلؑ کی قسم! مجھے رضوان کی قسم!

طوبیٰ کی، سلسبیل کی، کوثر کے جام کی
حور و قصور و جنت و غلمان کی قسم!

روح القدس کی تجھ کو قسم اور مسیح کی
مریم کی تجھ کو عفت دامان کی قسم!

تجھ کو محمد عربی کی قسم ہے اور
مولا علیؓ کی، شاہ خراسان کی قسم!

توریت کی قسم! قسم انجیل کی تجھے
تجھ کو قسم زبور کی، فرقان کی قسم!

ملت ہیں جس کی تو ہے، اسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہب و ایمان کی قسم!

دامن کو تیرے ہاتھ سے اس بات لے تک
تجھ کو سحر کے چاک گریبان کی قسم!

مدت سے تیرے چاہ ذقن میں غریق ہوں
باللہ! تجھ کو یوسف کنعان کی قسم!

قیدی ہوں میں ترا، یہ خداوند کی ندا
اور اس عزیز مصر کے زندان کی قسم!

موسیٰ کی ہے تجھے قسم اور کوہ طور کی
نور و فروغ و جلوۂ لمعان کی قسم!

سوگند اب ہنسی کی تجھے، تجھ کو لا اپنے
سن تجھ کو اپنے ناز کی اور آن کی قسم!

تجھ کو قسم ہے غنچۂ زرین کی، ناک کی
اور شور عندلیب غزل خوان کی قسم!

سونے کی لگانے کی قسم اور رود نیل کی
فرعون کی قسم تجھے، ہامان کی قسم!

بستر مرا ہے خار مغیلان بیابان قیس
لیلیٰ کی ہے تجھے صف مژگان کی قسم!

ایسی بڑی قسم بھی نہ مانے، تو ہے تجھے
مجنوں کے قبلہ گاہ ابوالجان کی قسم!

کرنے میں باغ کے جو وہ رتبہ ہے الصفت
تجھ کو اسی کی شوکت ذی شان کی قسم!

دیو سفید کی قسم اور کوہ قاف کی
باغ ارم کی اور پرستان کی قسم!

لونا چماری کی قسم، دھلوا پیر کی
کالی بلا کی، غول بیابان کی قسم!

قسمیں تو ساری ہو چکیں، باقی رہی ہے ایک
پیپل تلے کے بھتنے کی، شیطان کی قسم!

ہاں پھر تو کہیو! ہائے وہ کس طرح ہو غضب
انشاؔ نہ چھیڑ! تجھ کو مری جان کی قسم!

○

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

مجھ سے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں

حضرت دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ! کہ رندان جہاں
انگلیوں پہ تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں

تو گروہ فقرا کو نہ سمجھ بے جبروت
ذات مولا میں یہی لوگ سما سکتے ہیں

چارہ گر اپنے تو معروف بڑے ہیں لیکن
کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں

نظیر اکبر آبادی

○

نظر پڑا اک بُت پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو، تو دس برس کی، پہ قہر آفت، غضب خدا کا

جو شکل دیکھو، تو بھولی بھولی جو باتیں سنیے، تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے، جو نام لیجیے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پہ
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلتے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو، قدم کی جا کا

لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ جھنجلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سُدھ بُدھ
جو جیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا، چمک کر کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آکے مچلے، تو خیر کا پھر نہ آشنا کا

نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستمگر، تو یار ہوگا ابھی جھگڑا کا

○

...ملا آج وہ مجھ کو چنچل چھبیلا
...ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا نیلا

...ابا جن نے مجھ سے عداوت کا بیجا
...سنلقی علیہم عذاباً ثقیلا!

...حل اس کی زلفوں کے کر چکے ازل
...تو پڑھنا: قم اللیل الا قلیلا

...لستاں میں یاروں اگر آہ کا دم
...ذلانت جبالاً کثیباً مہیلا

نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ
...فقل: حسبی اللہ نعم الوکیلا

کلال گردوں اگر جہاں میں، جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب یہ عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت، بہ سانِ مستاں، مئے محبت سے تیری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے، وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی جو مے کشی کی، وہ سیر ہو جاتے مست بے خود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو میں بھی جھک کے سلام کرتا

جو زلف مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا، تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر، وہ شوخ اپنا غلام کرتا

○

کبھو دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں، مجھے اس خم زلف دوتا کی قسم
نہ نگہ کروں عارضِ گل کی طرف، مجھے اس رخِ مہر و وفا کی قسم

یوں بھرے ہے چمن کی فضا میں صبا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کش
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا، مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم

جونہی آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ، مجھے اس بتِ ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے روکشِ برگ سمن، مرے بر میں جو آوے وہ رشکِ چمن
کھلے غنچۂ دل مرا گل کے نمن، مجھے اس گل بند قبا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں، تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں
وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں، سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں، تو وہ شرم سے ہو گیا سرو قریں
لیا نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں، میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

○

○

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

طاق ابرو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی؟
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ!
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

○

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن
گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن

مہر طلعت، حور پیکر، مشتری رو، مہ جبیں
سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک کمر
غنچہ لب، رنگیں ادا، شکّر دہاں، شیریں سخن

زلف و کاکل، خال و ابرو، ہیں یہ چاروں غلام
مشکِ تبت، مشکِ چیں، مشکِ خطا، مشکِ ختن

مبتلا ایسوں کے جو ہوتے ہیں وے ہیں اے نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ جان و بے وطن

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
اے یار! میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں

یک دم کی زندگی کے لئے مت اُٹھا مجھے
اے بے خبر! میں نقشِ زمیں کا نشست ہوں

تو مست کر! شراب سے اے گل بدن مجھے
میں آپ اپنے شیشۂ دل کا شکست ہوں

دُور از طریق مجھ کو سمجھنا نہ زاہدا!
گر تو خدا پرست ہے، میں بُت پرست ہوں

○

کیوں نہ ہو بام پہ وہ جلوہ نما تیسرے دن
ماہ بھی چھپ کے نکلتا ہے ولا تیسرے دن

ہاتھ سے اب تو قلم، رشکِ مسیحا، رکھ دے
نسخے بدلے ہیں جہاں کے حکما تیسرے دن

غرق دریائے محبت کی نہیں ملتی لاش
ورنہ ڈوبا ہوا نکلے ہے سدا تیسرے دن

دل بیمار رہے عشق میں کیوں کر سرسبز
خاک سے دانے کو ہے نشو و نما تیسرے دن

چھوڑ مت زلف کے مارے کو تو دریا میں ہنوز
سانپ کے کاٹے کو دیتے ہیں بہا تیسرے دن

تین دن چشم کے بیمار کا کر اپنے علاج
ہوتی معلوم ہے تاثیرِ دوا تیسرے دن

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں پھول ترے کشتے کے
مہندی ہاتھوں میں تو قاتل نہ لگا تیسرے دن

عمر یک ہفتہ نہیں باغ میں اے گل! مت بھول
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا تیسرے دن

چار حرف اس بت پرخوں کے اُپر بھیج نظیرؔ
آپ سے آپ جو ہو جائے خفا تیسرے دن

○

○

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچہ سے
الٰہی راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

علاج کیا کریں حکما، تپ جدائی کا
سوائے وصل کے اس کا کوئی طبیب نہ ہو

نظیر اپنا تو معشوق خوب صورت ہے
جو حسن اس میں ہے ایسا کوئی عجیب نہ ہو

○

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے، چلے گئے
کیا کیا پری جوان بنے آئے، چلے گئے

دارا رہا، نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے، چلے گئے

آدم رہا، نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے، چلے گئے

عالم تھا یہ زلیخا کا یوسف کی چاہ میں
رقعے ہزاروں بیاہ کے آئے چلے گئے

میرزا غالب

○

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

و چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
ی جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
یں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

تی صبر طلب اور تمنا بے تاب
کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

رسے ہے شبنم کو، فنا کی تعلیم
ی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی غافل
بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

تی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

○

وہ فراق، اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

○

ب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

نات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

ں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

قیبوں سے ہو ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ں میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

یا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

حد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرور عز و ناز، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں! وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

○

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو اگر برا کہے کوئی
نہ کہو اگر برا کرے کوئی

روک لو اگر غلط چلے کوئی
بخش دو اگر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

○

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مومن

○

…ئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے، نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر
سبک ہے وہ کہ ذری طبع پہ گراں نہ ہوا

دیت میں روزِ جزا لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت، تو تھا میں شادیٔ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

لی نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہم پہ عنایت ہیں گونہ گونہ ستم
کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی
تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

امید وعدۂ دیدار، حشر پہ مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے، تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر خصمِ جانِ غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

○

رو یا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی، ولیکن بری طرح

نے تاب ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے! پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

نے جائے واں بنے ہے، نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجئے! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

○

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق!

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں: کیا ہے عشق؟

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

بوالہوس اور لافِ جاں بازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

سوجھے کیوں کر فریبِ دل داری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق!

کس ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ با مزا ہے عشق

ہم کو ترجیح تم پہ ہے، یعنی
دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھئے! کس جگہ ڈبو دے گا
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ
چارہ گر! دردِ بے دوا ہے عشق

اب تو دل! عشق کا مزہ چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں؟ برا ہے عشق

آپ مجھ سے نباہیں گے، سچ ہے
با وفا حسن، بے وفا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی، کیا وبا ہے عشق

اب اور سے تو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعوی مسیحی
مر مر پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مُردے جگائیں گے ہم

آتا ہے گلے سے دھیان تیرے
خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بُت خانہ چیں ہو گو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

O

کہتے ہو تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں!

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش!
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

تقدیر بھی بُری مری، تدبیر بھی بُری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

بیمِ سجود، پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

O

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اُٹھتے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں، عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ، لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا، آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

وہ لالہ رُو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ، بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں؟ یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ، شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو، قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی، بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ذوق

○

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا، تو کھوج اپنا نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سُود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو باہر
نکل جاتے، مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا، کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کسے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا، لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو، اور کبھی بیزار رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا، نہ پایا

○

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو، جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہ کن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا، یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

○

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک!
غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُن کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

○

ہاں! ناوکِ دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشان ہوا ہنس کے چمن میں آخر!
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی مے خوار کا دل
محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب، مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلشِ خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ! گل؟ دعویٔ نازک بدنی خوب نہیں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اے زاہدِ دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانندِ صبحِ کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صیدِ مضطرب کو تامل سے ذبح کر
دامان و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کی ہاتھ اٹھا
اے ذوق یہ اٹھا نہ سکے گا کھکیڑ تو

تیز اس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ
مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

کچھ کی رستمِ شوق نے تاثیر جو پیدا
اٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے مجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر انھیں کم اور زیادہ

الٰہی! کس بے گنہ کو مارا، سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں شور اس کے بأیِ ذنبٍ قُتِلَت ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ، اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہے ہر اک کی راہ یہاں
جو اس کے نزدیک روبری ہے [illegible]

ابرِ تر، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع درد کا!
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو، یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کے آمد ان کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا سمجھائے ذوق [illegible]
[illegible]

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش! خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

...رہ دنیا میں خرابی ہے ظفر
...کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

بہادر شاہ ظفر

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں تو کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ ماہ لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

یہ نخلِ آہ ہوتا بید ہی کاش
نہ ہوتا گو ثمر، سایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

○

نہ ہرگز دردِ دل سے میں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نباہا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے نہ پوچھو لذتِ عشق
اہاہاہا! اہاہاہا!! اہاہا!!!

صَرفتُ العُمرَ فِی لَھوٍ ولَعِبٍ
فآھا! ثُمَّ آھا!! ثُمَّ آھا

ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا! کرم گارا! الٰہا!

○

○

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

ترے اندام و رُوئے و قد و زلف و خط سے ہے خجلت
سمن کو، ارغواں کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو

جگہ کن کن کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے اے قاتل
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دندان و لب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

دکھا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قلقل، دعا دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی
سبو کو، خم کو، مے کو، میکدہ کو، مے پرستاں کو

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

○

بہار آئی ہے، بھر دے بادۂ گل گوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

اسی رشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

مجھے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا ہیں سودائی، وہ سنگیں دل، میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ دشت بھولے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمھارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سُنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب! گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی "ہو حق" سے بہتر ہے
کرے گر رند دُردِ دل سے ہائے وہوئے مستانہ

○

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

بدمست جہان ہو رہا ہے
ہے یاری بو ہر ایک شے میں

ہے مستیٔ نیم جام کا ڈر
اصرار ہے جام پے بہ پے میں

مہمانہ نہیں قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہِ کے میں

کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت
کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

○

گرم جوشی ہے، مگر ذوقِ شرارت میں نہیں
چھیڑ کس بات میں، طعنہ کس اشارت میں نہیں

رات ساقی نے کہا: جس کے یہ سب جلوے ہیں
وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحرگاہی سے
اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں

فرحتِ نفس جو وہ ہے تو یہ ہے راحتِ روح
کیا بزرگی میں مزہ ہے جو حقارت میں نہیں

اہلِ دانش کے فوائد کی تو کیا بات، مگر
غور سے دیکھو، تو عاشق بھی خسارت میں نہیں

جامِ مے دے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھ کو
کہ صبا کو بھی جہاں دخل سفارت میں نہیں

قتل و غارت کہ سمجھتے ہو جسے امرِ عظیم
یہ تو داخل بھی وہاں ناز و شرارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلب گار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ اصحابِ تجارت میں نہیں

○

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
لے مرگ ابھی آپ مر رہا ہوں

ممکن نہیں بن ملے رہا ہوں
بیگانہ آشنا نما ہوں

لیلیٰ کہنے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملنے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

روشن ہے مری سیاہ بختی
منت کش سایۂ ہما ہوں

بیگانہ وشی ستم ہے ان کی
غیروں کو بھی یار جانتا ہوں

اس غیرتِ گل سے ربط معلوم
ہر چند میں ہمدمِ صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبت اس کو
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں؟

مکشوف ہوا فروغِ مے سے
ذرہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیز دل ہا
شیریں گفتار، خوش نوا ہوں

○

ہے گو نہ گو نہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زباں پہ وہ نہیں ہے نگاہ میں

تمکین اضطراب ہے، بیداد التفات
کیا شوخیٔ اثر ہے سراسیمہ آہ میں

ہر خار و خس ہے وجد میں ہر سنگ و خشت مست
کیا مے کشوں نے آکے کہا خانقاہ میں؟

دشمن سے بھی زیادہ ہے گو دوست کیوں نہ ہو
بن جائے جو کوئی ترے کوچہ کی راہ میں

صیاد دل فریب کا اللہ رے لطفِ عام
بے زخم ایک صید نہیں صید گاہ میں

دن رات جلوے دیکھتے ہیں مہر و ماہ کے
یہ روشنی نہ مہر میں دیکھی، نہ ماہ میں

تجھ کو نظر نہ آئے، تو اپنا علاج کر
ہے مرغزار جلوہ نما برگِ کاہ میں

دھوکا بھی کو صرف نہیں میل یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے تو جادو نگاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاقت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

○

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

[illegible] ہو چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر! زمیں کو ڈال اضطراب میں

سو مہر کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں رختِ خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اے صوتِ جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے وائے! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

[illegible] مانند بیمِ عقوبت! یہ سچ ہے
بے بے اٹھائی اس نے اذیت عتاب میں

[illegible] نہ بانسے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
[illegible] کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

○

کیوں کر بھلے خط رقم کریں گے
کیا غیر کا سر قلم کریں گے

ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی
کس واسطے مجھ سے رم کریں گے

باتیں بھی بری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد! وہ بہت الم کریں گے

آرام کی فکر اب ہوئی ہے
تم سے نہ ہوا، وہ ہم کریں گے

دلی میں تو شیفتہ ہے استاد
ہم قصد سوئے عجم کریں گے

ناسخ لکھنوی

○

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے آبِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جیب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ یک گوشہ ہے صحرائے قیامت اس کے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

○

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگیِ بخت کی کیا کہیے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیاد گلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعدِ فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

○

روز ہے گرمئ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو، قدم اُٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

روز ہی عشق نے یہ تفرقہ پردازی کی
ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں، تو یہاں مدفن ہو
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

○

مجھ کو اب ساقئ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل میں خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پُرخار
اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں دشتِ جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

اتنی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

آتش لکھنوی

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیرِ دام رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا، اڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

○

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قِراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل
وہ شب، صبحِ جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرح ناک تھی روح، دل شادماں تھا

مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتش جواں تھا

○

تیری جو یاد اے دل خواہ بھولا
باللہ بھولا، واللہ بھولا!!

فرقت کی شب میں جاں سوز دل نے
اُف اُف کیا جو، آہ آہ بھولا

کج رکھ نہ پا کو، جا دل سے غافل
پھیر اس نے کھایا، جو راہ بھولا

زنار ڈالا، تسبیح پھینکی!
عشقِ صنم میں اللہ بھولا!

خود نے گرایا اس کو نظر سے
جو ذرہ تیری درگاہ بھولا

محروم رکھتا ساقی نے ہم کو
اپنے گدا کو جمِ جاہ بھولا

بُت خانہ چھوڑا، باز آئے بت سے
وہ شہر بھولا، وہ شاہ بھولا

شرطِ وفا کی کس بے وفا سے
آتش سا عارف، آگاہ بھولا

○

ترے کوچہ کا ہے لٹ خانہ خراب افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے، برہمن بت خانہ آج

خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسفؑ نہ تھی، جو ہے ترا بیعانہ آج

آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جائے، جو ہاتھ آئیں پر پروانہ آج

ہم نشیں! کہتے ہیں: ذکرِ عیش نصفِ عیش ہے
میں کہوں، تو سن! جمالِ یار کا افسانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

نقشِ آسیب پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمتِ مردانہ آج

○

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو، بادشاہ ہو تم

کیوں کر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم

حسن میں آپ کے ہے شانِ خدا
عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم

ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ
جامہ زیبوں کے بادشاہ ہو تم

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر
وہ ستارے جو ہیں، تو ماہ ہو تم

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہ گار، بے گناہ ہو تم

جو کہ حقِ وفا بجا لائے
شاہد اللہ ہے، گواہ ہو تم

ہے تمھارا خیال پیشِ نظر
جس طرف جائیں، سدِ راہ ہو تم

دونوں بندے اسی کے ہیں آتش
خواہ ہم اس میں ہو دیں خواہ ہو تم

○

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری

مری طرف سے صبا! کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت، پیرہن سے بو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل! تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابرِ گریہ کناں ہے، تو برقِ خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن!
فقیر دیکھتے ہیں راہ، کو بہ کو تیری

زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

اے صنم! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغ بے آب ہے نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے

کوئی اکسیر، غنی دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے، آنکھوں میں بصارت دی ہے

لطفِ دل بستگیٔ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ!
دو جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے

کمرِ یار کے مضمون کو باندھو آتش!
زلفِ خوباں سی مرے تم کو طبیعت دی ہے

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے، نشے میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے!

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

○

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ، کسی جا اتار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد، بہت سا غبار راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیئے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ، ہمیں ناگوار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار راہ میں ہے

پتہ یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد!
بجائے سنگِ نشاں، اک مزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں، تو چل سر کے بل، نہ ٹھیر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

○

آمیر مینائی

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا
آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

ہائے وہ پہلی ملاقات میں میرا رُکنا
اور اُس کا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا

متصل آہ کی پہلو سے صدا آتی ہے
اب وہ ہے درد کا گھر تھا جو ٹھکانا دل کا

جی لگے آپ کا ایسا کہ کبھی جی نہ بھرے
دل لگا کر جو سنیں آپ فسانہ دل کا

تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں
کیوں جی تم کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا

پھیر کر منہ مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں
رُخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانہ دل کا

ہر نگہ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیر
ہو جسے حکم اڑائے وہ نشانہ دل کا

○

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

نگاہِ کرم سے مجھ کو نہ دیکھا اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گنہگار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

حضور! وصل کی حسرت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجیے کب سے امیدوار ہوں میں

وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

رہے تصویر حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لب خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہیں مٹتی ہے دل سے مر کے ان کی آرزو برسوں
یہ وہ گل ہے کہ مرجھا کے بھی دیتا ہے بو برسوں

فنا کے بعد ایسے بے کسوں کو کون پوچھے گا ؟
مگر اے بے کسی رویا کرے گی مجھ کو تو برسوں

نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

سراپا جرم ہوں لیکن وہ رندِ پاک طینت ہوں
کیا زاہد نے میرے آبِ خجلت سے وضو برسوں

تمھاری اک نگاہِ ناز نے توڑا اشارے میں
بنایا چشم و دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

ان کے غصے کے منانے کی ہیں سو تدبیریں
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہے اداس
کیا دمِ بازپسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلائے، میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی میں ابھی محو کیے دیتا ہوں
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

○

○

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حال زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

صبح سے مطلب، نہ گل سے کام کیا جانوں انھیں
میں تمھارے سینہ چاکوں میں دل افگاروں میں ہوں

پھیر کر دیکھو، میری میت پر جو آئے یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ،
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

بے گنہ ہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہ گاروں میں ہوں

بے گناہوں کا تو دعویٰ ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگاروں میں ہوں

آ چکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی
درد ظالم بول اٹھا میں اس کے غمخواروں میں ہوں

○

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

وقتِ فرصت تھا میں عبرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملے جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھ کر ترے جلوے کا ہے شوق
آنکھ کہتی ہے نگہ پر ہو تقدم مجھ کو

واہ اے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوتِ وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کے
جام سے بھر کے پلاؤں میں تمھیں تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

○

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گل چیں! اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

کیوں ترے لب پر تبسم مجلسِ ماتم میں ہے
یہ ہنسی بھی کیا مرے پھولوں میں ہے آئی ہوئی

گرد اڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

شعر گلدستے میں کچھ افسردہ دل کے کیا امیر
دامنِ گلچیں میں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی

○

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر
بھیجتے تحفہ مؤذن کے لیے

داغ دہلوی

○

اللہ رے مرتبہ مرے عجزِ نیاز کا
گویا جواب ہے یہ ترے کبر و ناز کا

عالم تمام پیشِ حقیقت نگر بنا!
منہ دیکھتا ہے آئنہ، آئینہ ساز کا

ہر چند راہِ کعبہ و بت خانہ ایک ہے
اے راہ رو ہے کام یہاں امتیاز کا

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

رُتبے سے میرے قیصر و سنجر کو رتبہ کیا
میں ہوں غلام، شاہِ عراق و حجاز کا

مجھ کو نہ کیوں کہ اس کی غلامی سے فخر ہو
محمود ایک بندہ ہے جس کے ایاز کا

کونین جس کے ناز سے جکڑے ہوئے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا

○

اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

کس کس کو مزہ ہے عاشقی کا
تم نام تو لو، بھلا کسی کا

گلشن میں ترے لبوں نے گویا
رس چوس لیا، کلی کلی کا

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے، کسی کا!

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو، آدمی کا

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ، ہمہ تن آب دیدہ ہوں

گر تو نہ ہو، تو پھر کسی کافر کا دل لگے
دوزخ میں آرمیدہ، ارم سے رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے کچھ سا کر دیا
اے بے خبر! میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو!
گو بازمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

اے داغ! جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے؟ وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

○

ساز، یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

○

[illegible] نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدہ میں، صنم خانقاہ میں

آنکھیں چھپائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں، کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

بڑھتا ہوں آگے پوچھ کے اس سے مقامِ عشق
جو فتنہ مجھ غریب کو ملتا ہے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا تمھاری نگاہ میں

ان مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک
ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں، نیچی نگاہ میں

مشتاق اس صدا کے بہت دردمند تھے
اے داغ! تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

چاک ہو پردۂ وحشت، مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ، گریبان سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہو ایسا دلِ رنجور نہیں
بت اگر دور ہے مجھ سے، تو خدا دور نہیں

چھین لیں دل کو اگر دے، تو یہ مجبوری ہے
میں کہے جاؤں گا، محتاج ہوں مقدور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ! پچھتائے گا، خاموش! یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجیے، ملنا ہمیں منظور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجا ہی نہیں جس میں یہ ناسور نہیں

○

اشکِ خوں رنگ لانے جاتا ہے
داغ اپنی جلانے جاتا ہے

کتنا با وضع ہے خیال اُس کا
بے کسی میں بھی آنے جاتا ہے

دیکھنا رشک اس کی محفل کا
ایک کو ایک کھانے جاتا ہے

وہ جدھر کو گئے، اُٹھا یہ شور
وہ قیامت اُٹھانے جاتا ہے

آتشِ شوق کیا بجھے ناصح!
تو پتنگے لگانے جاتا ہے

○

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
ہم نکمّے ہوئے زمانے کے — کام ایسا سکھا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا، دیا تو نے
عمرِ جاوید، خضر کو بخشی — آبِ حیواں پلا دیا تو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار — دوست کو یوں بچا دیا تو نے
کہیں مشتاق سے حجاب ہوا — کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب — نقشہ اپنا جما دیا تو نے
مجھ گنہ گار کو، جو بخش دیا — تو جہنّم کو کیا دیا تو نے؟

داغ کو، کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

مولانا حالی

○

پیش از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں، کوئی مہماں نہ تھا

سنتے ہی ان کے ہو گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے، جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط، مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں، ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

○

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

اس سے ناداں ہی بن کر ملیے!
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل!
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

محتسب! عذر بہت ہیں، لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیٔ شب کا مزہ بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب! کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گماں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق!
بدلیں گے تجھ کو زندگیٔ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر!
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم!

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے ہے
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

○

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے، میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی!
غیر الفت بہت جتانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم!
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے، لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر، یارب!
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے، جب وہ جانے لگے

○

اکبر الہ آبادی

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

نا تجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اُس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہہ لو
اُن کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبا فطرت کے کرشمے ہیں
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

○

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے اُن کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

○

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اُٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت ہی کیا سے کیا ہو گئی

لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں
اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

بتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے
مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی

○

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں

زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

کشتیٔ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

نزع کہتی ہے کہ روٹھی مجھ سے جان
حشر کہتا ہے منالی جائے گی

اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی

بے تکلف چاہیئے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائے گی

کیا غم دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھالی جائے گی

زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے کر چلالی جائے گی

شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگالی جائے گی

یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آکے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل دام بلا، میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ تھی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں وطن سے حزین و ملول پھرا، نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے،
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غم ہجر میں جی سے گیا جو گذر، تو یہ اکبر زار نے خوب کہا
کہ علاج فراق تو تھا ہی یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

○

کبھی جو دعویٔ منصور میں شک آتا ہے
خیالِ یار مجھے آئنہ دکھاتا ہے

وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو
وہ حال ہوں کہ جسے سُن کے وجد آتا ہے

ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمہاری یاد
کبھی تمہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے؟

نہ جانے کا تو نہیں جانتے بہانہ کچھ
ہزار حیلہ نہ آنے کا تم کو آتا ہے

وہ میکدہ ہے ہمارا کہ جس میں مستوں سے
ہزار ساغرِ جم روز ٹوٹ جاتا ہے

نہ پوچھئے ستم جوشِ حسرتِ دیدار
یہ جانِ زار کو آنکھوں میں کھینچ لاتا ہے

دوئی کا دخل نہیں بزمِ وصل میں منظور
وگرنہ آپ میں آنا تو مجھ کو آتا ہے

فنا کا خوف کچھ اہلِ حیات ہی کو نہیں
ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

خدا کے واسطے یادِ خدا کر اے اکبر
بتوں کے عشق میں جان اپنی کیوں گنواتا ہے

○

اس میں عکس آپ کا اُتاریں گے
دل کو اپنے یونہی سنواریں گے

آپ ناحق پہ اور ہم حق پر
آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں گے

عشق کہتا ہے لطف ہوں گے بڑے
ہجر کہتا ہے جان ماریں گے

لیجئے جان، ہے یہی جو خوشی
کیجئے ظلم، دم نہ ماریں گے

دل کی افسردگی نہ جائے گی
ہاں وہ چاہیں گے تو اُبھاریں گے

پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح
گل کو کیا باغباں سنواریں گے

شاؔد عظیم آبادی

○

پھر کسے جاتا تھا عزق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

مسکرا کر جھانکتی تھی کس ادا سے اک پری
چہرۂ ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ہائے وہ خود درنگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

بوریا تھا، کچھ شبینہ سے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

شاؔد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

○

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ، کہتے آتی ہے حیا
یہ تمنا، یہ امیدیں، جنھیں برسوں پالا، کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا، کون بچا، کون مرا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
یار! کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا، نہ رکا
رت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل، ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا، اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یوں ہی رونے میں کٹا، کیا کہیں چپ کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اٹھنے کی کہاں؟
جامہ زیبی کا بھلا، اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا!
فتنۂ نو، آفت جاں، سنگ دل، آشوب جہاں، دشمن امن و اماں
سرو رخ، گلعذار، خسرو اقلیم جفا، بانیٔ مکر و دغا!
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پئے متوالی!
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا، اف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیرا انکھیوں سے ہے آڑی ترچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھات جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں روئی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، ماتم [illegible]

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرہ سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شورِ محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

○

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیرِ مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی!
پیوں جو اب تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں؟
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی!
میں اس پہ ہو لوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے، نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شاد
میں کس کے گھر میں پیوں، کس کے گھر سے لا کے پیوں

○

...اں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
...ا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

...باں ہیں حلق میں سینے میں اک مدت سے چھالے ہیں
...ا جانے بھری تھی کس غضب کی آگ نالوں میں

...ری آنکھوں سے دیکھو حسنِ صورت کے علاوہ بھی
...ہت سی خوبیاں ہیں اور بھی صاحب کمالوں میں

...رے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غم خوار گھبرا کر
...ہت مشکل ہے آ کر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

...جو آنکھیں ہوں تو چشمِ غور سے اوراقِ گل دیکھو
...کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

...غم اس اُلجھاؤ سے چھٹنے کا لے دل تجھ کو ناحق ہے
...وہ کیا تیرے لیے کنگھی نہ کرتے اپنے بالوں میں

...خوشا وہ صدر ہیں جن کو جگہ وہ شاہِ خوباں دے
...ہمارا ذکر کیا اے شادؔ! ہم ہیں خستہ حالوں میں

○

نگاہباں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز ان کے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز ان کے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز ان کے

دلوں میں گھر نہیں کرتے جو خود پسندی سے
پھرے ہیں کعبہ سے پیچھے نہ پڑھ نماز ان کے

مراد یہ ہے کہ آئے نہ راستی پہ کبھی
فلک کو پھانستے ہیں گیسوئے دراز ان کے

جنھوں نے ناز اُٹھائے نہ ناز والوں کے
پسند آئیں گے کیوں کر وہاں نیاز ان کے

تعلقات ہیں دنیا کے پھنس چکے تھے ہم
بچائے جلتے ہیں گیسوئے فتنہ ساز ان کے

اجل کے غمزۂ بے جا سمائیں کیا دل میں
تمام عمر اٹھائے ہوئے ہیں ناز ان کے

نہیں پسند جنھیں شادؔ عاشقانہ کلام
معاف کر دو انھیں دل نہیں گداز ان کے

○

ایک تم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم ابرِ بہاراں دیدۂ پرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شادؔ نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

○

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شادؔ پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

ریاضؔ خیرآبادی

ہنگامِ نزع اگر یہ بیاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کہنے یار ہیں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

وہ کیوں ٹھہرتے نزع میں بالینِ غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے آج مجھ کو تصور کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اس نے کیا جو کام یہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

○

وہ ستاتا ہے، ستاتے جو نہیں تم مجھ کو
دھوکے دیتا ہے بری طرح تو ہم مجھ کو

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں
اور جو بے ساختہ آ جائے تبسم مجھ کو

خانقاہیں تو ہزاروں ہیں گر جی بھی لگے
کہیں تھوڑی سی جگہ دے دو پسِ خم مجھ کو

جس کے ہر ذرے میں تھا وادیِ ایمن پنہاں
بے خودی نے اسی صحرا میں کیا گم مجھ کو

دادخواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاضؔ
پیار سے پوچھتے ہیں بھول گئے تم مجھ کو

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام، باغ میں گزرا تمام وقت
کل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

اجڑا جب آشیاں، تو خزاں کیا، بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی، مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
نکلے جنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ! اس طرح کی جنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

○

پی لی ہم نے شراب پی لی
تھی آگ مثالِ آب پی لی

اچھی پی لی، خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے
آئی شبِ ماہتاب پی لی

منہ چوم لے کوئی اس ادا سے
سرکا کے ذرا نقاب پی لی

منظور تھی تشنگی زباں کی
تھوڑی سی شراب ناب پی لی

○

او کوسنے والے اب دعا دے
اتنا کہہ دے خدا شفا دے

قطرۂ جسم بادہ کا مزا دے
شبنم مری پیاس تو بجھا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے
یارب مجھے دردِ لا دوا دے

صیاد نہ باغ کی ہوا دے
وہ دور سے آشیاں دکھا دے

سب مے کدے ہیں اس سے خالی
دل کو مرے بے خودی ندا دے

یہ دولتِ حسن و دولتِ عشق
بس کی نہیں جسے خدا دے!

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے
تو رخ سے ذرا نقاب اٹھا دے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں
ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

گائیں وہ اے ریاض! شرمائیں
تو رو کے یہی غزل سنا دے

ایضاً

○

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

جامِ توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

پر پروانہ بنے خود شررِ شمع کبھی
شررِ شمع بنے پر کبھی پروانوں کے

ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آئی ہے بہار
وہ تو وہ رنگ بدل جاتے ہیں زندانوں کے

آج بت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بن کر
اب جو لکھا ہے مقدر میں مسلمانوں کے

وسعتِ ذات میں گم وحدتِ کثرت ہے ریاض
جو بیاباں ہیں وہ ذرے ہیں بیابانوں کے

جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

ہے اُداسی شبِ ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اُٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمیں تم پہ ہیں مرنے والے

عمر کیا ہے ابھی کم سن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

نزع میں حشر کے وعدے سے یہ تسکیں بخشی
چین سے سو رہے منہ ڈھانپ کے مرنے والے

صبر کی میرے، مجھے داد ذرا دے دینا
او مرے حشر کے دن فیصلہ کرنے والے

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاضؔ
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

○

کوئی جانے، یہی ہیں ایک جلوا دیکھنے والے
یہ موسیٰ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

نئے ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح، وہ ہیں ہم
ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

کھلیں گی بے ثباتی دیکھ کر آنکھیں حبابوں کی
یہی ہیں سر اٹھا کر جوشِ دریا دیکھنے والے

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں
یہی ہوں گے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے

گرے غش کھا کے موسیٰ، تو صدا یہ طور سے آئی
کھلیں آنکھیں تری، کچھ تو نے دیکھا، دیکھنے والے؟

سنو افسانۂ جم! جام رکھ کر سامنے اُن کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

نشیمن میں نہیں ہیں، تو شرار و برق کیوں جائیں
یہ جا کر، کون میرا آشیانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

○

وحدت پکارتی ہے وہ کثرت سے دُور ہے
ہر انکشاف، رازِ حقیقت سے دُور ہے

دونوں میں ایک میرے لیے عیش ہو کہ غم
میرا مقام دوزخ و جنت سے دُور ہے

ہل چل میں حشر کی، نہیں موقع وصال کا
وقتِ وفائے عہد، قیامت سے دُور ہے

آئینۂ مثال میں ہوں، حسنِ بے مثال
لیکن وہ عکس ہوں کہ جو صورت سے دُور ہے

میں نے کرم جان کے تجھ کو، کیے گناہ
بخشے نہ تو مجھے، تری رحمت سے دُور ہے

توبہ کے بعد بھی مجھے پہنچے نہ تجھ سے فیض
ساقی یہ تیری چشمِ مروت سے دُور ہے

اے شیخ! اس کی چھاؤں بھی نہیں خلد کو نصیب
یاروں کا مے کدہ تری جنت سے دُور ہے

اس کی بلا سے چاہے قیامت کبھی نہ آئے
ہو جائے صبح، یہ شبِ فرقت سے دُور ہے

پینے کے تو نہیں پس توبہ کبھی ریاض
ساغر سے ہاتھ اٹھائیں یہ حضرت سے دُور ہے

○

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے، خلد مقام ہو گئی ہے

قابو میں ہے ان کے وصل کا دن
جب آئے ہیں شام ہو گئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے، جام ہو گئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

مے نوش ضرور ہیں وہ نااہل
جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بجھ بجھ کے جلی تھی قبر پر شمع
جل جل کے تمام ہو گئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پر ہے دشنام
اب حسنِ کلام ہو گئی ہے

ہے دُور ابھی ریاض منزل
دن ختم ہے، شام ہو گئی ہے

○

آزاد انصاری

○

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا!
آہ! کسی مصرف کا نہ رکھا

آج تک آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں
آہ! وہ پیارا پیارا جلوا

زخم نہ کھانا، ٹھیک نہیں ہے
دیکھو! ستا کر کچھ نہ ملے گا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے
آنکھ اٹھا کر، دیکھ نہ لینا

زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے
کاش! ترا ارمان نہ ہوتا

آہ ہماری ناؤ کی حالت
موجیں حائل، طوفاں برپا

آزاد آپ اور قیدِ علائق
"مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ"

○

مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ
خوش جی، اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فرقتِ دوست
جی بھی بے کل، دل بھی اُچاٹ

جور و جفا کی خُو تو نہ ڈال
مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

رہروِ حیرت! دیکھ کے چل
غافل! آگے راہ نہ گھاٹ

ارض و فلک، سب سرگرداں
جس کو دیکھو، بارہ باٹ

آزاد آپ اور اتنی دُون
"بل بے ندی تیرا پاٹ"

○

نہ پوچھو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اُدھر پہلو سے تم اُٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اُٹھے
چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

کسے فرصت؟ کہ فرضِ خدمتِ الفت بجا لائے
نہ تم بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

جو اُٹھے ہیں، تو گرمِ جستجوئے دوست اُٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ الفت
ہزاروں جستجو میں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا!
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے مے خانہ خالی ہو
وہ دیکھو! کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

○

سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے، ہمارا ماننا ممکن نہیں
زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا: یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں
وہ یہ کہتے ہیں: ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں
وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اتنی ہیں، جن کا چھاننا ممکن نہیں
مادے کی ساری تعریفات برحق، لیکن اب
روح کو آلودگی میں ساننا ممکن نہیں
رازِ عالم تا زباں لانا تو ممکن ہے مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں
کچھ ہوا، اب ناقص کو کامل جاننا امرِ محال
کچھ ہوا، اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں
منکرِ عرفانِ حق! جا، شبہ و شک بالکل فضول
ظرفِ قابل لے کے آ، عرفان ناممکن نہیں
عقل والو! عقل پر غرّہ تو اک حد تک درست
لیکن اس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں
حضرتِ آزاد اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب گردانا ممکن نہیں

(بہ صنعت ترصیع جدید)

وہ تیرا دل میں رہ کر، آنکھ سے مستور ہو جانا
وہ میرا باوجودِ قرب تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا میری امیدوں کو بے دردی سے ٹھکرانا
وہ میرا شیشۂ دل، سنگِ غم سے چُور ہو جانا

وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا
وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ پاسِ وفا دینا
وہ میری غم نصیب امید کا مسرور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا
وہ میری جد و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا
وہ میرے دامنِ امید کا بھرپور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنی لم یزل الفت عطا کرنا
وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

خوشا آزاد کا فیضانِ صحبت جس نے سمجھایا
خدا کا قرب کیا شے ہے، خودی سے دور ہو جانا

جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمھارا خیال ہے
اور وہ خیال، جس کا بھلانا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے!
للہ یہ نہ پوچھ کہ "جی کیوں نڈھال ہے؟"

اچھا! اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں؟
کم بخت! دیکھ تو، کوئی پرسانِ حال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ "افشائے راز ہو!"
یہ عرض تھی کہ "ضبطِ تمنا محال ہے!"

آزاد دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے: طبیعت نڈھال ہے

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں خدا کرے

تکرارِ لن ترانی پیہم روا، نہ رکھ
ایسا نہ ہو کہ شوقِ تماشا گلا کرے

کیا فائدہ؟ کہ شکوۂ جور و جفا کروں
کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے؟

شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
"مجھ سے دغا کرے، تو خدا سے دغا کرے"

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات
شاید یہی علاج کوئی فائدہ کرے!

درویش کی پرکھ ہے تو درویش کی سنو!
درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے!"

آزاد! اجر خوفِ جزا، امرِ حق سہی
لیکن تری بلا، غمِ روزِ جزا کرے

○

بے خبر! وجہ بنائے دو سرا بھی عشق ہے
کارِ انساں ہی نہیں کارِ خدا بھی عشق ہے

سمِ قاتل بھی ہے، تریاقِ شفا بھی عشق ہے
موت بھی ہے موت کے دکھ کی دوا بھی عشق ہے

رہرو! راہِ محبت میں نڈر آگے بڑھو
صرف رہزن ہی نہیں ہے رہنما بھی عشق ہے

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیے
مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

شیخ صاحب! عشق کارِ اہلِ عصیاں ہی نہیں
پیر و مرشد! مسلکِ اہلِ صفا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیوں کر کیجیے!
زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ! اب آزاد! آسن مار بیٹھیں اور جپیں
آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

○

آرزو لکھنوی

○

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی متوالا بنا لہرا کے گرا
آگے تو ہیں راہیں اور کٹھن دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

دل شوق کے جوش میں دوڑ پڑا اور شوق تو ہوتا ہے اندھا
در بند پڑا تھا قسمت کا ٹکر جو لگی تیورا کے گرا

کیا عشق کی منزل بھی تھی کٹھن بندھ بندھ کر ہمت ٹوٹ گئی
جو ایک قدم چل کر سنبھلا وہ دو قدم آگے جا کے گرا

سُلگی ہوئی ہے غم کی بھٹی دل کیوں نہ پگھل کر بہ جاتی
جو قطرہ آنسو بن کے بہا لہرا کے چلا تیورا کے گرا

جو نالہ فلک سے ٹکرایا وہ آرزو اک تارا ٹوٹا
دشمن کی طرف جو لپکا تھا وہ شعلہ مجھی پہ آ کے گرا

○

بجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب
دھواں سا تو ہے لَو نکلنا کہاں اب

وہ ہر آنے والے پہ دھوکا اُنہی کا
وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

رہا کرتا ہے جی بھی ڈوبا ہوا سا
وہ ہاتھوں کلیجہ اچھلنا کہاں اب

پڑے رہتے ہیں یونہی منہ کو لپیٹے
وہ اُٹھ اُٹھ کے پہروں ٹہلنا کہاں اب

للک ہو کسی کی تو ہوکیں بھی اُٹھیں
تڑپ کر وہ کروٹ بدلنا کہاں اب

لگی تک تھا سب کا لگانا بجھانا
جلانا کہاں اب ہے جلنا کہاں اب

اٹھا اور گرا آرزو اس گلی میں
نہیں پاؤں جمتے سنبھلنا کہاں اب

○

سب کی جتیں پلٹ گئیں سنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اداس اداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں

اچھا ہے جو گزر چکی آپ بھی اس کو بھول جائیں
سنتا ہے کون دم کے کان لمبی کتھا کسے سنائیں

کوس کڑے تھے چاہ کے دھوپ میں تیور آ گئے
ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں

پوچھ نہ مار کر پلک لمبی سی سانس لی تھی کیوں
پھر ہوئی ویسی ہی کھٹک کاہے کی ہے یہ کیا بتائیں

آگ ہے لگی ہوئی چھوڑو ہٹو الگ رہو
بجلی ہے ایک ایک نس ہاتھ کہیں نہ جھنجھنائیں

جس نے کہ چین کھو دیا ہے وہی جی کا چین بھی
یہ بھی نہیں کہ رکھیں دھیان یہ بھی نہیں کہ بھول جائیں

چاند سے منہ کی ہے وہ چھوٹ جیسے دمکتی بجلیاں
دیکھنے کی ٹھہر چکی آنکھیں رہیں کہ پھوٹ جائیں!

چپ ہیں تو یہ کہ چپ ہو کیوں بولیں تو ہاں یہ کیا کہا
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس سے بتائیں کیا بتائیں

اس کی گلی میں آ ڈٹے آرزو اب ہٹیں گے کب
اس سے ہو جانے تو انکار اس سے ہو جائے جہاں جائیں

○

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغ جہاں سے باغ جناں میں جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندۂ گل بلبل میں ہو گا گل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک زبانیں دو ہیں آپ کہو یا کہنے دو

اپنا جنونِ شوق دیا کیوں خوف جو تھا رسوائی کا
بات کرو خود قابلِ شکوہ الٹے مجھ کو الہنے دو

آرزو

○

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولانگاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بتخانہ بھی

غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہیے جی کا حال؟
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

○

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ گئی
کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اُتار رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی ملی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلاجھلی

رب سے بڑا ہوا تھا دن آئے تھے دیکھنے سبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھلبلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مگر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ ہی کی نباہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کی آڑ دونوں میں یوں گھلی ملی

اس کے لیے کہ آرزو بنتا ہوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھتا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

آگئی پیری، جوانی ختم ہے
صبح ہوتی ہے، کہانی ختم ہے

حسرتوں کا دل سے قبضہ اٹھ گیا
غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہوگیا ذوقِ نظارہ خود فنا
یا بہارِ بوستانی ختم ہے

ماجرائے غم چراغِ صبح کا
ختم اور اپنی زبانی ختم ہے

صورتِ یخ بستہ ہے جوشِ گداز
بہتے دریا کی روانی ختم ہے

ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں
اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اس کی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

○

ہر ابھی ہے دل تو پتھر ہے، یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہہ نکلے، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سو پلٹے کھائے زمانے نے، اور دل کا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نازِ ستم، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غم خواری جب کاوش ٹھہری، راحت کی امید کروں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آ کر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اس فیصلے پر تیرے ظالم رونے کو ہے قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

الفت میں خموشی پر بھی حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور مہر لبوں پر ہوتی ہے

اے آرزو اب ہم جیتوں میں ہے ظرف کا اس کے خدا حافظ
جس دل میں جہاں کی نیرنگی سب سرد و گرم سموتی ہے

○

علامہ اقبال

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو، تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی، تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

○

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ! کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی،
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل!
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

○

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا، مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ، جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح، تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ! کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انھیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

○

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو، ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے، نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

یہ دیکھو! مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی، رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر! ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

○

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا، آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی
شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریِ بت خانۂ ایام ابھی
عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی
سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی
ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک؟
مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی
خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

○

○

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار! کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

○

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا، تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا، پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق، تو آنکھوں کو بند کر!
ہے دیکھنا یہی، کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق کے
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

○

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

○

حسرت موہانی

○

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریٔ رنگِ حیا ہے کیا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشقِ خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بامِ یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل! یہ جائے حوصلہ ہے دیکھتا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

○

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

ق

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
بزمِ طرب ہے وہ بزم، کیوں ہو
ہم غم زدوں کو واں باریابی

ق

اس نازنیں نے باوصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی، حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرت
عالی جنابی، گردوں رکابی

○

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

○

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائیے　　بندہ پرور! جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات　　بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجیے محوِ الم　　درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم　　ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے　　قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب　　دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں　　اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا　　آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُرجفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے　　اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال　　آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر!　　مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں　　یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد　　اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر　　اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے　　تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

○

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کی باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا، تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا، بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

○

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا　　ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی　　دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی　　شادیٔ مرگ کا بہانہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر　　ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ　　تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا
حیف ہے اس کی بادشاہی پر　　تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج　　یہ بھی اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جب تلک میرے دل میں جان رہی　　دردِ مایوس مرحبا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد　　وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

قانعِ رنجِ عشق تھا حسرت
عیشِ دنیا سے آشنا نہ ہوا

○

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

○

ہم حال انہیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں
کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

اور ایسے کہاں حیرت و حسرت کے مرقعے
اے دل! جو ترے آئنہ خانے میں لگے ہیں

کہنا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب
پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

کچھ ہوش سر و پا کا نہیں، رندِ خرابات
ابھی ہے گھٹا، دھوم مچانے میں لگے ہیں

قاتل! ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے
کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

ہر دم ہے یہ ڈر پھر نہ بگڑ جائیں وہ حسرت
پہروں انہیں رو رو کے ہنسانے میں لگے ہیں

○

اصغر گونڈوی

○

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٔ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا، تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

○

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں!
ہزاروں بن گئے کعبے، جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل، معاذ اللہ!
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے!
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

ہے بجا! ہو اگر حسن، تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

خرمن گل سے لپٹ کر وہیں مرجانا تھا
اب کرے یوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد؟
تو نے دیکھا تھا ستارہ سر مژگاں کوئی؟

کیا کرے زاہد بے چارہ اسے کیا معلوم؟
رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

دل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
اب نچوڑا تو ہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

اب اسے ہوش کہوں یا کہ جنوں اے اصغر
مجھ کو ہر تار میں ملتا ہے گریباں کوئی

○

کیا کہیے! جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یوں ہی نہ جانیے مری مشتِ غبار کو

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

ہاں اے نگارِ خوبی و اے جانِ دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبحِ بہار کو

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

تھی جتنے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ
یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو

یہ رازِ دل ہے، ہستیٔ کل کائنات ہے
دیکھیں حضور دیدۂ امیدوار کو

کچھ اور ہی فضائے دلِ بے مدعا کی ہے
دیکھا ہے روز وصل و شبِ انتظار کو

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

○

اصغر

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

اب ہو تو سنگ و خشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

کسبِ حیات تو تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی، مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دیکھوں! ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے، مرا امتحاں نہیں

اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

○

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں: اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں، عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

○

○

ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

دل مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا، نہ رہا

آ کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا، نہ رہا

اُن کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امیدوار تھا، نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا، نہ رہا

کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا، نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا، نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا

مہرباں! یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

○

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دُور
اس آپ کی زمیں سے الگ، آسماں سے دُور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں!
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور

وہ پُوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دور

آنکھیں چُرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

○

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں!

وہ یہیں ہیں، جو وہ کہیں بھی نہیں
آئیے! دل میں جستجو تو کریں!

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں!

رنگ و بُو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دنیائے رنگ و بو تو کریں!

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی!
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

وہ اُدھر، رُخ اِدھر ہے میت کا
رُخ فانیؔ کو قبلہ رُو تو کریں

○

مشتاق خبردار رہیں دل سے، جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر، اُن کی نظر سے!

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے
سینے میں دھواں خیر ہے! اُٹھتا ہے کدھر سے

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانیؔ
روتی ہے گلے مل کے سحر، شمعِ سحر سے!

○

تہِ خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے
مر کے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
بزمِ رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پٹخا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے!
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

○

اس کشاکشِ ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیے! تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اللہ رے سکونِ قلب اس کا، دل جس نے لاکھوں توڑ دیے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

غم راز ہے اُن کی تجلی کا، جو عالم بن کر عام ہوا
دل راز ہے اُن کی تجلی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے، وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

انسان کی ساری ہستی کا مقصد ہے فانی ایک نظر
یعنی وہ نظر، جو دل میں اُتر کر زخم بنی، مرہم نہ ہوئی

○

○

نظر آج ان سے رہ گئی مل کے
آخری کچھ پیام تھے دل کے

تو نے دیکھے ہیں اے نسیمِ سحر!
کچھ فدائی تھے شمعِ محفل کے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
آج کانٹے نکل گئے دل کے

پھول کو بھول جاننے والے
کل یہ چھینٹے تھے خونِ بسمل کے

تیز تر جادۂ وفا سے گزر!
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

مل بھی جاتے ہیں چھوٹنے والے
چھوڑ جاتا ہے یوں کوئی مل کے

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے!

اُن کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے

مرگِ فانی ہیں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

○

دُنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے!

فانی جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوند کو ترستی ہے

○

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے	کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

مری تباہیٔ دل پہ تو رحم کھا نہ سکے	مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانۂ شمعِ دانش کا	جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

انھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہو کیا	وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے

نہ جانے آہ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گذری	جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل	جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

زہے خلوصِ محبت! کہ حادثاتِ جہاں	مجھے تو کیا، مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن	مرے خلوص [illegible] بچ کے جا نہ سکے

یہ رہرو، آہ! مرے ہم سفر رہے برسوں	پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا	وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے!

○

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ طلب آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

○

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن — لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کامل رہبر، قاتل رہزن — دل سا دوست نہ دل سا دشمن
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن
عمریں بیتیں، صدیاں گزریں — ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے — عشق ہے کارِ شیشہ و آہن
برقِ حوادث اللہ اللہ! — جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن — جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں — اور وہ ظالم آئینہ دشمن
غیر مزاجِ حسن کی یارب! — تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
تجھ سا حسیں اور خونِ محبت — وہم ہے شاید سرخیٔ دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے — ہجر کی رات اور اتنی روشن
آ، کہ نہ جانے تجھ بن کب سے — روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

ق

کام ادھورا اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہی ٹھیرا علم کا باغی — عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ق

ہستیٔ شاعر، اللہ اللہ — حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت — فرش نشیں اور عرش نشیمن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

○

سراپا حقیقت، مجسم فسانہ
محبت کا عالم، جنوں کا زمانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادا بے تعلق، نظر محرمانہ

نظر اٹھتے اٹھتے، نظر سے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پرکیف موسم
وہ اشک و تبسم کا رنگیں زمانہ

غرورِ تحمل، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت، مگر فاتحانہ

○

پہچان گیا، سیلاب ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رخ نہ کرے میخانوں کا

ہر کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! بربط ہاتھ سے رکھ دے، ماضی نے در کھول دیا
دنیا دکھ چھُو کر ٹوٹ گیا، پھر کاٹا سا ارمانوں کا!

ہاں! ظلم و ستم سے بھی قدرے پڑتی ہیں خراشیں سینے میں
سب سے ہے مہلک زخم مگر اے حسن ترے ارمانوں کا

اے دینِ وفا! اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ میرا ہاتھ بٹا
مرجاؤں گا میں اے شمع! خدارا! رو دے نہ پھر پروانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی!
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا

اے جوش! جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ قیمت نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

○

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب
آفریں! اے نگاہِ عالم تاب

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں!
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقین!
اور بھی روح ہو گئی بے تاب

بارے اُٹھے تو ناصحِ مشفق!
ہاں کدھر ہے صراحیِ مے ناب

ہاں! اثر اب ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب، جو وہ بیٹھے میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوش کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

○

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی!
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر واعظ
وہ آتے ہیں تو چہرہ پر تغیر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو؟ یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے!
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

○

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر!
وہ چھلکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صراحی جھکا اور دھومیں مچا دے!
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر!
شادارغ ہوش اور مدہوش بن جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر!
نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی!
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
سمندر پہ چل اور الیاس بن جا!
ہواؤں پہ اڑ اور سلیمانیاں کر
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر!
قلم کھول کر جوششِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر!

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

نئی زمیں، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

نگاہیں سطح نو بہ نو پہ ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراق بزمِ چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا ہی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

کچھ ٹھوکریں تو کھا چکا اٹھیں کی منزلیں
پائے طلب کو مگر سلامت روی نہیں

کب دیکھیے دلوں کو ملے اذنِ یاس ابھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

بیخود سے تھے تو وقت کا یہ بھی فریب تھا
ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں

نیند آچلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی
آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

بادِ بہار دیکھ کے کس طرح یہ کہیں
رنگینیوں کی جان تری سادگی نہیں

اے دوست یوں تو ہم تری حسرت کجو کہیں
لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

اے عشق کارواں وہ عالم بچھڑ گئے
اے خضرِ راہ یہ تو کوئی رہبری نہیں

یہ کیفیت سکوتِ سحر میں کہاں کی ہے
وہ شام ہے جو صبح بھی ہو کر کٹی نہیں

شاید کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کونسا راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
یہ جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجاب بے باک
میں اٹھا تا حد آداب تماشا بھی نہیں

ہائے وہ راز محبت جو چھپائے نہ بنے
ہائے وہ داغ محبت جو ابھرتا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

○

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوت ناز، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو

نکہت زلف پریشاں، داستان شام غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیام زندگی
اس سکوت راز، اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگس غماز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

○

رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی
فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی
کہیں زمان و مکاں میں ہے نام کو بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
دلوں میں آج تری یاد مدتوں کے بعد
بچہرۂ متبسم بچشمِ تر آئی
فضا کو جیسے کوئی راگ چیرتا جائے
تری نگاہ دلوں میں یونہی اتر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول
کلی کلی کی صبا جا کے گود بھر آئی
شبِ فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

○

دنیا دنیا عالم عالم تھے اک روز یہی ویرانے — وادی وادی جنگل جنگل چھان گئے تیرے دیوانے
ذرا حجاب اگر اٹھے دلوں میں ایمانوں کو ڈگمگانے — بات وہ کہئے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے
اسی درد سے دنیا غافل اسی درد کا گھر گھر چرچا — ایک شبِ غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے
اوروں سے بھی ہنس کے [illegible] سچا پیار کیا تھا — وہ بھی تھے ترے عشق کے حیلے وہ بھی تھے ترے غم کے بہانے
تو نے ہوا کی زرم روی کو اپنی گوں پہ لگانا چاہا — صید گہِ ہستی میں ناداں یونہی خطا ہوتے ہیں نشانے
غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے — ہائے وہ کارِ جہاں خود جس سے نکلیں بے عملی کے بہانے
حسن کے پاس اس کا نہیں چارہ عشق کا اس میں کیا ہے اجارا — یونہی پھر جاتی ہیں نگاہیں یوں ہی بدل جاتے ہیں زمانے
اس کی نظر پہ حیراں حیراں مجبوری بھی آزادی بھی — وہی کہے جو سب کے دل میں سب کی سنے اور اپنی مانے
دنیا اپنے رنگ محل میں خواب خوشی کے دیکھ رہی ہے — جس میں خوشی نے آنکھیں کھولی تھیں وہ محبت کے تہ خانے
حسن و محبت آپ اپنی توہین ہیں گر معصوم نہ ہوں — تھوڑی دیر کو جیسے بن لیں ہم بھی سیانے تم بھی سیانے
امن و اماں کی دنیا میں بھی ایسے لمحے ملتے ہیں ٹھکانے — کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے
شعلۂ گل پر چادرِ شبنم سرتاسر تصویرِ حیات — رو لینا ہے ہنستے ہنستے ہنس لینا ہے غم کے بہانے
ذرہ ذرہ، تارا تارا، قطرہ قطرہ، دریا دریا — ہوش و خرد ہیں حیراں حیراں کیا کوئی سمجھے کیا کوئی جانے

سامنے کی چیزیں بھی فراق انسان کو چونکا دیتی ہیں
بزم میں جاگتا خواب یہ دیکھا ہیں چراغ ہمیں پروانے

○

حفیظ جالندھری

○

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں، میرے مجروح تبسم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا!

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا ساماں کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات سجھاتا جا

تجھ کو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا!

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دُھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی - خیر، حفیظ خدا حافظ
لیکن جاتے جاتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

○

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی، درد کا دل بڑھا دیا

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا

تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے
جس کو صنم بنا لیا، اس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے شورشِ عقلِ نامراد
اُبھرا کہیں جو یہ فساد دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو میں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
حرفِ غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

خبثِ دروں دکھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

جھگڑا دانے پانی کا ہے، دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے توڑ گئے، اک تار نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزار سیل میں ہے
آقا۔ اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے، عشق ہوس کی بات نہیں

نوش ہے عنواں نیش نتیجہ ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور و مگس کی بات نہیں

کار مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے، فنا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر افتاد دیکھنا!
چپ چاپ آج محو دعا ہو گیا ہوں میں

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار، نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیف بے خودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں!

○

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو — ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ جاؤ
جاؤ۔ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں!

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری!
دیوانگی نہیں نظرِ ہوشیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

○

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں — دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

مری بزمِ وفا سے جانے والو — ٹھہر جاؤ، کہ میں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا — قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا لازمی تھا یہ نتیجہ! — سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

خدا لگتی کہو بتخانے والو! — تمہارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

زہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں — ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو — پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں — کوئی روکے مجھے میں جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل — مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

حفیظ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

○

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں!
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آ سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سنا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے؟

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ، درد کے گیت گا سکے

○

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے!

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری وفائیں شمار کر لے، مری وفا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

میرزا یاسؔ یگانہ

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار ہا اسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا عنقا کیا، ملا ملا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیضِ عشقِ شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

[…]اتی ہے آخر ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ تذبذب کیا

[…]ھر میں ستوالی، وہی گھونٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبالب کیا

[…]عائیں لیتا جا گالیاں بھی دیتا جا
تازگی تو کچھ پہنچے، اچا بنا رہوں لب کیا

[…]ت آئی آخر کہہ گیا خدا لگتی
راستی کا پھل پاتا، بندۂ مقرب کیا

[…]سیدھی سادہ اپنی کہہ تو اُلٹی کہہ
سادہ ہے تو کیا جانے بھانپنے کا ہے ڈھب کیا

[…]جہاد میں دل کے سب فساد ہیں دل کے
[…]بنے دوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا

[…]ہے کا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ داریٔ شب کیا

[…]ر سے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا

[…]لے بہت پئے دن ڈھلے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ! زندہ باد! زندہ باد!
اک بلا سے بیٹے رہ جب تم کیا غضب ادب کیا

○

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو!
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

○

○

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یارب! نہیں میں واقفِ رودادِ زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

○

جتنے ستم کیے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لیے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
لٹنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اُٹھا ہے ابرِ مے کدہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے گلِ فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

○

کیوں نہیں تو اے اجل! فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیئے
آ گیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

○

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا
شباب آیا اور اس انداز سے ان کا شباب آیا

جوانی اور آئینہ، تبسم اور انگڑائی
حیا بے اختیار آئی، اداؤں پہ عتاب آیا

وہی آنکھیں کہ جن سے بادۂ گلگوں چھلکتا تھا
وہی نرگس کی کلیاں تھیں جہاں ہنگامِ خواب آیا

بگڑنا، روٹھنا، باتیں بنانا مجھ سے آتی ہیں
مگر اے دل نہ کوئی ان کے طعنوں کا جواب آیا؟

نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موجِ شراب اٹھی
مجسم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آ کر مچل جائے
اسی انداز سے ان پُرخمار آنکھوں میں خواب آیا

بسا پھولوں کی نکہت میں، لیے مستی شرابوں کی
مہکتا، لہلہاتا ایک کافر کا شباب آیا

نہ دینا داد شوخی کی خلاقی، اب یہ تہمت ہے
نگاہیں اٹھ گئیں کیوں جب ادھر وہ بے نقاب آیا

اثر کو ہوش میں پاؤ تو کہہ دو کوئی کہتا تھا
کہاں ہے، کیا ہوا، جا کر نہ وہ خانہ خراب آیا

○

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا
مگر قیامت قریب آئی، کھلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستم کش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے
تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

کبھی ہے تکیہ ترے کرم پر کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں
یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں ان کے جلووں کا آئینہ ہوں وہ میری حیرت کا آئینہ ہیں
جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا، جواب کیسا

بجائے مے یاد میں کسی کی، پیا ہے خونابِ دل وگرنہ
تمہاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثر یہ رنگِ شراب کیسا

پھر نشیمن تو گلوں سے چھا گئے
دور پھر بجلی کی زد میں آ گئے

سر جھکا کر کچھ کہا، شرما گئے
دلدہی کو آئے تھے تڑپا گئے

جرم ٹھہرا ہے وفا کا ذکر بھی
ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے

منزلِ عشق اب نگاہوں سے ہٹے
پاؤں تو اس راہ میں تھرا گئے

آنے والے آ، کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا، تارے بھی کجلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں حل ہو گئیں
ناگہاں دو دل جہاں ٹکرا گئے

سعیِ ضبطِ اشک کے با وصف اثرؔ
چند افسانے مژہ تک آ گئے

دلہن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے — بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے
شمیمِ دوست لیے پیرہن میں آئی ہے — نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے
ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ — یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے
بسائی جاتی ہے اس میں قمیصِ یوسف کی — ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے
وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذاللہ — بہار وادیِ زخمِ کہن میں آئی ہے
یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں — صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے
نسیمِ صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی — نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے
بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر موج افزا — ہوائے تیشہ سر کوہکن میں آئی ہے
گمان ہوتا ہے اُف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثرؔ کے دہن میں آئی ہے

اشرف علی خان فغاںؔ

○

کہتے ہیں: فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی
اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سُرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں، تو یوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ، مروّت اگر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو، تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری، دوں بھی گزر گئی

آخر فغاںؔ وُہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک، وہ اُلفت کدھر گئی!

○

ظالم! تجھے قسم ہے، جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے، جو تجھ کو دُعا نہ دے

قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دُور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے

بے طرح جوشِ گل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو ہاں فغاںؔ
اُلفت بُری بلا ہے، کسی کو خدا نہ دے

میرزا مظہر جانِ جاناں

○

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے! بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پہ ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر انہیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں، آتی ہے بہار

شاخِ گل ہلتی نہیں پہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

○

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اُپر خواب
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

خدا کے واسطے! اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میر سوز

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا
کہاں کا جان کو میری دھرا تھا

وہ ساعت کون سی تھی یا الٰہی!
کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا

میں کاش: اس وقت آنکھیں موند لیتا
کہ میرا دیکھنا، مجھ پہ بلا تھا

میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا
خداوندا! میں کیوں عاشق ہوا تھا

ولے کیا آن تھی، اللہ اللہ!
کہ جس غمزے سے چھاتی پر چڑھا تھا

وہ مجھ کو ذبح کرتا تھا چھری سے
میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

نہ تھا اس وقت جز اللہ، کوئی
ولے یہ سوز پہلو میں کھڑا تھا

مری جان جاتی ہے، یارو سنبھالو!
کلیجے میں کانٹا چبھا ہے، نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

خدا کے لئے اے مرے ہم نشینو!
یہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلالو

اگر وہ نہ آوے تمہارے کہے سے
تو منت کرو، گھیرے گھیرے بلالو!

اگرچہ خفا ہو کے وہ گالیاں دے
تو دم لے رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو

کہو: ایک بندہ تمہارا مرے ہے
اسے جاں کنی سے تو جا کر بچالو!

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

قائم چاند پوری

○

ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو! بندہ کے خریدار بہت

ہم گر جب خفگی آئی، تو جھگڑا کیا ہے
تم کو خواہندہ بُت ہم کو طرحدار بہت

سچ کہو قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے
ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

○

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض

اک صافیٔ تن ہے گل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض

اس سینے سے مُنہ رگڑ نہ اے داغ
اس کی تھی کبھو یہ جائے عارض

بیعانے میں مہر و ماہ دیتے
تیرا ہو جہاں بہائے عارض

کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشہ
اے وائے جبین و ہائے عارض

کیا دور، جو حشر ہووے قائم
کھ مات جو وُہ دکھائے عارض

انعام اللہ خاں یقینؔ

سریرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا

ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں دم مر کے بہت دیکھے
ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا، تو وہ بیمار بہتر تھا

○

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا بُرا نہیں یہ شغل، کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پُوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے بجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیںؔ کا شورِ جنوں سُن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خواجہ احسن اللہ بیاںؔ

○

مَیں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا
گردِ غم دل سے دھو نہیں سکتا

شب مرا شورِ گریہ سن کے کہا
اس کے ہاتھوں ہیں سو نہیں سکتا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

جوں مسلسل بیاںؔ کہے ہے سخن
کوئی موتی پرو نہیں سکتا!

○

جو ہوتا ہے ریحان و سنبل کے صدقے
نہ ہوں کیونکہ اس زلف و کاکل کے صدقے

خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوفِ چمن کو
غرض ہو جئے عشقِ بلبل کے صدقے

جلو میں بھرے ہیں پری زاد لڑکے
دِوانے ترے اس تجمل کے صدقے

ابھی وعدہ کر کر، لگا سوچنے تو
نہیں یاد گویا، تامل کے صدقے

بیاںؔ کون ہے، اب تلک پوچھتے ہو
تغافل کے قرباں، تجاہل کے صدقے

میر محمدی بیدار

○

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

گر یہی زلف و یہی مکھڑا ہے
غارتِ دیر و حرم کیجیے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز!
کہیے! کس روز کرم کیجیے گا

○

تیری ہم خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

دل و دیں تھا سو لیا، اور بھی کچھ مطلب ہے
بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں

کیا ہو گر ایک گھڑی یاں بھی کرم فرماؤ
آپ اس راہ سے آخر تو گزر کرتے ہیں

تیرے ایامِ فراق اے صنمِ مہر گسل
آہ! مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں

دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

یہ وہی فتنہ و آشوبِ جہاں ہے بیدار
دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں

بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجیے
آگے تو جان میاں! ہم تو خبر کرتے ہیں

میر عبدالحیّ تاباںؔ

○

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہُوا
میرے غریب دل کو الٰہی! یہ کیا ہُوا

مَیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یا رب! کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہُوا

تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کڑھ کہ تیرے یار
مُجھ سے بہت ہیں، ایک نہ ہوگا، تو کیا ہُوا

ہردم کروں نہ کیونکہ گریباں کو اپنے چاک
آتا ہے یاد یار کا جامہ کسا ہُوا

تاباںؔ کے دیکھنے سے بُرا مانتے تھے ہم
کھو دی بہار خط نے تمہاری، بھلا ہُوا

○

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہُوا
اہلِ جنوں کدھر گئے، یاراں کو کیا ہُوا

غنچے لہُو میں تر نظر آتے ہیں تہ بہ تہ
اس رشکِ گُل کو دیکھ، گلستاں کو کیا ہُوا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیراں ہوں مَیں کہ گل کے گریباں کو کیا ہُوا

آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل
بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہُوا

روتے ہی تیرے غم میں گزرتی ہے اس کی عُمر
پُوچھا کبھی نہ تو نے کہ تاباںؔ کو کیا ہُوا

سعادت یار خاں رنگین

○

دل تھا جو ساتھ اپنی، سو گذران چکے ہیں
[illegible] کریں، جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

ست چوک! ادھر دیکھ! یہ ہے مفت کا سودا
ک بوسہ پہ دین و دل و ایمان سپ چکے ہیں

سو بار کہا آؤں گا، اور آئے نہ ہرگز
عہد ہو تم، ہم تمہیں پہچان چکے ہیں

پھر حل نہیں کچھ فائدہ، بس سونے دے رنگیں
وہ منہ پہ دوپٹے کے تئیں تان چکے ہیں

○

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں ہر دم خفقاں رہتا ہے

شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دنیا کی یہی
دل جو لگتا ہے، تو پھر پاس کہاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے اس کے آئے
نازک اتنا ہے بدن اس کا، نشاں رہتا ہے

ق

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگیں بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

تو کچھ اک تاؤ سا کھا، چیں بجبیں ہو کے وہیں
گالی دے کر یہ کہا اس نے کہ ہاں رہتا ہے

غزل نمبر —— ۲۱ —— نقش

شاہ نصیر

کب دل نہیں پہلو سے ہمارا ہمہ تن چشم
نظارۂ ساقی کو ہے مینا ہمہ تن چشم

تو وہ چمن آرا ہے کہ ہر دستۂ نرگس
دیکھے ہے ترا بن کے تماشا ہمہ تن چشم

بُرقع کو اُلٹ مُنہ سے جو کرتا ہے تو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش ہوں یا ہمہ تن چشم

کیا خاک ہو صیاد مجھے چشم رہائی
حلقوں سے بنا دام ہے تیرا ہمہ تن چشم

آنکھوں کے تصور میں نصیر اس کی شب و روز
دل صورتِ آئینہ ہے اپنا ہمہ تن چشم

قدم نہ رکھ مرے چشم پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موج کا طوفاں حباب کے گھر میں

کہے ہے دیکھ کے وہ عکسِ رُخ بہ ساغرِ مے
نزولِ ماہ ہوا آفتاب کے گھر میں

مدام رند کریں کیوں نہ آستاں بوسی
حرم ہے شیخ مشیخت مآب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آ چھپے ہیں اے ساقی
پُھنکے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

دلا نہ کیونکہ کروں اختلاط کی باتیں!
حجاب کیا ہے اب اس بے حجاب کے گھر میں

نصیر دیکھ! تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس بُتِ خانہ خراب کے گھر میں

کرامت علی شہیدی

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

پری اُٹھی مرے پہلو سے بارہا ناکام
فریفتہ ہوں تری طرزِ دل رُبائی کا

مجھے عذاب جہنم کہ بُت پرست ہوں میں
وہ بت بہشت میں دعویٰ ہے خدائی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس خوشتر
گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ادب نہ وادیٔ وحشت کے مجھ سے ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

نگاہ، خندہ، تغافل، عتاب کہنہ ہوئے
نکال طرز نیا کوئی دل رُبائی کا

بُتوں کا سجدہ مری سرنوشت میں کب تھا
کہ عزمِ کعبہ کے در پہ ہو جبہ سائی کا

اچک رہا ہے کھڑا بامِ عرش پر کم بخت
قلق ہے مجھ کو شہیدی کی نارسائی کا

جی چاہے گا جس کو، اُسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یک جا نہ کریں گے

اے کاش! چھٹیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے! وفاداری کا دعویٰ نہ کریں گے

گو حُسن پرستی نہ ہو خاطر سے فراموش
خوش قامتوں کا یاد سراپا نہ کریں گے

نرگس کی شبِ تیرہ میں لوٹیں گے بہاریں
پر سُرمگیں آنکھوں کی تمنا نہ کریں گے

بہلائیں گے سیرِ گُل و شبنم سے دل اپنا
اس عارضِ گُل رنگ کی پروا نہ کریں گے

انگاروں پہ لوٹیں گے، پر ان شعلہ رُخوں کے
نظارہ سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

عصمت کا انہیں خوف ہے، تقویٰ کا ہمیں پاس
نے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

بکنے کے شہیدی کے بُرا مانیو مت جان!
ہیں عاشقِ صادق کبھی ایسا نہ کریں گے

وزیر لکھنوی

○

[illegible] دل راحت طلب! کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

[illegible] باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قتل اُس نے غیروں کو، مُوئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو! آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا، باتیں سنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں، لگا کر تیغِ پُر آب اُس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو، کماں ہو کر

○

سر مرا کاٹ کے پچھتایئے گا
جھوٹی پھر کس کی قسم کھایئے گا

کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے
ادھر اے دستِ جنوں آیئے گا

آپ کہتے ہیں کہ جا، جاتا ہوں
پر اکیلے بھی تو گھبرایئے گا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اُٹھ جایئے گا

کہئے! یارانِ عدم، کیا گزری
کچھ لبِ گور سے فرمایئے گا

مردمِ چشم سے گر آئے حجاب
آنکھ کے پردے میں چھپ جایئے گا

ہم بھی آ نکلیں گے مسجد میں وزیر
خشتِ خم لے کے جو بنوایئے گا

صبا لکھنوی

○

واعظ کے بیں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا
جام شراب لائے ہی ساقی کدھر گیا

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں
وہ دن گزر گئے۔ وہ زمانہ گذر گیا

ایسی ہوا چلی مری آہوں کی رات کو
سب آسماں پہ خرمن انجم بکھر گیا

اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم
فتنہ گیا، فساد گیا، شور و شر گیا

کعبے کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا

پھر سیر لالہ زار کو ہم اے صبا چلے
آئی بہار، داغ جنوں پھر ابھر گیا

○

تری طرف سے دل لے جان جاں اُٹھا نہ سکے
بہت ضعیف تھے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے

ہزار بار بہار آئی، لیکن اے صیاد
نگاہ ہم طرفِ بوستاں اُٹھا نہ سکے

اسیر زلف جو مرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں
ذرا بھی صدمۂ قیدِ گراں اُٹھا نہ سکے

سنیں جو یار کی باتیں غش آگیا ہم کو
یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اُٹھا نہ سکے

دیا شنکر نسیم

○

جب ہو چکی شراب، تو مَیں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک مَیں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر اک شخص
یہ چاند اُس کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا!

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، جو گزرا، گزر گیا

مَیں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جادو بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے، اور مَیں ڈر گیا!

گزرا جہاں سے مَیں تو کہا سُن کے یار نے
فتنہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا!

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لیے نسیم
آیا جوابِ خط تمہیں اور نامہ بر گیا

○

خم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے
مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

ابرِ رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے!

آپ آہو چشم ہیں، آہو نہیں!
ہم سے وحشت کی نہ لیجے، آئیے!

صبر رخصت ہو تو جانے دیجیے
بے قراری آئے، تو ٹھہرائیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائے گا!
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دل میں ہے دکھلائیے تاثیرِ عشق
ٹھنڈی سانسوں سے انہیں گرمائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم
کہتے ہیں وہ! ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

رند لکھنوی

○

رکھو خدمت میں مجھ سے کام تو لو
بات کرتے نہیں سلام تو لو

بات تم نے نہیں کی غیر سے کل
سر پہ اللہ کا کلام تو لو!

ناز و انداز و حسن و خوبی میں
کون ہے تم سا، اس کا نام تو لو

رندؔ حاضر ہیں شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام، تو لو!

○

مجھے دے کے دل، جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

جو رونا یہی ہے، تو پھوٹیں گی آنکھیں
مجھے اب تو آنکھوں کا رونا پڑا ہے

کیے سینکڑوں گھر محبت نے غارت
سنو جس محلے میں، رونا پڑا ہے

میں پاتا نہیں دل کو سینے میں اپنے
کئی دن سے خالی یہ کونا پڑا ہے

کرو چل کے آباد اب گور اے رندؔ!
بہت دن سے سونا وہ کونا پڑا ہے

میر مہدی مجروح

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اک عمر کے دکھ پائے سوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی، کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آ جانا

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چلمن کا الٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہرصورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بہ طرف اس کے چاہے سو ستم کر لے
اس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

گریباں چاک ہیں گل بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں

قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں

دعائے وصل جا اب تو اثر تک
کئے نالوں نے روزن آسماں میں

سنے گر طالعِ خفتہ کا قصہ
تو نیند آ جائے چشمِ پاسباں میں

زلیخا کی بچھی جاتی ہیں آنکھیں
کہیں یوسف نہ ہو اس کارواں میں

تمام اسبابِ دنیاوی کے بدلے
ہے اک بے رونقی اپنی دکاں میں

سنا حالِ دلِ مجروح شب کو
کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

جلالؔ لکھنوی

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں، کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وہ باغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا
نہ دل ہی تھا نہ ٹھکانے، فراغ بھی نہ ملا

دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی، کوئی چراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا، گم ہوئے ایسے
حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

○

نہ ٹھہری جب کوئی تسکینِ دل کی شکل یاروں میں
تو آنکلے تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں

کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آنکلنا ہم بھی ہیں امیدواروں میں

وہ ماتم بزمِ شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مرنا، زندگی ہے، تم جہاں ہو سوگواروں میں

تعلّی سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی
اگر اٹھتی بھی ہے جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں

ہمارے دل نے ہم سے بے وفائی کر کے کیا پایا؟
وہاں بھی جا کے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

وہ کھینچوں گا جلالؔ آہیں کہ اس کی خاک اڑا دیں گی
فلک نے پیس ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

تسلیم لکھنوی

وصل کی شب بھی ادائے رسمِ حرماں میں رہا
صبح تک اس التماسِ شوقِ پنہاں میں رہا

مر گئے لاکھوں شہیدِ ناز، کچھ پروا نہیں
وہ تماشائے ہلالِ عیدِ قرباں میں رہا

کام ایسا کر چکی بیماریِ عشقِ بتاں
میں فریبِ نسخہ و تاثیرِ درماں میں رہا

واہ رے پاسِ وفا! اللہ ری شرمِ آرزو
ہر نفس ہمراہیِ عمرِ گریزاں میں رہا

کیا پڑھے اشعار تسلیمِ جگر افگار نے
شورِ تحسیں ہر طرف بزمِ سخنداں میں رہا

کل مرا تھا، آج وہ بُت غیر کا ہونے لگا
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا

یاد میری آ گئی، منہ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

ہائے کب اس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
درد کی لذت سے جب دل آشنا ہونے لگا

آہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا شکر ہے
بام پر آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا

بام پر جب تک وہ مہرِ حُسن ہے سرگرمِ سیر
بھیڑ کیوں چھٹنے لگی، کیوں راستا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں قافلا ہونے لگا

یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
جب دوا کی ہم نے دردِ دل سوا ہونے لگا

مرزا قادر بخش صابر

○

[illegible]و دل کو محبت کے مزے آئے ہوئے ہیں
[illegible] طبیعت پہ ابھی چھائے ہوئے ہیں!

مزاج پہ اظہارِ نزاکت ہے، بجا ہے!
[illegible]ت ہے کہ تکلیف بھی کچھ پائے ہوئے ہیں

کچھ تم نے ہمیں دل میں سمجھ رکھا ہے سمجھو!
کچھ ہم بھی تمہیں ذہن میں ٹھہرائے ہوئے ہیں

پھر ملنے کو جی چاہتا ہے یار کا ہم سے
[illegible] ہیں غصے میں قسم کھائے ہوئے ہیں!

اللہ ری ضد کوٹھے کے چڑھنے کو کیا ترک!
جس روز سے ہم یار کے ہمسائے ہوئے ہیں

اب دل کو لگاتے ہیں ذرا سوچ سمجھ کر
دو چار جگہ پہلے جو زک پائے ہوئے ہیں

کچھ در پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھے ہیں صابر
اس بزم سے شاید کہ نکلوائے ہوئے ہیں!

○

پہلے نہ اڑایا کسی بے کس کے جگر کو
پر ہم نے لگائے ہیں ترے تیرِ نظر کو

ہے تیرِ نگہ بزمِ عدو میں مری جانب
غصے میں چھپایا ہے محبت کی نظر کو

کیوں آتشِ گُل باغ میں ہے تیز کہ ہم آپ
اٹھ جائیں گے اے شبنمِ شاداب! سحر کو

دن رات کا فرق ان کی محبت میں ہے اب تو
وعدہ تو کیا شام کا اور آئے سحر کو

دل چیز ہے کیا جان بھی دوں عشق میں صابر
میں نفع سمجھتا ہوں مدام ایسے ضرر کو

نظامؔ رامپوری

انگڑائی بھی وُہ لینے نہ پائے اُٹھاکے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چُرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

بے اختیار ہو کے جو مَیں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اُس نے دھرا مُسکرا کے ہاتھ

قاصد! ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ

دیکھا جو کچھ رُکا مجھے، تو کس تپاک سے
گردن میں میری ڈال دئے آپ آ کے ہاتھ

کوچے سے تیرے اٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ!
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ!

کیوں لُٹتے ہو اعتبار میرا
معلوم ہے تم کو پیار میرا

یہ خیر ہے آج کچھ تو کہیے!
کیوں ذکر ہے بار بار میرا

اک بات میں فیصلہ ہے تم سے
رنجیدہ ہے دل ہزار میرا

تیرا نہیں اعتبار مُجھ کو!
تو بھی نہ کر اعتبار میرا

شاید کہ نہ ہو تم اپنے بس میں
دل پر تو ہے اختیار میرا

مجھ کو نہ ہو رشکِ غیر ممکن
تو اور ہو دوستدار میرا

کچھ سمجھے ہوئے ہیں اپنے دل میں
سنتے نہیں حالِ زار میرا

وہ ہائے بگڑ کے اس کا جانا
رونا وہیں زار زار میرا

کل تک تو نظامؔ یہ نہ تھا حال
دل آج ہے بے قرار میرا

حفیظ جونپوری

دل اس لئے ہے دوست کہ دل میں ہے جائے دوست
جب یہ نہ ہو بغل میں ہے دشمن بجائے دوست

مٹنے کی آرزو ہے اسی راہگذار میں
اتنے مٹے کہ کوئی کہیں خاک پائے دوست

تقریر کا ہے خاص ادائے بیاں میں لطف
سنئے مری زبان سے کچھ ماجرائے دوست

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں عالم کی کائنات
دنیا برائے دوست ہے عقبیٰ برائے دوست

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر
رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے
مے کی جو بوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں
سانس رکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

بیخود بدایونی

○

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی ، دشمنی نہ ہو جائے

تم مری دوستی کا دم نہ بھرو
آسماں مدعی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالعِ بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمہاری خودداری
دشمنِ بے خودی نہ ہو جائے

○

ساتھ ساتھ اہلِ تمنا کا وہ مضطر جانا
اللہ اللہ ترا بزم سے اُٹھ کر جانا

رہبری کرکے مری خضر بھی چکر میں پڑے
اب انہیں جلوہ گہِ یار میں اکثر جانا

داغِ کم حوصلگی دل کو گوارا نہ ہوا
ورنہ کچھ ہجر میں دشوار نہ تھا مر جانا

سادگی سے یہ گماں ہے کہ بس اب رحم کیا
مطمئن ہوں کہ مجھے آپ نے مضطر جانا

نشہ میں بھی ترے بیخود کی تعلی نہ گئی
بادۂ ہوش رُبا کو مئے کوثر جانا

وحید الدین سلیم

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہاں دامن کی کلیوں سے گلستاں کو

اُڑایا چٹکیوں میں میرے ذرّے نے بیاباں کو
مرے قطرے نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفاں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یا رب موجِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو کہ اک بلبلِ مضطر نے
کہ میری لے نے رقصاں کر دیا سارے گلستاں کو

میں وہ ہوں قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشاں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

کلیمِ طورِ معنی ہوں ید بیضا ہے میرا دل
منور کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

○

مدت ہوئی ہے مدحِ حسیناں کئے ہوئے
نورِ سخن سے دل کو چراغاں کئے ہوئے

عرصہ ہوا ہے وصفِ بہارِ جمال سے
روئے ورق کو رشکِ گلستاں کئے ہوئے

برسوں ہوئے ہیں تذکرۂ سوزِ عشق سے
بزمِ سخنوری کو درخشاں کئے ہوئے

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشکِ آفتاب
ظلمت کدے دلوں کے چراغاں کئے ہوئے

جاتا ہوں کوئے یار کو دیکھ اے گھٹا مجھے
برپا ہجومِ اشک سے طوفاں کئے ہوئے

بیٹھے ہیں ہم تصورِ گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خوابِ پریشاں کئے ہوئے

خوں کر کے لے چلا ہوں دل و جاں کو اپنے ساتھ
دیدارِ روئے یار کا ساماں کئے ہوئے

مر مٹئے اس ادا پہ کہ کچھ لوگ جل بجھے
سینے میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے

وہ نوبہارِ حسن ابھی اس راہ سے گیا
ہر نقشِ پا کو روضۂ رضواں کئے ہوئے

شوکت

سید کاظم علی شوکت بلگرامی

جب میں رویا ہوں وہ روٹھے ہیں یہ الفت میرے ساتھ
مدتوں برسا کیا ہے ابرِ رحمت میرے ساتھ

جان جائے یار ہے دل کو رہے گا پاسِ عشق
قبر میں جائیں گے تیرے رازِ الفت میرے ساتھ

دیتی ہے ترغیب نالے کی کہ ہو آزردہ دوست
دشمنی کرتی ہے اب میری محبت میرے ساتھ

میں تو ہوں دلدادۂ الفت کہو میں کیا کروں
دلربا ہو کر کرو تم جب یہ الفت میرے ساتھ

شکل تیری سامنے آنکھوں کے ہے آٹھوں پہر
یاد تیری ہے شریکِ رنج و راحت میرے ساتھ

بن گیا ہے اب دل اک محشرستانِ خیال
خواب میں جب وہ ہوئے سرگرمِ الفت میرے ساتھ

یاد اب بھولے سے بھی صبحِ وطن آتی نہیں
ہو گئی مانوس ایسی شامِ غربت میرے ساتھ

دل میں دھڑکن، لب پہ نالے، چشمِ تر میں اشکِ خوں
کیا کہوں کیا کر گئی تیری محبت میرے ساتھ

یاد آتا ہے یہ رفتارِ قمر کو دیکھ کر
سیر کرتا تھا وہ یوں ہی ماہ طلعت میرے ساتھ

تو ہے اور تیری نظر میں اک قیامت کا غرور
میں ہوں اور اک محشرِ ارمان و حسرت میرے ساتھ

وہ تو رخصت کر کے مجھ کو گھر میں جا بیٹھے مگر
یاد ان کی دور تک آئی تھی شوکت میرے ساتھ

لکھا ہے گو تری قسمت میں شوکت چشمِ تر رکھنا
مگر ظالم! کسی کی آبرو پر بھی نظر رکھنا

نہ بھولے گا نہ بھولے گا، قیامت تک نہ بھولے گا
کسی کا وہ محبت سے مرے سینہ پہ سر رکھنا

نہ اٹھے گا دلِ نازک سے صدمہ رنجِ فرقت کا
الٰہی میرے دردِ دل سے ان کو بے خبر رکھنا

وہ کیا جانے بھلا ہوتی ہیں کیسی عیش کی راتیں
میسر ہو نہ جس کو تا سحر تکیہ پہ سر رکھنا

دلِ بے آرزو کافی ہے ہم حسرت نصیبوں کو
مبارک ہو صدف کو اپنی مٹھی میں گہر رکھنا

نہ ہو کس طرح شرطِ دلبری دنیا میں دلداری
جہاں میں گھر بنانا سہل ہے مشکل ہے گھر رکھنا

پیچ

مضطر خیر آبادی

دمِ خواب راحت بلا لیا انہوں نے تو دردِ نہاں کی کہانی کہوں گا
مرا حال کہنے کے قابل نہیں ہے اگر مل گئے تو زبانی کہوں گا

لبِ جوئے الفت رواں ہے دعوئی یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر روحِ شیریں ادھر آ، ترے کوہکن کی کہانی کہوں گا

خضر! تیرے چشمہ کا پانی ہے اچھا، مگر میں اسے موجِ فانی کہوں گا
محبت کا مارا ہوا دل جلا دے میں تب تیرے پانی کو پانی کہوں گا

تری ذات واحد ہے بیدا بطلق، تجھے تو کبھی نیند آتی نہیں ہے
تری آنکھ لگنے کی حسرت میں یارب! کہاں تک میں قصے کہانی کہوں گا

وہ اک آئنہ جس میں منہ دیکھتے ہیں کسی ایک کا وقفِ صورت نہیں ہے
یہیں سے میں پردہ اٹھا کر دوئی کا، میں وحدت کو کثرت کا بانی کہوں گا

یہ ہستی کا شیشہ جو تو نے دیا ہے ذرا اس پہ چاہت کی صیقل تو کر لو
یہ ہو جائے پھر اپنی ہستی کو میں بھی، تری ذات کا نقشِ ثانی کہوں گا

ازل ہی میں تجھ پر نظر پڑ چکی ہے نہ کر مجھ سے انکارِ جلوہ نمائی!
تجلی تری کوئی روشنی ہے مگر میں تو اس کو پرانی کہوں گا

محبت میں انکارِ جلوہ نمائی ذرا اس طریقے کو تو یاد رکھنا
اگر میں کبھی تیرے جلوے پہ پہنچا، تو میں بھی یونہی لن ترانی کہوں گا

میں کیا بے وفا ہوں جو محشر میں مضطر خدا سے کروں شکوۂ قتل اپنا
زمانہ کہے خونِ ناحق بہایا، اگر مجھ سے پوچھا تو پانی کہوں گا!

غرورِ الفت کی طرزِ نازش عجب کرشمے دکھا رہی ہے
ہماری روٹھی ہوئی نظر کو تری تجلی منا رہی ہے

وہ طور والی تری تجلی، غضب کی گرمی دکھا رہی ہے
وہاں تو پتھر جلا دیے تھے یہاں کلیجہ جلا رہی ہے

مرے نشیمن میں شانِ قدرت کے سارے اسباب ہیں مہیا
ہوا صفائی پہ ہے مقرر، چراغ بجلی جلا رہی ہے

نہ اس کے دامن سے میں ہی الجھا، نہ میرے دامن سے یہ ہی الجھی
ہوا نے میرا بگاڑ کیا ہے جو شمعِ تربت بجھا رہی ہے

فرشتے آئے اگر لحد میں، تو صاف کہہ دوں گا راستہ لو!
جب اس کی چاہت میں جان دے دی تو بات کہنے کو کیا رہی ہے

جمالِ قدرت مجھی کو دے دے کہ میں کلیجے کی چوٹ سینکوں
کلیم کے گھر میں رکھے رکھے وہ آگ اب کیا بنا رہی ہے

شبلی نعمانی

تیس دن کیلئے ترکِ مے و ساقی کرلوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد! تری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں

اے نکیرین! قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کرلوں

کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یک سو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں

دل ہی ملتا نہیں سفلی سے، وگرنہ شبلی
خوب گذرے فلکِ دوں سے جو یاری کرلوں

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر جو آنا، تو دبے پاؤں ذرا
بختِ خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوزِ دروں
آبلے ہم سخنِ خار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پہ یاد رہے
سبزہ بیگانہ ہے، دوچار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبیٔ بزم
بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جانے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے!

حسنؔ بریلوی

○

حسن جب مقتل کی جانب تیغِ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

خونِ ناحق کی حیا بولی، ذرا منہ ڈھانک لو
ناز جب ان کو سرِ خاکِ شہیداں لے چلا

خاک عاشق روکنے کو دُور تک لپٹی گئی
جب سمندِ ناز کو وہ گرم جولاں لے چلا

جب چلی مقتل سے قاتل کی سواری رات کو
آگے آگے مشعلیں خونِ شہیداں لے چلا

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے مَیں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہِ واپسیں
اُس کس کے دید کی بیمارِ ہجراں لے چلا

نازِ آزادیِ حسنؔ وجہِ اسیری ہو گیا!
مو کشاں دل کو خیالِ زلفِ پیچاں لے چلا

○

جلوے ترے جو رونقِ بازار ہو گئے
خوبانِ خود فروش خریدار ہو گئے

تلووں سے راستہ چمن دلکشا بنا!
جلووں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے

دل جاں بلب، جگر میں تپک جان بیقرار
ہم تیرا نام لے کے گنہگار ہو گئے!

گلزارِ بہار یُونہی حُسنِ یار سے
جیسے چمن، بہار سے گلزار ہو گئے

یہ حُسن خود فروش عجب جنس ہے حسنؔ
وہ بک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

نسیم

[illegible] حسین بھرتپوری

غیر کے گھر ہیں وہ مہمان بڑی مشکل ہے
جان جانے کے ہیں سامان بڑی مشکل ہے

کہتے ہیں آپ ہیں جس بات کے طالب ہم سے
ہے وہی غیر کو ارمان بڑی مشکل ہے

اُس نے لی جان ہزاروں کو یہ دم دے دے کر
مجھ پہ مرنا نہیں آسان، بڑی مشکل ہے

روز کہتے ہو کہ نرگس کے لئے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان، بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بُتِ بدخُو سے نسیم
ضد نہ کر، دیکھ مری جان، بڑی مشکل ہے

اُن کے پیکان پہ پیکان چلے آتے ہیں
دل میں گھر کرنے کو مہمان چلے آتے ہیں

دیکھ کر آئے ہیں کیا عارض و گیسوان کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

چارا گل کا وہ پرچہ نہیں لکھتے مجھ کو
پاس اغیار کے [illegible] چلے آتے ہیں

بزمِ اغیار میں کس شخص نے گستاخی کی
کہ وہ خاموش پشیمان چلے آتے ہیں!

بیخود دہلوی

○

شمعِ مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لیے
کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

○

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے
کہا پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا
یہ مرجانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب ان کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اسکو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

پنڈت امرناتھ ساحرؔ

○

جلا ہے کس قدر دلِ ذوق کاوش ہائے مژگاں پہ
کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے، ایک اک رگِ جاں پہ

پڑا ہوگا مگر عکسِ عذارِ لالہ گوں، ورنہ
یہ گستاخی! ہمارا خون اور قاتل کے داماں پہ

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے اور خوشی پیچھے
مدارِ صبحِ روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پہ

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اُس نے آخر میرے عصیاں پہ

اگر اُن کے تغافل کو ہے دعویٰ اپنی تمکیں کا
ہماری خود فراموشی کو ہے ناز اپنے نسیاں پہ

○

رُسوائے عشق ہے ترا شیدا کہیں جسے
عشاق میں مثال ہے رُسوا کہیں جسے

سینہ چمن ہے، غنچۂ دل ہے شگفتہ دل
تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے

غم پُر دریغ ہے دلِ شوریدگانِ عشق!
فرقت کی ایک رات ہے دُنیا کہیں جسے

منسوب کفر دیر سے، ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

ہم غیر معتبر سہی اور غیر معتبر
کہنا بجا ہے آپ کا، جیسا کہیں جسے

ساحرؔ نفس وہ دام ہے، جس میں کہ ہے اسیر
موجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

سائلؔ دہلوی

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو

تمہیں رنگ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی، کہو تو
پلائے کوئی ساقیِ مہ وش پیکر، مصفا، کشیدہ، پرانی، کہو تو

تمنائے دیدار ہے حسرتِ دل کہ تم جلوہ فرما ہو آنکھیں سیکوں
نہ کہہ دینا موسیٰ سے جیسے کہا تھا، مری عرض پر لن ترانی، کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کردوں ابھی مایۂ زندگانی، کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبطِ دردِ نہاں کا ہے کہنا
پھر اس پہ یہ تاکید بھی ہے برابر، نہ کہنا پرائی کہانی، کہو تو

سنے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اس کے معانی کہو تو

○

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شبِ وعدہ وہ آ جائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوا لیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے لکھا تھا، ہم پھر عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمرہ ہے اب سمجھے کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ خود آئیں، نہ بلوائیں، شکایت کیوں نہ لکھ بھیجوں
عنایت کی نظر مجھ پر تو کم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تم آؤ مرگِ شادی ہے، نہ آؤ مرگِ ناکامی
نظر میں اب رہِ ملکِ عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پہ بھی ٹوٹا ہے تمہارے پاؤں بھی چومے
غرض پیرِ فلک کی پشت خم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے، یہ مے خانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری سادگی آرائشِ زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

آغا شاعر

چلے گا نہیں مجھ پہ فقرہ تمہارا
ہٹاؤ! کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا

منائیں تو اب جان دے کر منائیں
قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا

بچا ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو
ہمیں دے دو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا

یہ کیا ہے سبب آج چپ چپ ہو پیارے
بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا؟

اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا

خدا کے لئے ہاں، نہیں کچھ تو کہہ دو
کہ منہ تک رہی ہے تمنا تمہارا!

علاج اس کے بیمار کا تم کرو گے؟
کہیں دل چلا ہے مسیحا، تمہارا

چلا شاعرِ زار تسلیم لیجے!
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

شکایت کس سے کیجے، ہائے! کیا الٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے، محبت یار نے کم کی

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

نہیں ملتے نہ ملیے۔ خیر! کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے! پہلے محبت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

مزا اس میں ہی ملتا ہے، نمک چھڑکو، نمک چھڑکو
قسم لے لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہاں جانا ہے؟ تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو، خدا رکھے، نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا، کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان، او مطرب! سنا دے کوئی موسم کی

محمد علی جوہر

○

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی توغیر منایاکر
ملتی نہیں یُوں جوہر اس دیس کی برساتیں

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزُو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدّعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہُو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جُرمِ تمنّا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دِلؔ شاہجہانپوری

○

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دِل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہیے اب آلِ محبت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

○

کوچہ گردی میں جوانی جائے گی
خاک ہو کر زندگانی جائے گی

مٹ نہیں سکتا ہمارے دِل کا داغ
قبر میں بھی یہ نشانی جائے گی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار
سچ کہوں گا، جھوٹ جانی جائے گی

حضرتِ دِلؔ جب بڑھاپا آئے گا
خیر مقدم کو جوانی جائے گی

شاہ بیدم وارثی

○

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تم جو چاہو، تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے

او نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم!
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خواب پریشاں ہو جائے

سینۂ شبلی و منصور تو پھونکا تو نے
اس طرف بھی کرم اے جنبشِ داماں ہو جائے

آخری سانس بنے زمزمۂ ہو اپنا
سازِ مضرابِ فنا تارِ رگِ جاں ہو جائے

تو جو اسرارِ حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدم رسن و دار کا ساماں ہو جائے

○

مجھے شکوہ نہیں: برباد رکھ! برباد رہنے دے
مگر للہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

مرے ناشاد رہنے سے اگر تجھ کو مسرت ہے
تو میں ناشاد ہی اچھا، مجھے ناشاد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو بربادِ تمنا ہو، اسے برباد رہنے دے

نہ صحرا میں بہلتا ہے نہ کوئے یار میں ٹھہرے
کہیں تو چین سے مجھ کو دلِ ناشاد رہنے دے

کچھ اپنی گذری ہی بیدم بھلی معلوم ہوتی ہے
مری بیتی سنا دے قصۂ فرہاد رہنے دے!

وحشت کلکتوی

ہوئے ہیں گم جس کی جستجو میں اسی کی ہم جستجو کرینگے
رکھا ہے محروم جس نے ہم کو اسی کی ہم آرزو کرینگے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوئے نشوونما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہشِ رنگ و بو کرینگے

حکایتِ آرزو ہے نازک زبان کیا خاک کہہ سکیگی
لبِ خموش و نگاہِ حسرت سے دل کی ہم گفتگو کریں گے

جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو اُن سے تھی چشم رازداری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کرینگے

ابھی تو گم کردہ راہ خود ہیں ہے محبت کی بیخودی میں
اگر کبھی آپ میں ہم آئے تو اسکی بھی جستجو کریں گے

اس انجمن میں کہ چشمِ ساقی کفیل ہو عیشِ زندگی کی
وہ بادہ خواری میں خام ہونگے جو فکرِ جام و سبو کرینگے

طہارتِ ظاہری سے حاصل نہ ہو سکے گی صفائے باطن
بہا کے ہم خونِ توبہ وحشت اسی سے اک دن وضو کرینگے

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
غرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکرِ چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تلک آخر دلِ دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کیلئے زلف کا سودا نہ کریں

میں نے بے ہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرتِ دل کا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشت
کہ اُن آنکھوں سے مروت کا تقاضا نہ کریں

آسی الدنی

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرہ میں تھی
آشیانہ ہی مرا صورت نمائے دام تھا

واہمہ خلاق اور آزادی کا حُسن افزا سرور
ہر فریبِ رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

ضعف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل!
تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا

دیدۂ خوں نابہ افشاں میر اُن کے سامنے
بے خودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اُس کو سُناتے ہیں
مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں

بُجھا دے اے ہوائے تُند! مدفن کے چراغوں کو
سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبہ لگاتے ہیں

مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دُنیا میں
وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ بتاتے ہیں

اسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی
اشارے میں جہاں لاکھوں مقدر بدلے جاتے ہیں

تاجور نجیب آبادی

○

حسنِ شوخِ چشم میں نام کو وفا نہیں — درد آفریں نظر درد آشنا نہیں
ننگِ عاشقی ہے وہ ننگِ زندگی ہے وہ — جس کے دل کا آئنہ تیرا آئنا نہیں
آہ اس کی بیکسی تو نہ جس کے ساتھ ہو — ہائے اس کی بندگی جس کا تو خدا نہیں
حیف وہ الم نصیب جس کا درد تو نہ ہو — اف وہ دردِ زندگی جس کی تو دوا نہیں
دوست یا عزیز ہیں خود فریبیوں کے نام — آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں
جانتا ہوں میں کہ تو اہلِ دل کے ساتھ ہے — دل ہے جو خدا کی یاد دل بھی آشنا نہیں
اپنے حسن کو ذرا تو مری نظر سے دیکھ — دورِ شش جہات میں کچھ ترے سوا نہیں

بے وفا خدا سے دولتِ وفا نہ دے
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں بے وفا نہیں

○

محبت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری حسابِ دوستانِ دل نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

یہ مستانی نظر، یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
کسی پر بے بسی اے ساقیِ محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

صفی لکھنوی

○

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

پاؤں نکالو خلوت سے، آئے جو قیامت آنے دو
سارے سر آپس میں ٹکرائیں اگر، ٹکرانے دو

مہر منور جام طلائی، ماہ کٹورا چاندی کا
چرخ کے مخانے میں یہی ہیں، گردش میں پیمانے دو

دورِ بہارِ حسن تو ہو، پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کوکے گی باغوں میں کوئل، بور آموں میں آنے دو

بادل گرجا، بجلی چمکی، روئی شبنم، پھول ہنسے
مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دہرانے دو

ہاتھ میں ہے آئینہ و شانہ پھر بھی شکن پیشانی پر
موجِ صبا سے تم تو نہ بگڑو زلفوں کو بل کھانے دو

کثرت سے جب نام و نشاں ہے کیا ہوں گے گمنام صفی
نقشِ دلوں پر نام ہے اپنا، نقشِ لحد مٹ جانے دو

○

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو الجھن پہ الجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ ان کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے، جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رخ آئینۂ بے تابیٔ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیونکر غم زدوں کا دم نکلتا ہے

نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دل جوئی
مگر اک پہلوئے بے تابیٔ شبنم نکلتا ہے

صفی کشتہ ہوں ناپرسانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

ثاقب لکھنوی

○

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

○

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دُعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئنہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حُسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقبؔ گھٹ رہا ہے وہ دُھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

ناطق گلاؤٹھوی

○

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اُٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اس کا نام ہے کیف سرور
آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے!

یاس سے ہو کر جدا، جورِ فلک کا غم نہیں
ہو چکی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب بُرے دن کٹ گئے
زندگی تو نے کہاں آ کر دیا دھوکا مجھے!

○

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج! کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے سِل کے؟

مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
مِل رہے ہیں نشان منزل کے

چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
اُٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دل کے

عزیز لکھنوی

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اُف مرے اُجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو
جس کے ہر ذرّہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں
میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ ساماں سے ساماں ہونا

ہوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

رخ ذرا دے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ!
چاہیئے تھا انہیں پیوست رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

میں کروں ضبط ادھر ان کو پسینہ آئے
چاہیئے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

یہ مشورہ بہم اُٹھے ہیں چارہ جُو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رُو کرتے

زباں رُک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی!
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئے ہیں، ورنہ
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر!
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے!

اگر کہیں وُہ دمِ واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیلِ آرزو کرتے

تمام رُوح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں ہول کیوں ہے عزیز
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے!

جلیل مانک پوری

○

کھو کے دل میرا تمہیں ناحق پشیمانی ہوئی ؛
تم سے نادانی ہوئی یا مجھ سے نادانی ہوئی ؛

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجوم حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا! میں اور کیا دوں قبر مجنوں کیلئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغ ناز!
تیری قربانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی !

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
چاک دامانی سے اپنی چاک دامانی ہوئی

باڑھ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیل!
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

○

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا ؛
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

نوحؔ ناروی

○

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہوگا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہوگا

ہمارا اور ان کا سامنا محشر میں جب ہوگا
وہ جلسہ وہ سماں وہ معرکہ بھی کچھ عجب ہوگا

کوئی زندہ رہے دنیا میں کیا اگلی امیدوں پر
ابھی تو ہجر کا رونا ہے ہوگا وصل جب ہوگا

لڑکپن جا چکا ان کا جوانی آنے والی ہے
کبھی مجھ پر جفا ہوتی تھی لیکن قہر اب ہوگا

تمہارے وصل کی ساعت ہمیشہ ٹلتی رہتی ہے
خدا جانے کہاں ہوگا، کسے معلوم کب ہوگا؟

ابھی لذت نہیں اس کو ملی آزارِ پنہاں کی
جو ہوگا بھی تو ہوتے ہوتے دل ایذا طلب ہوگا

وہ اپنے وعدۂ دیدار سے پھرنے کو پھر جائیں
مگر یہ تو سمجھ لیں بے وفا کس کا لقب ہوگا

مجھے اظہارِ الفت پر یہ ان سے داد ملتی ہے
تمہارا عشق اک دن میری ذلت کا سبب ہوگا

بھری محفل میں ان کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی
جناب نوحؔ تم سا بھی نہ کوئی بے ادب ہوگا

○

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر جو اُف نہیں کرتے
ان کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوحؔ کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

ظفر تاباں

○

عمرِ ابد کا ماحصل، عشق کا دورِ ناتمام
ہائے وہ مستیٔ سحر، ہائے وہ بیخودیٔ شام

پہلے مآل سوچ لیں ہمسفرانِ سست گام!
میری سرشت میں نہیں خواہشِ منزل و مقام

طائرِ خستہ بال کو دام بھی کنجِ آشیاں!
مُرغِ چمن نورد کو، گوشۂ آشیاں بھی دام

اب بھی خدا پرست ہے دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہِ نارسا، ہائے مذاقِ ناتمام

کیفِ نظر کی مستیاں اہلِ نظر سے پُوچھیے
جیسے کوئی پلا گیا بادۂ مشک بُو کے جام

خوبی و شانِ دلبری، غمزہ و ناز ہی نہیں
حُسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی نام

○

یاد میں تیری دو عالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے، نہ جانا ہے ہمیں

کہتے ہیں: عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبت کو نبھانا ہے ہمیں

خلشِ عشق سے بیچین ہے دل ایک طرف
اس پہ یارب! غمِ ہستی بھی اُٹھانا ہے ہمیں

ہائے وہ آگ! جو مشکل سے جلی تھی دل میں
آج اس آگ کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں

رخصتِ عرضِ تمنا نہیں ملتی، نہ سہی
قصۂ شوق نگاہوں سے سُنانا ہے ہمیں!

آپ کانٹوں سے بچتے ہوئے چلتے ہیں، چلیں
دامنِ شوق کو پھولوں سے بچانا ہے ہمیں

ہائے! اس شرمِ محبت کا بُرا ہو تاباں
عشق کا راز خود اُن سے بھی چھپانا ہے ہمیں

عندلیب شادانی

○

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے وہ کیوں ہم کو یاد آئے
کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اُٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے
اک دلنشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے
کچھ ہم سے بیخودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے
ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے
وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اس کی یاد غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے
کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم!
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے
یہ ہو گا دل میں وہ عالم، دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لَو جیسے تھرتھرائے
تم تو ہمیں کو کہتے تھے یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو! کنول کے پھول سے شبنم چھلک نہ جائے
اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

○

جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے
عذابِ جاودانی زندگی ہے
رلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اک راز میری زندگی ہے
خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے
ہلاک انجام ہمیں تمنا!
بقائے آرزو ہی زندگی ہے
جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے
وہ چاہے جس قدر بھی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے
امیدیں مر چکیں، میں جی رہا ہوں
عجب بے اختیاری زندگی ہے
جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے
گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے
محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو آہ! کیسی زندگی ہے

علی اختر

○

زندگی کیا ہے جو دل ہو تشنۂ ذوقِ وفا
یعنی یہ پردہ تو اٹھ سکتا ہے آزادی کیساتھ

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کھینچتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کیساتھ

تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کیساتھ

دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

○

حریمِ کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

تلوک چند محرومؔ

بس کا بلا نہیں کہ دُعا بے اثر گئی
اِک آہ کی تھی، وُہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس، نہ پُوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اِس زندگی سے ہم کو نہ دُنیا ملی، نہ دِیں
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ حسنِ گل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں، جہاں تک نظر گئی

ہر موج آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محرومؔ جب وطن میں ہماری خبر گئی

کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے
پھر ترا آستاں ملے نہ ملے

اب قفس ہی کو آشیاں کہیے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

دل سے کہتے ہیں متوسے دن رات
ہم سخن، ہم زباں ملے نہ ملے

محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر
فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے

عَلَمِ آہ سر بلند ہے آج
کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے

تُو تو بیتاب ہے مگر اے دل
ہو کے وہ مہرباں ملے نہ ملے

یہ غزل جوشؔ[1] کو سُنا محرومؔ
پھر کوئی نکتہ داں ملے نہ ملے

[1] جناب جوشؔ ملیح آبادی

آرزو

سراج الدین علی خان

○

سنا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو

دل اپنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس تُند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی جانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
بادِ صبا یہ کہنا اس دلربا پری کو

اب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

آزردہ

مفتی صدرالدین

○

یہ کہہ کے رخنہ ڈالئے ان کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خوابِ مرگ ہو
آئے وہ مستِ خواب اگر میرے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں، قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی! لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشہ، یہ سامانِ صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق، ہے آزردہ جائے شرم!
حضرت یہ باتیں پھبتی تھیں عہدِ شباب میں

آشفتہ

بھورے خان

○

جام گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں

مدت سے ہے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو باہمن پوتھی اپنی لیے دن میرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و فراست سلب ہوئے سب پائے جنوں سے وائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

یوں کاندھے پر زلف اس کی بل کھاتی ہیں وقت خرام
مار سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

آشفتہ

مرزا رضا قلی

○

یہ جوش غم ہے کہ سینہ میں خون ابلتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے، جلتا ہے

نہ پوچھو دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ
اسے وہ غم جو لگا ہے اسی میں گلتا ہے

یہ ہم کو اس کی جوانی نے اور ایذا دی
کہ رات دن کوئی سینے میں دل کو ملتا ہے

کسی کے کان کا دُر دیکھا تو نے آشفتہ
جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے

آصف

آصف الدولہ بہادر

○

بس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
ایسے گذرے کہ جسم و جاں سے گئے

ق

ایک دن میں نے یار سے یہ کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سُن لے اے آصف
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے

آفتاب

شاہ عالم بادشاہ دہلی

○

بعد مجنوں کیوں نہ ہوں میں کارفرمائے جنوں
عشق کی سرکار سے منصبِ رسوائی ملا

خوب سایہ ڈھلنے کا دیکھ اے سروِ چمن
اس کی رعنائی سے مت تو اپنی زیبائی ملا

جل گیا پروانہ جس دم محفل آرائی کے ساتھ
خاک میں سب شمع نے دی محفل آرائی ملا

طالعِ بیدار کی منت اٹھانے بھی نہ دی
اس سے شب ہم کو تمنا خواب میں لائی ملا

اپنی قسمت میں ازل سے تھی لکھی سرگشتگی!
گرد و باد آسا جو کارِ دشت پیمائی ملا

واہ وا! رحمت ہے اس کو اور مجھ کو آفریں
راہ میں بن کر عصا جو خارِ صحرائی ملا

دستگیری بھی نہ کی تو نے کہ جوں نقشِ قدم!
خاک میں میں تیری خاطر اے توانائی ملا

سرکشی اے چرخ مت کر دیکھ پیشِ آفتاب
خاک میں دے گا یہ ساری تیری خودرائی ملا!

اختر

نواب واجد علی شاہ

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

زاہدِ دیر میں ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

رخِ انور سے میں حیراں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کبھی سے زلف! پریشاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

ظلم و جور لئے شبِ ہجراں! نہ ہوا تھا، سو ہوا
خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

چشمِ انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا، سو ہوا
دلِ اختر چمنستاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

اثر

نواب سید امداد امام

سنا حالِ دل، پہ کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سنا کچھ نہیں

نہ گل پر ہے جوبن، نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بہ امیدِ حور
مگر تجھ کو [illegible] حیا کچھ نہیں

خدا ان سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پوچھیے
جفا ہی جفا ہے، وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

ارشد

میرزا عبدالغنی گورگانی

○

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے رُوئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی!
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف، اور اپنی وفا کی داد یا قسمت!
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منت صبح کل کا جب سے اے ارشد
یقین دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

اسد

میر امانی

○

پی کر شراب، دُردِ تہِ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

آیا جو مے کشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا

کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ
سب عشق کا وہ ہم کو سر انجام دے گیا

کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تو اسد
آیا ہے جب وہ یاں تو اک الزام دے گیا

افسوس

میر شیر علی

سمندِ گرم پویاں اس سوار کا پہنچا
غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا

تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بےچینی
مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا

کٹے ہے پاؤں سے اپنے وہ لالہ رُو ہر دم
یہ مرتبہ تو دلِ داغدار کا پہنچا

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے
چھلنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

اشتیاق

ولی اللہ سرہندی

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ
ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو رو کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام
بیاں کروں میں اگر تیری بے وفائی کا

نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنہیں در کی ترے گدائی کا

خیالِ یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہ سائی کا

الم

صاحب میر

○

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگام فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تا رگِ گُل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نامِ خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
مر جائیں صنوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر!

مندیل کا تو پیچ اُٹھا بیٹھے گا اے شیخ
چھٹ جائیکے نہ کچھ پاؤ گا ندو سے جکڑ کر

آجاتا ہے دُکھ درد بھلانے کو الم یاں
کیا اس سے مزا تم ہو اُٹھاتے بھلا لڑ کر

امانت لکھنوی

○

شبِ فرقت میں نالوں نے جہاں سر پہ اُٹھایا ہے
زمیں کو زلزلہ ہے آسماں چکر میں آیا ہے

حسابِ آب و دانہ حشر میں ہوگا، تو کہہ دوں گا
پیا ہے عُمر بھر خونِ جگر، غم میں نے کھایا ہے

شفق پھُولی ہے دیکھو شام کو شہرِ بدخشاں میں
لبِ رنگیں پہ مِسّی مل کے اُس نے پان کھایا ہے

مری تربت پہ تانا چاندنی میں کیوں ہے نگیرہ
یہ کس نے چادرِ مہتاب میں دھبہ لگایا ہے!

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تُو اے امانت یاد آیا ہے!

آمانی

میر امانی

○

اس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا
کون ساداں سے خاکسار اُٹھا

عندلیبو! بسا لو اب صحرا
باغ سے موسم بہار اُٹھا

ہچکیاں لے گلابیاں روئیں
بزم سے جب یہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اس کا
میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا

نہیں جو قدرِ اشک عالم سے
موتیوں کا مگر وقار اُٹھا

شمع سے سوز آمانی پوچھا ترا
اک دھواں اس کے دل سے یار اُٹھا

امید

قزلباش خان

○

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

دل ہمارا اسے کرتا ہے رات
غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے

دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
ایسی حالت ہوئی کب صحبت ہے

دہر میں پاسِ نفس لازم ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار!
آج امید کڈھب صحبت ہے

امیر

نواب محمد یار خان

○

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
لہو اُترا ہے تری آنکھوں میں تو خونخواری سے

وقتِ رُخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن
تھام تھام آج دکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا ہو تمہارے، اسے چاہو سو کرو
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مل ڈالا
نرگس آج آنکھ اُٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر
گھر میں جاتے ہیں پہ پائے تو خبرداری سے

امین

خواجہ امین الدین

○

جس کا دل آپ نے لیا ہو گا
خاک میں لے ملا دیا ہو گا!

ہم کو کیا گر بہار آتی ہے
دل وُہ غنچہ نہیں کہ وا ہو گا

گالیاں غیر سے سُناتے ہو!
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہو گا

ل گیا ہو گا خاک میں جوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہو گا

انجام

علامۃ الملک امیر خان

○

تک تو دے فرصت کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے ہیں گو سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر، مانند شرر، جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت
شکر ہے! تڑپے نہ زیر خنجر فولاد ہم

انیس لکھنوی

○

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بھلا تردد بیجا سے ان میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

سحر

شیخ امداد علی

آنکھ کھلتے ہی میسر ہوا دیدارِ قفس
موئے مژگاں مری قسمت سے ہوئے تارِ قفس

ہم اسیروں کے اگر تیرِ نظر کاری ہیں
ہو گی دیوارِ چمن صورتِ دیوارِ قفس

کیسے دیتی ہے بنائے قفسِ تابوتی
مر گئے پر بھی نہ چھوٹیں گے گرفتارِ قفس

ہم صفیرو! کوئی کیا جانے اسیری کا مزا
میں چمن بیچ کے ہوتا ہوں خریدارِ قفس

رو بصحت ہوئے زنداں سے جو مر کر نکلے
گور ہیں نقل مکاں کرتے ہیں بیمارِ قفس

برق لکھنوی

کیا گیا ہوا نہ دامنِ دولت سے چھوٹ کر
مر گیا فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

آنکھیں ترس رہی ہیں زیارت کے واسطے
دم بند ہے حضور کی خدمت سے چھوٹ کر

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

آخر تڑپ تڑپ کے گئی جانِ مضطرب
ہرگز نہ ہم بچے کسی صورت سے چھوٹ کر

کیا برق منہ دکھاؤں کہ آتی ہے مجھ کو شرم
زندہ میں ہوں فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

بسمل

سید امین الحسن موہانی

○

پہلے سے دیکھنا کہیں بہتر بنائیں گے
اب اپنا ایک اور مقدر بنائیں گے

بگڑے ہوئے ہیں ضد پہ ہیں کون ان سے کیا کہے
اس وقت بات بات کے دفتر بنائیں گے

دیکھیں گے اپنے دل کے تحمل کی کیفیت
ہم ان کو آذر چھیڑ کے خود سر بنائیں گے

آنے تو دو بہار کا موسم، جنوں کے دن
اپنے لئے ہم آپ ہی نشتر بنائیں گے

بسمل چلیں گے آج در یار تک ضرور
پژمردہ دل کو تیرے گُل تر بنائیں گے

بقا

شیخ بقاء اللہ

○

رہرواں کہتے ہیں جس کو، جرس محمل ہے
محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے

موج سے بیش نہیں ہستیٔ دہر کی نمود
صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے

کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی
بہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں
یا علیؑ تم کو یہ آساں ہے اسے مشکل ہے

بہار

گلشن الدولہ

اٹھو گلے سے لپٹ جاؤ، پھر نکھر لینا
تمام رات پڑی ہے بناؤ کر لینا

یہ تو تمنا، یہ مرا درد، یاد کر لینا
کبھی کبھی تو کلیجہ پہ ہاتھ دھر لینا

ہمارے ساتھ ہے تیرا بھی امتحاں اے تیر!
تڑپ کے دل جو نکل جائے، تو جگر لینا

ڈرے تو کٹ نہ سکے گا کبھی گلا میرا
یہی خوشی ہو تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

گناہگار ہے یارب نزولِ رحمت کر
خزانہ جو خالی ہو مجھ سے بھر لینا

بہار روز یہ کم بخت منہ کو آتا ہے
کدھر چلا ہے مرا دل، ذرا خبر لینا

بیباک

سید حسین احمد شاہجہانپوری

ہر ایک سانس ہے تیغِ نگاہِ یار مجھے
دیا ہے شوق نے وہ لطفِ انتظار مجھے

ڈرا ہوا ہوں یہ میں زیست سے محبت میں
ہوا نہ مر کے بھی مرنے کا اعتبار مجھے

یہ مدعا ہے کہ ہو ہر بلا کا اس میں گذر
اسی لئے تو دیا ہے دلِ فگار مجھے

کمی وفا میں اگر ہو، تو وہ جفا نہ کرے
صلاح دیتے ہیں کیا کیا صلاح کار مجھے

سکونِ دل کی تمنا، یہ عشق کا دعویٰ
اسی لئے وہ ستاتے ہیں بار بار مجھے

نگاہِ غیر سے دیکھا اسے تو کیا دیکھا
کہ ہے ابھی مرے مرنے کا اعتبار مجھے

یہ امتحان ہے پیرایۂ تغافل میں
ملا دے خاک میں اے آہِ شعلہ بار مجھے

اسی ادا سے کہ "او! میرے ڈھونڈنے والے
کہاں ہے تو؟" یونہی اک بار پھر پکار مجھے

وفائے عہد، دمِ نزع، اے جزاک اللہ
اب آپ جائیے! آ جائے گا قرار مجھے!

سزا ملے نہ ملے جرمِ عشق پر لیکن
وہ جانتے تو ہیں اپنا گناہگار مجھے

عجب لطف ہے باتوں کا دل سے اے بیباک
ملا ہے خوب محبت میں رازدار مجھے

بیتاب عظیم آبادی

○

عقل دوڑائی بہت پھر تو گماں تک پہنچے
کچھ حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے

عشق کے شعلے بھڑک کر رگِ جاں تک پہنچے
آگ سی آگ ہے یہ آگ جہاں تک پہنچے

لڑ گئی ان سے نظر کھچ گئے ابرو اُن کے
معرکے عشق کے اب تیر و کماں تک پہنچے

دل سے باہر ہو ترا راز گوارا ہے کسے
یہ کوئی بات نہیں ہے کہ زباں تک پہنچے

ملتفت ہو نگہ ناز تو رتبہ ہو بلند
سر ہو اُونچا مرا گر نوکِ سناں تک پہنچے

کوئی دیوانگیٔ عشق کا قصہ چھیڑے
سلسلہ اس کا خدا جانے کہاں تک پہنچے

سرخیٔ خارِ بیاباں یہ پتہ دیتی ہے
کہ ادھر سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

رندِ پرکیف بہ یک گردشِ چشمِ ساقی
غایتِ دائرۂ کون و مکاں تک پہنچے

رُخ سے پردہ کو ہٹا حسنِ یقیں تک پہنچا
آخر انساں ہوں یوں عقل کہاں تک پہنچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے چلتے
پوچھتے پوچھتے ہم اُن کے مکاں تک پہنچے

شربتِ دید نہ ہو تیغ کا پانی ہی سہی
کوئی ٹھنڈک تو مرے قلبِ تپاں تک پہنچے

لے گئے عشق کی بازی بہ صفائی بیتاب
جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہنچے

تجلّی

میاں حاجی

○

طرب کا رنگ، رُخِ گل پہ آشکار آیا
کلی سی کھل گئی جوں ہی وہ گلعذار آیا

تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیاد
نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا

ملا میں خاک میں مر مر کے، آہ! پر تو بھی
نہ بے قراریٔ دل کے تئیں قرار آیا

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

ثاقب

نواب شہاب الدین خان

ہم قوتِ جذبِ دل دکھائیں
اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا تیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

اے بخت کہاں تک بُرائی
اے چرخ! کہاں تک جفائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں
وہ شوق سے غضب آزمائیں

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں

شاید کہ ہے گرم نالہ ثاقب
چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

جوآں

مرزا نعیم بیگ

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سجھائیاں ہیں

اے عندلیب! سچ کہہ، کیا فصلِ گُل پھر آئی
فوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں

کس بے ادب سے تم سے گُل بازی آج کی ہے
منہ پر تمہارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں

دیوار و در کی چھاتی سوراخ ہو گئی ہے
کیا روزنوں سے اس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

پیوستہ ابرو اس کی ہیں دیکھ کر یہ سمجھا
دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

جوشش

شیخ محمد روشن

○

یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا
ہے کوئی جسے تیرا طلبگار نہ دیکھا

سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے
پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا

کل بزم میں سب پر نگہِ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشمِ بُتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

حزیں

میر محمد باقر

○

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گُل پیرہن باعث
کہ ہووے بُلبلوں کی خوش صفیری کا چمن باعث

کوئی ہوتا ہے سنگِ سینۂ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپی کوہ کن باعث

جو ہوتا ہے کسی سے اُنس سب سے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

حزیں ان شعلہ رُخساروں سے جی کو مت لگا ہرگز
ہوئی آخر کو پروانے کے جلنے کی لگن باعث

حسامیؒ

مرزا حسام الدین حیدر

○

کئی ایک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

اے شہر دلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن (۱)
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ علایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب روز پھولوں میں جو تُلیں وہ یوں خار غم سے فگار ہوں
بے طوق قید میں جب انہیں کہیں بدلے گُل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اور دیے کرتے تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ زمانہ ہے وہ بُرا فلک، چلو بچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسولؐ کا وہی تیرا حامیٔ کار ہے

حسینؒ

سید صادق علی

○

ایسا بھی نہیں درد کے مارے نہیں دیکھے
ہم نے گل و بلبل کے اشارے نہیں دیکھے

جب میں نے کہا مرتا ہوں منہ پھیر کے بولے
سنتے تو ہیں پر عشق کے مارے نہیں دیکھے

ہر سمت پھرے خاک اُڑایا کیے برسوں
پر نقشِ قدم ہم نے تمہارے نہیں دیکھے

پوشیدہ ہیں کس حد میں مری خاک کے ذرّے
پتھر میں بھی اس طرح شرارے نہیں دیکھے

تُربت میں مرے بندِ کفن کھول کے بولے
ہم نے دہنِ زخم تمہارے نہیں دیکھے

اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو
ہاں نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصلِ بہاری میں حسین کا
اب تک کسی گل رو کے اشارے نہیں دیکھے

۱؎ یہ اردو کے ان پڑھ شاعر: اردو، اورنگ آباد دکن، جنوری ۱۹۳۱ء

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو، جوہرِ تیغِ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل سُنیں اور وُہ چُپ رہیں
کیا کیا شانِ بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا بھیجا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کفِ پیغامبر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپائے وُہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

رائے سرب سکھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے، ولے
گرمیِ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم، میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

راسخ

خافظ عبد الرحمن

○

کہاں تھے شب؟ ادھر دیکھو! حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

موحد وہ ہوں گر میں سِرِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بت کدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یا رب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمر الدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پر شور نہیں، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی، لذت کشِ آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو، خانۂ خمار نہیں

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو جوہرِ تیغ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل سنیں اور وہ چپ رہیں
کیا کیا نہ شان بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا بھیجا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کفِ پیغامبر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپائے وہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

رائے سرب سکھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے، ولے
گرمیٔ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم، میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکر دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

راسخ

حافظ عبدالرحمٰن

○

کہاں تھے شب؟ ادھر دیکھو! حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

وہ عقدہ ہوں کہ گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بت کدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چُرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمر الدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پر شور نہیں، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی، لذت کشِ آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو، خانۂ خمار نہیں

رخشاں

نواب ضیاء الدین حسان

○

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! بیٹھو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے فصہ نے ایک دم میں کیا
مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہے معنیٔ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع بد سے نیرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

رسا رامپوری

○

ساقی جو دئے جائے یہ کہہ کر کہ پئے جا
تو میں بھی پئے جاؤں یہ کہہ کر کہ دئے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دئے جا
اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کئے جا

کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تو کئے جا
کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لئے جا

کیا لذتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے
آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کئے جا

کم بخت رسا تیری رسائی نہیں ان تک
تو خوب سا اسلام کو بدنام کئے جا

رشک

میر علی اوسط

○

جو رنج نوشتہ میں ہے کیونکر نہ ملے گا
لکھوائیں گے نامہ، تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا

ابرِ شبِ فرقت ہے بندھے آنسوؤں کا تار
اس طرح کا وقت لے قطرۂ تر نہ ملے گا

کاہیدگیٔ جسم اگر یوں ہی رہے گی
ہم کو بھی ہمارا تن لاغر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت
اے اشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

رشکی

نواب محمد علی خان

○

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلانی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

تیرے رونے سے اب مجھے بھی ہے خوف
دیدۂ اشک بار آتا ہے

درد دل کیا بیاں کروں رشکی
اس کو کب اعتبار آتا ہے

زکی

نواب محمد ذکریا خان

○

اسیری میں تباہی رونق کاشانہ ہوجائے
قفس ہی نالوں سے جل کر چراغ خانہ ہوجائے

تغافل، سازگارِ شوقِ اہلِ درد کیسا ہوگا
ادائے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہوجائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار بے معنی بیگانہ ہوجائے

نہیں کیوں حضرت موسیٰ کی بیتابی کے ہم پیرو
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہوجائے

کہاں تک ضبطِ بیتابی دلِ مسکین مجھے ڈر ہے
تری خوئے تحمل سے وہ بے پروا نہ ہوجائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچو اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخیٔ رندانہ ہوجائے

سجّاد

• میر سجّاد اکبر آبادی

○

دل ہوگیا پھپھولا پیارے تمام جل کے
کیا تجھ نہال سے ہوں امیدوار پھل کے

تنہا نہ دل مرے نے زلفوں سے تاب کھایا
گلشن کے بیچ سنبل کھاتا ہے تاب بل کے

ایسے ترے چمکتے دانتوں کو دیکھ پیارے
پانی ہوجائے موتی مارے نہ کیوں کہ جھلکے

کیا جانتا تھا مجھ کو رسوا کریں گے سب میں
یہ طفل اشک میرے آنکھوں کے بیچ پل کے

سحر بھوپالی

[illegible] دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

[illegible] کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

کوہ پہ جانِ کوہکن، دشت میں جانِ قیس لی
ہال بے تری چڑھائیاں اُف رے یہ ترکتازِ عشق

نام و نشاں مٹا چکے شوقِ جفا و ذوقِ جور
جان و جگر جلا چکے سوزِ دل و گدازِ عشق

پردہ میں رہ کے الحذر گوشہ میں چھپ کے الاماں
ہم کو خبر ہے ہو گیا حُسن سے سازبازِ عشق

سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصلِ سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہم نے رہِ درازِ عشق

خاص خدا کا وہ مقام دل میں خدا کے اُس کا گھر
عرش سے کچھ بلند ہے درگہِ بے نیازِ عشق

فرشِ زمیں پہ مصطفٰے عرشِ بریں پہ کبریا
پہنچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

سلیمان

نواب سلیمان شکوہ

ساقیا ! ہے یہ جام کا عالم
جیسے ماہِ تمام کا عالم

کبک رفتار اپنی بھول گئے
دیکھو اس کے خرام کا عالم

اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے
شبِ ہجراں کی شام کا عالم

تجھ پہ ہے ان دنوں میں نام خدا
کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

شاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد

○

بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گرد پھر لے نہ مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے
شکلِ ساغر دُرد یاں نوش ہوں، بادۂ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں نوا سنجِ حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر پیکرِ خاموش ہوں

کس کی فرقت، وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تکویں کا ہم آغوش ہوں

شاد

حکیم سید محمد غازی پوری

○

بلبل کو پھر چمن میں لگا لائی بوئے گل
اے کاش ہوتی گلبدنوں میں بھی خوئے گل

دل داغ داغ اس میں خیالِ خرامِ ناز
جس طرح اڑتی پھرتی ہو گلشن میں بوئے گل

عاشق ہی جب نہیں تو خزاں ہے بہارِ حسن
بلبل کے ساتھ ساتھ گئی آبروئے گل

رازِ محبت اور دلِ غنچہ، تا بہ کے
نکلے گی بو کے پردے میں ہر آرزوئے گل

لو شاد سیرِ گل سے بھی نفرت ہوئی انہیں
سمجھے مگر کہ بوئے محبت ہے بوئے گل

شرر

مولوی عبدالحلیم لکھنوی

○

کیا سہل سمجھے ہو، کہیں دھبا چھٹا نہ ہو
ظالم یہ میرا خون ہے رنگِ حنا نہ ہو

یارب! مجھے ہے داغِ تمنا بہت عزیز
پہلو سے دل جدا ہو، مگر یہ جدا نہ ہو

راہیں نکالتا ہے یہی سوز و ساز کی
پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی حوصلا نہ ہو

تم اور وفا کرو، یہ نہ مانوں گا میں کبھی
اس کو فریب دو، جو نہیں جانتا نہ ہو

کیا کیا شررؔ ذلیل ہوئے، آبرو گئی!
ایسا بھی عاشقی کا کسی کو مزا نہ ہو

شفق عمادپوری

○

دل تڑپ جائے نہ کیوں سن کر فغانِ اہلِ درد
ان سے پوچھو، جو سمجھتے ہیں زبانِ اہلِ درد

ایک سے اک بڑھ کے ہے دلچسپ، دلکش، دلستاں
حالِ دل، افسانۂ غم، داستانِ اہلِ درد

یہ تو کہئے منہ سے اک اُف تک کسی نے کی کبھی؟
لے چکے ہیں آپ اکثر امتحانِ اہلِ درد

ہاتھ دھولے جان سے کوئی، تو جی بھر کر سنے
جاں ستانِ اہلِ دل ہے، داستانِ اہلِ درد

کس کے آگے دردِ دل اپنا کہو گے تم شفقؔ
کوئی دنیا میں نہیں اب قدردانِ اہلِ درد

شوق

شیخ احمد علی قدوائی

○

رُوح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصدِ گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا ، دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ لے ایک بار انہیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھیے کیا گزرتی ہے دُوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وُہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہو
آ کے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر

کعبے کو جا نہ شوق ابھی، نیتِ زندگی بخیر!
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھ کر

وصل سے گذرے اے خُدا : ہاں یہ شگون چاہیے
صُبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

شیدا

مسیح الملک حکیم اجمل خان

○

کچھ بات ہی نہ تھی ایسی کہ تھامے جگر گئے
ہم اور جاتے بزمِ عدو میں، مگر گئے

یہ تو خبر نہیں کہ کہاں اور کدھر گئے
لیکن یہاں سے دُور کچھ اہلِ سفر گئے

ارماں جو ہم نے جمع کیے تھے شباب میں
پیری میں وہ خدا کو خبر ہے کدھر گئے

رتبہ بلند ہے مرے داغوں کا اس قدر
میں [illegible] یہ داغ مرے تا قمر گئے

رخسار پر ہے رنگِ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

دنیا بس اس سے اور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

جانے لگا ہے دل کی طرف ان کا ہاتھ اب
نالے شبِ فراق کے کچھ کام کر گئے

حسرت کا یہ مزا ہے کہ نکلے نہیں کبھی
ارماں نہیں ہیں وُہ کہ شب آئے سحر گئے

بس ایک ذات حضرت شیدا کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے

صبا

لالہ کانجی مل

سحر جب بسترِ راحت سے وہ رشکِ قمر اُٹھا
ندی اس کی ہیں خورشید نے تیغ و سپر اُٹھا

ابھی تھمیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اُٹھا

گلے پہ میرے خنجر پھیرتا وہ اور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اُٹھا

نہیں معلوم اے یارو صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اُٹھا!

صفیر

سید فرزند احمد بلگرامی

شگفتہ ہو کے بیٹھے تھے وہ اپنے بے قراروں میں
تڑپ بجلی کی پیدا ہو گئی پھولوں کے ہاروں میں

کیا اندھیر اپنے رنج نے ان کی کدورت نے
بجھی شمع محبت ہائے دو دل کے غباروں میں

شبِ فرقت کو زاہد سے سوا مر مر کے کاٹا ہے
کرے مشہور ہم کو بھی خدا شب زندہ داروں میں

یہ کس نے کشتۂ تیغ تبسم کر دیا مجھ کو
مبارک باد کا غل ہو رہا ہے سوگواروں میں

وہ حسرت جس کا ساماں ہے دل میں، ہو نہیں سکتی
مری مجبوریوں کو دیکھئے ان اختیاروں میں

ہمیں وہ ڈھب جو آجاتا، نہیں پر آزماتے ہم
دلِ عشاق تم کیا کہہ کے لیتے ہو اشاروں میں

صفیر اب بس کرو! کب تک سرِ شوریدہ زانو پر
غزل کی فکر کیونکر ہو سکے گی انتشاروں میں؟

ضیا

میر ضیاء الدین

○

دل رُبا ہے مرا بڑا گستاخ
میں نے اتنا نہ سمجھا تھا گستاخ

اب تو وہ شوخیاں لگا کرنے
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

ناز بے جا کبھی نہ کرتا تھا
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

جاں فشانی ہم اس پہ کرتے ہیں
رام ہرگز نہ وُہ ہُوا گستاخ

اے ضیا کچھ تو سمجھ کے کلام
وہ صنم تو ہے بے وفا گستاخ

صنعت

شیخ کریم الدین مُراد آبادی

○

وصل کی شب میں بھی ہم باہمدگر رویا کیے
میں جدائی سے وہ میرے حال پر رویا کیے

اُس نے زانو غیر کا اپنے رکھا جب زیرِ سر
اپنے زانو پہ ہم اپنا رکھ کے سر رویا کیے

اُس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہمنشیں! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کیے

ہو گیا مشکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اک دریا ہُوا، ہم اس قدر رویا کیے

سُرخرو بے آبروئی میں بھی ہم صنعت رہے
خشک جب آنسو ہوئے، لختِ جگر رویا کیے

طاہر

[illegible]خرم آبادی

○

[illegible]ں بالیں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں
[illegible] نے لوٹ لیا ہے فقیر ہیں

[illegible]ل بچائے زہرہ جبینوں کی چاہ سے
[illegible]ے ہیں دو فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

[illegible] آنکھیں ہم نے کی ہیں تو غصہ نہ کیجیے
[illegible]ائل نہیں، فقیر نہیں، راہ گیر ہیں

[illegible] پہ تمہارے بیٹھے ہیں، سر پہ ہے آفتاب
[illegible]م خاکسار مالکِ تاج و سریر ہیں

[illegible]وہ بھی تو رہیں اسے اثرِ گریہ ایک دن
[illegible]ن کی نگاہ میں مرے آنسو حقیر ہیں

[illegible] دیکھیں تو آئنہ
[illegible] مانگ سے لکیر ہم اس پہ فقیر ہیں

[illegible]نظروں سے کیا گرائیں گے طاہر عدو مجھے
[illegible]فضل خدا سے دستِ خدا دستگیر ہیں

عاجز

عارف الدین خاں

○

عرق جب اس پری کے چہرۂ پُر نور سے ٹپکے
خجل ہو گُل سے شبنم، جُوں لہو ناسُور سے ٹپکے

مری آنکھوں سے خونیں اشک یُوں گرتے ہیں پلکوں پہ
لہُو سُولی کے اوپر جُوں سرِ منصور سے ٹپکے

اگر کیفِ سخن میرا نہاں تاک کو پہنچے
صراحی شاخ بن جائے، شراب انگور سے ٹپکے

اگر اس زلفِ مشک آمیز سے چینی میں بال آوے
عجب ہیں عطر و عنبر کاسۂ فغفور سے ٹپکے

کروں فریاد رو رو یار کو جب یاد کر عاجز
دم اسرافیل کا لو ہو ہو بانگِ صور سے ٹپکے

عارف

حکیم نواب سبحان خان

○

ملتفت کب نگاہِ ناز نہیں
دل ہی خود نیشتر نواز نہیں

جانتا ہوں تری نگاہ کو میں
اور پھر آشنائے راز نہیں

ہائے وہ دل کہ بے قرارِ خلش
وائے وہ سر! کہ سر فراز نہیں

آ، بتاؤں تجھے میں راز کی بات
راز یہ ہے کہ کوئی راز نہیں

اب یہ عالم ہے تیرے حسن کی خیر!
ہوش و مستی میں امتیاز نہیں

واقفِ راز ہر دو عالم ہوں
کیا کروں حکم شرحِ راز نہیں

آؤ! مسجد میں پڑ رہیں عارف
درِ مے خانہ آج باز نہیں

عبرت

اکبر حسین موہانی

○

دل ہے، نہ نشان بے دلی کا
کیا وقت پڑا ہے بے کسی کا

دیکھا کیے راستہ کسی کا
تھا شغل یہ اپنی زندگی کا

پروائے کرم، نہ شکوۂ غم
اللہ رے داغ! بے دلی کا

ہیں اور یہ بے نیازیِ شوق
احسان ہے جوشِ بے خودی کا

مرنا، مرنے کی آرزو میں
حاصل ہے یہ اپنی زندگی کا

آنسو بھر آئے، دل بھر آیا
گر نام بھی سن لیا خوشی کا

آخر عبرت نے جان دے دی
کچھ پاس کیا نہ بے کسی کا

قدرت

شاہ قدرت اللہ

○

…ی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے — جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

…طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے — اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

…اپنے ہوا… وہی ہے کاوشِ مدام — ہر طپش یاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

ق

…اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے

…ز ہو، تو کیا عشرت سے کیجے زندگی — اس طرف آوازِ طبل ادھر صدائے کوس ہے

…ے تا شام ہوتا ہوئے گلگوں کا دور — شب جو ہی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے

…ی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے

…ی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

…ی دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

…ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

…ی پردہ کے سبب سمجھے تو ہیں الاپ — گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھے تھی تسبیح ریا
آج رہنِ جام ہے، یہ خرقۂ سالوس ہے

قلق

آفتاب الدولہ لکھنوی

○

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر، تو لوگ کہتے ہیں
خدا برے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

پھرا جو کوچۂ کاکل سے کوئی پوچھیں گے
سنا ہے لٹ گیا رستے میں قافلہ دل کا

ہزار فصلِ گل آئے جنوں! وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

بہار آتے ہی کنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

الٰہی خیر ہو! کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا مقابلہ دل کا

فدوی لاہوری

○

اٹھتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے
ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے، جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے
یہ، یہ ہی تیر ہے کہ سدا بے کماں چلے

سر پہ تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار
ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خوں فشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں
بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں رہے
وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

فراق

شناء اللہ

○

غیر کے دل میں نہ جا کیجے گا
میری آنکھوں میں رہا کیجے گا

کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے
بے نوایانہ صدا کیجے گا

زائران حرم و دیر کبھو
میرے حق میں بھی دعا کیجے گا

وائے اس اپنی سیہ بختی پر
خواہش زلف رسا کیجے گا

فقیر

میر شمس الدین

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

بے غرض دید سے، یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ اِدھر بیٹھ گئے، خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے، سینکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر باز نے اس باز کو بخشی پرواز
سینکڑوں مرغ ہوا پھاند کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے ان کے مگر بیٹھ گئے

منت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچے سے فقیر
جب کہ بستر کو جما، کھول کمر بیٹھ گئے

قدر

سید غلام حسین بلگرامی

ہوئے کارواں سے جدا جو ہم، رہِ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اُٹھے تو بانگِ درا ہوئے

جو ہوا سے زلف بکھر گئی، نظر ان کی صاف بدل گئی
جو اسیرِ حلقۂ ناز تھے وہ قتیلِ تیغِ ادا ہوئے

ہُوا بعدِ وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جدا جدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہُوا، ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے

اُٹھے ہم جو خوابِ خیال سے لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اُٹھے، وہ کدھر گئے، ابھی پاس تھے، ابھی کیا ہوئے

جو نگہ ہے چشمِ سیاہ میں وہی برقِ طور ہے راہ میں
تری آنکھ پہ جو فدا ہوئے، وہ شہیدِ راہِ خدا ہوئے

بنے قدر ایسے غبار ہم، ہوئے گردشوں میں وہ خوار ہم
کہ مثالِ دائرۂ فلک، جو اُٹھے تو بے سر و پا ہوئے

عشق عظیم آبادی

○

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں
عمر کیوں کھوتے ہو، اے دیدۂ تر رونے میں

رات کب آئے تم اور کب گئے، معلوم نہیں
جان! اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں

جب تلک اشک تھمیں، بیٹھ! اگر آیا ہے
تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں

تجھ کو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن
ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

عالمِ عشق میں مجنوں بھی بڑا گاڑھا تھا
یار مجنوں سے بھی ہم گاڑھے ہیں پر رونے میں

عظیم

مرزا عظیم بیگ

○

کل چشمِ خوں نشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ، یک تختۂ چمن تھا

کیجو عظیم کو بھی یا رب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحبِ سخن تھا

او رمعنی بند ایسا، ہندی زباں کا صاحب
ہندوستان سے لے کر مشہور تا دکن تھا

اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تارِ پیرہن تھا

دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

کمال

شاہ کمال الدین

○

جوں قدم یار نے گھر سے مرے در پہ رکھا
سر رکھا زانو پہ میں، ہاتھ جگر پر رکھا

ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ
دستِ شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پہ رکھا

سنگِ رہ اس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا!
مثلِ گل میں نے اٹھا کر اسے سر پر رکھا

بیٹھے بیٹھے تجھے کون آ گیا یاد آج کمال!
تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پہ رکھا

گستاخ

کرامت اللہ خاں رامپوری

○

ساغر میں شکلِ دخترِ رز کچھ بدل گئی
خم سے نکل کے نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

کہتی ہے نیم وا یہ چمن کی کلی کلی
فریادِ عندلیب کلیجہ مسل گئی

ساقی ادھر اٹھا تھا ادھر ہاتھ اٹھ گئے
بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

انگڑائی لے کے اور بھی وہ سوئے چین سے
پھولوں کی پنکھیا جو نسیم آ کے جھل گئی

دامن میں دخترِ رز نے لگایا ضرور داغ
جس پارسا کی گود میں جا کر مچل گئی

گھبرا کے بولے نامۂ گستاخ تو نہیں
جب ان کے پاس کوئی ہماری غزل گئی

گویاؔ

نواب فقیر محمد خان

○

اس کو غفلت پیشہ کہہ آتے ہیں ہم
بھول جانا یاد دلواتے ہیں ہم

ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پر سر
آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

دل نہیں اس بت کی الفت چھوڑتا
ناسمجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم

ہے جنازہ اس لئے بھاری مرا
حسرتیں دل کی لئے جاتے ہیں ہم

بارِ عصیاں سر پہ ہے گویاؔ بہت
کیا اٹھائیں سر، جھکے جاتے ہیں ہم

مائلؔ

مرزا محمد یار بیگ

○

اختر سے تھے گر موتی اس کان کے بالے کے
اک چاند بھی جھلکے تھا جھرمٹ میں دوشالے کے

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلے کو
جھلکے ہے بدن اس کا یوں کرتے میں والے کے

یوں کان میں ہے تیرے یہ موتیوں کا بالا!
کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے

وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک بچے کوئی
بچتے ہیں کہیں مائلؔ کاٹے ہوئے کالے کے

محب

شیخ ولی اللہ

○

اس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی
شیشے میں عجب آن سے جھلکے تھی خدائی

عالم میں نشے کے شب مہتاب نے تیرے!
خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی

غیروں سے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی

واللہ! ہیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی!

ہر دم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشے میں
ڈرتا ہوں کہ تیری نہ مڑک جائے کلائی

آئینہ نمد پوش ہوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی

ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روز قیامت، تری اک شب کی جدائی

عاشق کو محب سلطنت ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی!

محنت

مرزا حسین علی

○

ناصح! یہ نصیحت نہ سُنا، میں نہیں سُنتا
بک بک کے مرا مغز نہ کھا میں نہیں سُنتا

احوال مرا دھیان سے سنتا تھا، ولیکن
کچھ بات جو سمجھا، تو کہا، میں نہیں سُنتا

اُس بت نے جو غیروں پہ کیا لطف تو یارو!
مجھ سے نہ کہو بہر خدا، میں نہیں سُنتا

کچھ ذکر میں ذکر اپنا میں لایا تو وہ بولا
بس بات کو اتنا نہ بڑھا میں نہیں سُنتا

شکوہ سے ہی کرتا ہے جو کوئی اس سے مرا ذکر
تو کہتا ہے ہر اک کا گلہ میں نہیں سُنتا

محنت کو ہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت
کہتا ہے وہ مجھ سے، تو ذرا میں نہیں سُنتا

محوی

مولوی محمد حسین لکھنوی

○

صلائے عام ساقی ہے کہ آؤ باصفا کر دوں
فنا کی مے پلا کر مست و مدہوش بقا کر دوں

تمنائے وصال یار ہے تفریح روحانی؛
جو قابو ہو تو اپنی جان و دل تم پر فدا کر دوں

مری رنگیں بیانی منحصر ہے ذکرِ جاناں پر
مضامیں معرفت کے جس طرح چاہوں ادا کر دوں

ستم ہے، سر جھکا کر، مسکرا کر یار کا کہنا!
ملے خونِ دلِ عاشق تو میں ترکِ حنا کر دوں

خیالِ غیر سے نفرت دلِ عاشق کو لازم ہے
محبت ان کی کہتی ہے کہ ترکِ ماسوا کر دوں

صدائے نالۂ پیہم، نوائے صور ہے گویا
کہو تو میں ابھی ہنگامۂ محشر بپا کر دوں

تمہیں آئینۂ وحدت میں دیکھو شانِ محبوبی
میں اے محوی یہ عقدہ راز کا کس طرح وا کر دوں

مروت

صغیر علی

○

کیوں تو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں
اُڑتی پھرے ہے بلبل گل سے خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اُڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقتِ شام جانا بہرِ خدا چمن میں

جوں لالہ داغِ دل یاں پھر جل اُٹھا ہے شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

بیبا بنا گل نے بچارا بلبل مُوئی مروت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

مضطر

حکیم اسد علی خان

○

تیری نگاہِ ناز جو ناوک اثر نہ ہو
تکلیفِ چارہ سازیٔ زخمِ جگر نہ ہو

مجھ سے بھی کچھ سوا ہے انہیں میری آرزو
یہ شوق وہ نہیں جو اِدھر ہو، اُدھر نہ ہو

مَیں اور مجھ کو وعدۂ دیدار کی امید
وہ چاہتا ہوں آج کہ جو عمر بھر نہ ہو

اے برقِ حُسنِ یار ذرا چشمِ التفات
یُوں جل بجھوں کہ مجھ کو بھی میری خبر نہ ہو

کعبہ میں ہے نشاں نہ کہیں دیر میں پتہ
تیری گلی میں مضطرِ آشفتہ سر نہ ہو

معروف

مرزا الٰہی بخش

○

آہ! وہ کون تھا خدا مارا
جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ایک ہے تُو بھی بدبلا اے چشم!
دل کو پھر زلف میں پھنسا مارا

کیا غضب تھی وُہ جُنبشِ ابرو
صاف جس نے کہ نیمچا مارا

بعد مُدت ملے تھے کل ان سے
آج لوگوں نے پھر لڑا مارا!

وصل کی شب بھی مَیں نہ سویا آہ
شبِ ہجراں کے خوف کا مارا

مقتولؔ

مرزا ابراہیم بیگ

○

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں
گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں

نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں
ہم اب آشیانہ جدا باندھتے ہیں

جفا کھینچیں گے پر نہ ہاریں گے جی کو
یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں

ق

گرہ دے کے سر پہ جو بالوں کا جوڑا
یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں

ہر اک تار میں اس کے دل ہائے عشاق
ہم جمع کر کے ملا باندھتے ہیں!

میاں حالِ مقتولؔ دیکھا نہیں کیا
کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں!

منتؔ

میر قمر الدین

○

مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے

میری ہی طرح جگر خوں ہے ترا مدت سے
اے حنا! کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے

آہ اے کثرتِ داغِ غمِ خوباں! کہ مدام
صفحۂ سینہ پُر از جلوۂ طاؤسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ کو منتؔ
ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خوسی ہے

منتظر

میاں نورالاسلام

○

امید ہے کہ مجھ کو عطا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے

اس طرح وہ فریب سے دل لے گئے مرا
جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے

بھاویں نہیں کچھ اس کے نکلتی ہے بنی جان
کیا ایسے بے وفا سے وفا آدمی کرے

مارا ہے کوہ کن نے سر اپنے پہ تیشہ آہ
دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے

گر کچھ کہا بگڑ کے میں بس اس نے ہنس دیا
کیا ایسے آدمی کا گلا آدمی کرے!

گزرا میں ایسی چاہ سے اے ہم نشیں!
بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے

ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر
کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

منیر

سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی

○

آمد تصورِ بُتِ بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لُوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یا رب نگاہِ مست یہ کس بے خبر کی ہے

یہ رنگ و بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشکِ قمر کی ہے

پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

مہر

مرزا حاتم علی

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا دامن ہے
بس اب پاؤں ہیں اپنے اور سرِ خارِ مغیلاں ہے

ہوائے دشتِ وحشت ہم کو لے اُڑتی ہے بستی سے
ہمارا عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیاباں ہے

سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اور پھر اُلجھتا ہوں
مطوّل، مختصر، وہ شرحِ شعرِ زلف پیچاں ہے

جلا آتا ہے یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں سے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہے

نہ کیوں ہر طرز میں پڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
مرا استادِ کامل مہر ناسخ سا سخنداں ہے

ناظم

نواب محمد یوسف علی خان والیٔ رامپور

میں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سحر غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ہاں سینے سے نمائشِ داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے
عشقِ مجاز و ہمتِ حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کیلئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

کہنا ادا کو تیغ، خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جانِ عزیز پیشکش نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑاتی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے
ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط

نثار

محمد امان

○

کیا جانے پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا، تختہ وہ چمن کا تھا

ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھاروگے
جوں صبح گجر باجا، ماتھا وہیں ٹھنکا تھا

مینا میں نہ ہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جامہ میں جو کچھ یارو! رنگ اسکے بدن کا تھا

نرگس کو کیا ایسا بیمار ان آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

ندرت

شعیب احمد میرٹھی

○

نالۂ دل کی صدا، دیوار میں ہے در میں ہے
صور یا محشر میں ہوگا، یا ہمارے گھر میں ہے

یوں تو مرنے کو مروں گا میں، مگر مٹی مری
یا فلک کے ہاتھ میں، یا آپ کی ٹھوکر میں ہے

میں پریشاں ہو کے نکلوں گا، تو اُن کی بزم سے
میری بربادی کا ساماں ہے تو اُنکے گھر میں ہے

وہ اگر دیکھیں تو اب حالت سنبھلتی ہے مری
وہ اگر پوچھیں تو، اب مجھ کو شفا دم بھر میں ہے

یہ نہیں موقع ہنسی کا، تم نظر بدلے رہو
اب قضا میری، اسی بگڑے ہوئے تیور میں ہے

دے دے چلو میں اکٹھی کر کے اے ساقی مجھے
کچھ ابھی تو خم میں ہے شیشے میں ہے، ساغر میں ہے

نقد جاں لینے کو مقتل میں قضا ندرت مری
بن کے دلہن رونما آئینۂ خنجر میں ہے

نظرؔ

نوبت رائے لکھنوی

○

کاروبارِ عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی
دل نہ تھا تو تنگیٔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی
دل میں سناٹا نہ تھا، وحشت کبھی ایسی نہ تھی

ان کے وعدہ پر ہمیں جینا پڑا ہے حشر تک
ورنہ طولانی شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم
غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

آپ نے بیمار پرسی کی تو جینا ہے وبال
ورنہ مرنے کی مجھے حسرت کبھی ایسی نہ تھی

بامزہ ہے کس قدر انکار اُن کا وصل میں
تجھ میں اے خونِ جگر لذت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے
پردہ دارِ غم شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کش مکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظرؔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

نواؔ

ظہور اللہ بدایونی

○

اب اشک تو کہاں ہے جو چاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سے وقتِ گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

پہنچی جو ٹک جھلک ترے دانوں کی گوش تک
خجلت سے آب ہو دُرِ مکنوں ٹپک پڑے

طغیاں سرشک کا تو یہاں تک ہے چشم سے
اک قطرہ آب کا ہو، تو جیحوں ٹپک پڑے

ڈوبا ہے بحرِ شعر میں ایسا نواؔ کہ اب
دے طبع کو فشار تو مضموں ٹپک پڑے

نیازؔ

شاہ نیاز احمد بریلوی

○

عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا، جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا، جو ہو سو ہو

عقل کے مدرسے سے اٹھ، عشق کے مے کدہ میں آ
جامِ فنا و بے خودی اب تو پیا، جو ہو سو ہو

لاگ کی آگ لگ اٹھی، پنبہ طرح سا جل گیا
رختِ وجودِ جان و تن کچھ نہ بچا، جو ہو سو ہو

ہجر کی سب مصیبتیں عرض کیں اس کے روبرو
ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا، جو ہو سو ہو

دنیا کے نیک و بد سے کام ہم کو نیازؔ کچھ نہیں
آپ سے جو گزر گیا، پھر اسے کیا، جو ہو سو ہو

واقفؔ

شاہ واقف

○

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے
اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

یاران ہم نشین و رفیقانِ دوست دار
سب آشنا ہیں زندگیٔ مستعار کے

جب مند گئی یہ آنکھ تو اے دوست! بعدِ مرگ
پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

جو نقشِ پا رہے سو رہے پھر نہ اٹھ سکے
واقفؔ کی طرح ہائے گئے کوئے یار کے

وحید الہ آبادی

○

آئینہ جلوۂ دیدار کے دکھلانے کو
پھونک دے برقِ تجلی مرے کاشانے کو

دیکھیے! کون سی جا، یار کا ملتا ہے پتہ
کوئی کعبے کو چلا ہے، کوئی بت خانے کو

تیری فرقت میں تصور ہے یہ بے دردی کا
خواب ہم جانتے ہیں نیند کے آجانے کو

بعد میرے جو ہوا دشت میں مجنوں کا گزر
رو دیا دیکھ کے خالی مرے ویرانے کو

کام آجاتی ہے ہم بزمی بھی روشن دل کی
شمع ہم رنگ بنا لیتی ہے پروانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اے جنوں تنگ ہوئی وسعتِ صحرا تجھ سے
اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو

گل پہ بلبل تھا کہیں شمع پہ پروانہ تھا
ہم نے ہر رنگ میں دیکھا ترے پروانے کو

واشدِ دل نہ ہوئی، غنچۂ خاطر نہ کھلا
کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وفا

حکیم عبدالہادی خان رامپوری

○

پھر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گزرا
نالہ کیوں آبلۂ دل سے اُلجھ کر گزرا

میں ہوں دلداریٔ افسونِ وفا پر نازاں
جو رقیبوں پہ نہ گزرا تھا، وہ مجھ پہ گزرا

کیا محیطِ مے بے رنگ میں طوفاں آیا
جوشِ رنگ انجمنِ ناز سے باہر گزرا

تشنۂ حسرتِ جاوید ہوں میں کیا جانوں
کیوں گلے سے میرے تلخابۂ کوثر گزرا

آؤ! میرے دلِ افسردہ کی تسکین دیکھو
جاؤ! اس کشمکشِ ناز سے میں درگزرا

لٹ گئی جان تو امید کے پہلو ڈھونڈے
مٹ گئی راہ تو اندیشۂ رہبر گزرا

اِس تکلف سے کٹی عمرِ گراں مایہ وفا
ایک دم سینکڑوں برسوں کے برابر گزرا

ولا

مظہر علی خان

○

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشمِ تر آلودہ

ازبسکہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے کرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یاں
رشکِ جگری سے ہے دیوار و در آلودہ

اک پل میں گذر جاوے نہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بڑی ظالم، آہِ اثر آلودہ

بخش اپنے ولا کو بھی از راہِ کرم یا رب
ہر چند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

ہادی

میر محمد جواد

○

رہ رہ کے سخن کہنا ہر بار بہت تھنہ
ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تھنہ

ہر پاؤں کی ٹھوکر میں سو دل پڑے تڑپے ہیں
کچھ ان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تھنہ

خورشید کا یوں چہرہ زرتار تو ہے لیکن
ہے سر پہ تری سادی دستار بہت تھنہ

اک بوسہ پہ دل ٹھہرا تس پہ وہ نہیں لیتا
اک سہل سی قیمت پہ تکرار بہت تھنہ

ہم مر چکے پر اُس نے دل کی نہ خبر پوچھی
ہم کو بھی ملا ہے یاں دلدار بہت تھنہ

ہوس

نواب مرزا محمد تقی

○

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں، نہیں کھاتی ادب سے خدا کی قسم
غم قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم، اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

رکا پایا جو لیلےٰ نے مجنوں کا جی، کہا کیوں ہو خفا مرے سرو سہی
کرنہیں نے کسی سے ہے بات بھی کی، مجھے میری ہی شرم و حیا کی قسم

مرے گریہ سے جاوے ہے صبر و سکوں کرے اشکوں سے ٹپکے ہے قطرۂ خوں
ارے چین نہیں مجھے پیارے کہوں، مجھے اس تری مہر و وفا کی قسم

شبِ ہجر میں اشکوں کا خون بہا، اسے دیکھ کے رنگ شفق کا اُڑا
نہیں اس میں مبالغہ ایک ذرا مجھے تیرے ہی رنگ حنا کی قسم

ترے کشتۂ غم کا ہے حال بتر، یہی کہیو جو جانا ہو تیرا اُدھر
تجھے قاصدِ موجِ نسیمِ سحر، شبِ ہجر کی میری بکا کی قسم

کبھی کہتا تھا قیس غزالوں سے جا، کہو ناقہ ادھر سے کدھر کو گیا
کبھی کہتا تھا تو ہی بتا دے صبا! تجھے لیلےٰ کی زلفِ دوتا کی قسم

کبھی ساغرِ وصل نہ میں نے پیا، کبھی چاک جگر کو نہ میں نے سیا
غم و رنج و تعب کو عزیز کیا، مجھے عشق کے جور و جفا کی قسم

نہ تو پائی ہوس کبھی پھولوں کی بُو نہ تو بیٹھا ہوں میں کبھی برلبِ جُو
نہ تو بے کلی دل کی گئی ہے کبھو، مجھے پیارے کی اپنے وفا کی قسم

فیض احمد فیضؔ

○

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

ق

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا مے کا خم کا پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

○

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

باتیں پیا

○

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

عبادت ہے اک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاہد
تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں
کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں

○

کون آیا ہے مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابرِ سرِ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

اختر

نہ سازِ مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہارِ چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی

زمانہ گزرا وہ یاسمن بو جدا ہوئی ہم کنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شامِ غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

مٹا دیئے بے ستون چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبت کے لب پہ اب بھی ترانۂ کوہکن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

○

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہِ مے فروش
جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی

گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی

عالمِ مستی کی توبہ الاماں!
پارسائی نشہ بن کر چھا گئی

آہ اس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کمھلا گئی

سازِ دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آ گئی

پارسائی کی جواں مردی نہ پوچھ
توبہ کرتی تھی کہ بدلی چھا گئی

اختر اس جانِ تمنا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

○

تاثیر

وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریقِ آشنائی نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں ترا زیرِ لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریبِ سادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر مری تاب سے زیادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ قدم قدم پہ لغزش وہ نگاہ مستِ بادہ
یہ طرازِ زلفِ سرکش یہ کلاہِ کج نہادہ

○

حسن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے، دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ عرضِ تمنا جو زباں تک پہنچے

○

ستمبر ——— ۱۹۹۱ ———

عبدالمجید سالک

ہمنفسو، اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہوا

عشق ہے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیٔ مست کے غمزۂ ہوش ربا کو کیا ہوا

اب نہیں جنتِ مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا

تھم گیا دورۂ حیات رُک گئی نبضِ کائنات
عشق و جنوں کی گرمیٔ ہمہمہ زا کو کیا ہوا

نالۂ شب ہے نارسا آہِ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا میرے خدا کو کیا ہوا

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا

اٹھا دے اب تو نقاب اے عروسِ آزادی
ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

وداعِ عشق ہے اب رخصت اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا

خرد نے سائے میں جس کے پناہ لی صدیوں
جنوں نے آج اسی دامن کو تار تار کیا

چھپا رکھا تھا جسے محتسب نے ردوں میں
وہ رازِ بزم میں رندوں نے آشکار کیا

دماغ تو کسی قیمت پہ بِک نہ سکتے تھے
متاعِ دل ہی کو نذرِ جمالِ یار کیا

نظر میں پھر گئی سالکؔ جہانِ نو کی نمود
غمِ زمانہ نے جب مجھ کو اشکبار کیا

...ـی کی نہ نور و جناں کی بات کرو مئے کہن کی نگارِ جواں کی بات کرو

...سی کی تابشِ رخسار کا کہو قصہ کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو

...یا ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی فروغِ محفلِ روحانیاں کی بات کرو

...مدعا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر تو آستانۂ پیرِ مغاں کی بات کرو

...یں ہوا جو طلوعِ آفتاب تو فی الحال قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو

...نے کا مشغلۂ یادِ رفتگاں کب تک گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو

...قید و صید کے اندیشے سے بے جا کیا چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو

...ی جہان ہے ہنگامہ زارِ سود و زیاں اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو

...اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے کرو۔ تو اب ستمِ باغباں کی بات کرو

خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں سالکؔ
دیارِ ہند میں حسنِ بتاں کی بات کرو [1]

○

خرد میں مبتلا ہے سالکؔ دیوانہ برسوں سے
نہیں آیا وہ مے خانے میں بیباکانہ برسوں سے

میسر جس سے آجاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

بیادِ چشمِ یار اک نعرۂ مستانہ اے ساقی
کہ ہاؤ ہو سے خالی ہے ترا میخانہ برسوں سے

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

کسی کو تو مشرف کر کے لے ذوقِ جبیں سائی
تقاضا کر رہے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

نئی شمعیں جلاؤ عاشقی کی انجمن والو!
کہ سونا ہے شبستانِ دلِ پروانہ برسوں سے

کوئی جوہر شناس آئے تو جانے قدر سالکؔ کی
پڑا ہے خاک پر یہ گوہرِ یکدانہ برسوں سے

○

[1] ...ے مشاعرہ دہلی میں پڑھی گئی

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے
وہ زندگی جو سرِ رہگزار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو
کہ موجِ مستیٔ سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

یہ سانحہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

مقیمِ کوچۂ دلدار کو پتہ بھی نہیں
کدھر سے زندگیٔ مستعار گزری ہے

انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انھیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کبھی ہجومِ غمِ روزگار دیکھا ہے
کبھی مصیبتِ ہجرانِ یار گزری ہے

حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک عابدؔ
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

○

دل ہے آئینۂ حیرت سے دوچار آج کی رات
غمِ دوراں میں ہے عکسِ غمِ یار آج کی رات

کوئی منصور سے جا کر یہ کہو ہم نفسو!
ہوں بہ تعزیرِ خموشی سرِ دار آج کی رات

غم کے محور پہ ہیں ٹھہرے ہوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات

نہ مکاں آج ہے ثابت نہ زماں ہے سیار
نہ خزاں شعبدہ آرا، نہ بہار آج کی رات

کبھی فردوسِ گل و لالہ تھی جو کشتِ خیال
اس سے بے ساختہ اُٹھتے ہیں شرار آج کی رات

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہے دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

مجھے معلوم ہے عابدؔ کہ بیاضِ دل پر
ناخنِ غم نے کیے نقش و نگار آج کی رات

○

کاروانِ گل و ریحاں گزرے — صورتِ برقِ درخشاں گزرے

کیا بتاؤں کہ مری آنکھوں سے — کس قدر خواب پریشاں گزرے

مے کدے بنتا رہا میں شکلِ حباب — وہیں بادہ کے طوفاں گزرے

گردشِ جام نہیں رک سکتی — جو بھی اے گردشِ دوراں گزرے

صبحِ محشر ہے بلا سے ظاہر — کسی صورت شبِ ہجراں گزرے

کوئی برسا نہ سرِ کشتِ وفا — کتنے بادل گہر افشاں گزرے

راہِ آدم کو نہ آیا کوئی راس — کئی آذر کئی یزداں گزرے

غمِ ہستی کے بیابانوں سے — کچھ ہمیں تھے کہ غزل خواں گزرے

اے غمِ یار تری راہوں سے — عمر بھر سوختہ ساماں گزرے

وہ جو پروانے جلے رات کی رات — منزلِ عشق سے آساں گزرے

غم کے تاریک افق پر عابد
کچھ ستارے سرِ مژگاں گزرے

○

غمِ دوراں غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

لذتِ عرضِ وفا راحتِ جاں ہے کہ جو تھی
دل تپاں اشک رواں شوق جواں ہے کہ جو تھا

شرع و آئین کی تعزیر کے باوصف شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا

میرے پاؤں سے ہیں الجھے ہوئے ریشم کے یہ تار
ہمہ مو! یہ تو وہی بندِ گراں ہے کہ جو تھا

عشق کی طرزِ تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لب خوش گوئے ہوس محوِ بیاں ہے کہ جو تھا

راہرو دشت میں فریاد کناں ہیں کہ جو تھے
خندہ زن قافلۂ راہ براں ہے کہ جو تھا

مغبچے خوش ہیں کہ بزم ان کی ہے ساقی ہے نیا
بر سرِ کار وہی پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا

جلوۂ یار سے کیا شکوۂ بے جا کیجے!
شوقِ دیدار کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا

حلقۂ وعظ سے اب تک ہے گریزاں دنیا!
حلقۂ زلف مدارِ دو جہاں ہے کہ جو تھا

میرے ہنسنے پہ خفا تھے مرے رونے پہ ہنسے
وہی رنگِ ستم عشوہ گراں ہے کہ جو تھا

سنگِ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصرِ بلند
یہ وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

دوستو ہم نفسو! سنتے ہو عابد کی غزل!
یہ وہی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

○

حفیظ ہوشیار پوری

○

ایسی بھی کیا جلدی پیارے، جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ، بیٹھ بھی جاؤ سن لو کوئی دم

وصل کی شیرینی میں پنہاں، ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے، تم سے جدا ہونے کا بھی غم

حسن و عشق جدا ہوتے ہیں جانے کیا طوفان اُٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم، عشق کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم

میری وفا تو نادانی تھی تم نے مگر یہ کیا ٹھانی تھی
کاش نہ کرتے مجھ سے محبت، کاش نہ ہوتا دل کا یہ عالم

پروانے کی خاک پریشاں، شمع کی لَو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں، کون کرے اب کس کا ماتم

کچھ بھی ہو پھر ان آنکھوں نے اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا نازِ سراپا، حسن کی دنیا عجزِ مجسم

شہد شکن ہونٹوں کی لرزش، عشرتِ باقی کا گہوارہ
دائرۂ امکانِ تمنا، نرم لچکتی باہنوں کے خم

اپنے اپنے دل کے ہاتھوں دونوں ہی برباد ہوئے ہیں
میں ہوں اور وفا کا رونا، وہ ہیں اور جفا کا ماتم

ناکامی سی ناکامی ہے، محرومی سی محرومی ہے
دل کا منانا سعیِ مسلسل ان کو بھلانا کوششِ پیہم

عہدِ وفا ہے اور بھی محکم، تیری جدائی کے میں قرباں
تیری جدائی کے میں قرباں، عہدِ وفا ہے اور بھی محکم

○

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی

دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی

وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجومِ بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی

نظر کہ تشنۂ دیدار تھی رہی محروم
نظر اُٹھائی تو دل میں اُتر گیا کوئی

نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی

اب اُن کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
مجھے اور میری نظر سے سنور گیا کوئی

کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اُٹھا سوئے در گیا کوئی

نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی

اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفان
پھر اُن کی راہ سے باچشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست مجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

[illegible] لذتِ محبت سے زباں تک پہنچے — بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا قیامت ہے ترے حسن کا اللہ اللہ — جلوے آنکھوں سے اتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا — سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے — دیکھنے والے کہاں سے ہیں کہاں تک پہنچے

کھل گیا آج نگاہوں پہ نگاہیں اپنی — جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

وہی اس گوشۂ داماں کی حقیقت جانے — جو مرے دیدۂ خوننابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنہیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے — ہوتے ہوتے وہ گلے حسنِ بیاں تک پہنچے

آہ وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے — ہائے وہ بات کہ اک اک کی زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سنے قصۂ فرقت میرا — کون ہے جو مرے اندوہِ نہاں تک پہنچے

خلش انگیز تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال — ٹوٹ کر دل میں یہ نشتر رگِ جاں تک پہنچے

[illegible] نشاں کا نہ خبر رہبر کی — جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

[illegible] منزل ہے نہ آوازِ جرس — کون مجھ رہروِ گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ
حسن کا راز جو اور میری زباں تک پہنچے

○

پھر سے آرائشِ ہستی کے جو ساماں ہوں گے
تیرے جلووں ہی سے آباد شبستاں ہوں گے

عشق کی منزلِ اول پہ ٹھہرنے والو!
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

تو جہاں جائے گی غارت گرِ ہستی بن کر
ہم بھی اب ساتھ ترے گردشِ دوراں ہوں گے

کس قدر سخت ہے یہ ترک و طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

تیرے جلووں سے جو محروم رہے ہیں اب تک
وہی آخر ترے جلووں کے نگہباں ہوں گے

اب تو مجبور ہیں پر حشر کا دن آنے دے
تجھ سے انصاف طلب روئے گریزاں ہوں گے

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

کوئی بھی غم ہو، غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظ
ہم بہر حال بہر رنگ غزل خواں ہوں گے

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

ذرا دیر آشنا چشمِ کرم ہے
ستم ہی عشق میں پیہم نہ ہوں گے

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

کہوں بیدرد کیوں اہلِ جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیلِ گریہ ہوگا
اگر با دیدۂ پرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

○

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
حدودِ شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے

نہیں پیام رہِ نامہ و پیام تو ہے
ابھی صبا سے کہو اُن کے دل کو بہلائے

غرورِ بادہ شناسی بجا سہی لیکن
سراغِ منزلِ مقصود بھی کوئی پائے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر کہہ دے
چلے تھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے

گزر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلہ نہ ٹھہرائے

نجانے ان کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے

کوئی فریبِ نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے

غمِ زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب اُن گیسوؤں کے بھی سائے

بہت بلند ہے اس سے مرا مقامِ غزل
اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

حفیظ اپنا مقدر، حفیظ اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

○

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

○

شبِ تیرہ نگراں ہے کلی کلی بیدار — نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار
کہیں فغاں میں بھی نشاط و طرب کا افسانہ — کبھی ہنسی بھی تڑپتے ہوئے دلوں کی پکار
نہ جانے کس کے نشانِ قدم سے ہیں محروم — کہ ایک عمر سے سونے پڑے ہیں راہگزار
ہزار بار کسی چشمِ آشنا کے طفیل — اُجڑ اُجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار
عجب مآل ہے بیتابیٔ محبت کا — شبِ وصال کی راحت میں ڈھونڈتی ہے قرار
یہ برقِ حسن اور اس پہ تری خوئے حجاب — یہ سیلِ عشق اور اس پہ نظر نظر کا شمار
ابھی چمن کو میسر نہیں ہے رنگِ چمن — بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغِ بہار

ہے ان کی پرسشِ درد و الم میں بھی پنہاں
وہ اک کسک کہ سمجھتے نہیں جسے غمخوار

○

ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہگزر سے گزرے ہیں

ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگزر سے گزرے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

رحیلِ شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لیے ہم بے خبر سے گزرے ہیں

کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں
غمِ فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں

جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لازوال
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمھیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

○

تبسم

وہ حسن کو جلوہ گر کریں گے
آرائشِ بام و در کریں گے

ہنس ہنس کے کریں گے چارہ سازی
سامانِ دل و نظر کریں گے

ہم بھی سرِ راہ منتظر ہیں
دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے

افسانۂ غم طویل ہے دوست
اس بات کو مختصر کریں گے

ہے شامِ فراق سخت تاریک
اس شام کی اب سحر کریں گے

افسردہ ہیں زندگی کے تیور
کب تک یونہی ہم بسر کریں گے

آئے گا تبسم ان لبوں پر
آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

○

تبسم

نظر میں ڈھل کے ابھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اداس پیمانے

مرے ندیم! تری چشم التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ہیں افسانے

یہ کس کی چشم فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے پیمانے

نگاہ ناز میں دل سوزیٔ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

○

یہ آج آئے ہیں کس اجنبی سے دیس میں ہم
تڑپ گئی ہے نظر چشم آشنا کے لیے

وہ ہاتھ جن سے تھا کل چاک دامن افلاک
وہ ہاتھ آج اٹھانے پڑے دعا کے لیے

یہ میں نے مانا جدائی مرا مقدر ہے
مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لیے

یہ راہرو تھے کبھی راہ زندگی کا سراغ
یہ راہرو کہ بھٹکتے ہیں رہنما کے لیے

○

چراغ حسن حسرت

○

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

○

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز

میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جرأتِ پرواز

حسن کی برہمی معاذ اللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز

زلف برہم جھکی ہوئی نظریں
گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

قد بالا و دامن کوتاہ
منزلِ عشق کے نشیب و فراز

اللہ اللہ فسونِ نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غمِ یار تیری عمر دراز!

○

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

ہر کلی میں ہے ترے حسن دل آرا کی نمود
ب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

ے چکاں لب، فتنہ آوارہ نگاہیں گستاخ
یوں ترے پہلو سے اٹھتا ہے غزلخواں کوئی

زلف برہم ہے دل آشفتہ صبا آوارہ
خواب ہستی سا نہیں خواب پریشاں کوئی

نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تارِ رگِ جاں کوئی

○

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگارنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلشِ دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

○

حسرت

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں
طرۂ طرار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

○

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غم گسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل پہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

○

احسان دانش

عشق نے حسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا
مصلحت کرتی رہی لاکھ جتن بیچ دیا

عشق نے حسن کی اک نیم نگاہی کے عوض
تاج و اورنگِ سلاطینِ زمن بیچ دیا

آج کل بارگہِ حسن ہے اور اہلِ ہوس
عشق نے سلسلۂ دار و رسن بیچ دیا

ان تک آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی کمند
جن دھندلکوں نے ستاروں کا کفن بیچ دیا

جو جفا کی کس منہ سے شکایت کیجے
اس چمن نے بھی تو ہر وصفِ چمن بیچ دیا

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی
کیا کہیں نعرۂ بت خانہ شکن بیچ دیا

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا

دل اُمڈ آیا ہے احسان بھر آئے آنسو
جب سُنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا

○

اب کہو کارواں کدھر کو چلے
راستے کھو گئے چراغ جلے

آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں
رو پڑے کر جب وہ آ کے گلے ملے

کارواں میں شورِ منزل تھا
آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے

عشق عمر کو عبور کر نہ سکا
راستے کارواں کے ساتھ چلے

ہم پہ گزری ہیں ہجر کی راتیں
ہم جہنم میں تھے مگر نہ جلے

تھے محبت کی ابتدا کے قصور
وہ تبسم جو آنسوؤں میں ڈھلے

آشیانوں پہ ظلمتیں برسیں
برق کے جس قدر چراغ جلے

وقت کی قدر میکدے والو
رات ڈھلنے کو ہے شراب ڈھلے

نغمہ ہائے حیات گائے کون
ساز اُترے ہوئے ہیں خشک گلے

خاک سے سینکڑوں اُگے خورشید
ہے اندھیرا مگر چراغ تلے

چاند ساکت ہے رُک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

میکدے کا تو ذکر بھی ہے گناہ
اب حیات حرم پڑی ہے گلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

صبح نو کے بگڑ کو کیا معلوم
[illegible] کتنے زمانوں کے گلے

○

جو ترے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے

بندگی کے مقام سے آگاہ
سرحدِ لامکاں سے لوٹ آئے

ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہم [illegible] سے لوٹ آئے

لگ گیا جی قفس میں جن جن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے

اب تو کیجیے یہ روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے

جن گلوں کو جہاں سے نسبت تھی
حلقۂ گلستاں سے لوٹ آئے

آ رہی ہے اک آشنا آواز
بے خودی ہم کہاں سے لوٹ آئے

ہائے جو گردِ راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے

دیر و کعبہ سے ان کے دیوانے
ناخوش و سرگراں سے لوٹ آئے

کاش احسان وہ خلدِ رعنائی
ارضِ ہندوستاں سے لوٹ آئے

○

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے — خودسری سر جھکا کے چلتی ہے

یاس میں ان کے لطف کی امید — ظلمتوں میں کرن مچلتی ہے

اُف وہ معذوریٔ نگاہ کہ جب — زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے

دل سلگتا نہ ہو بہاروں کا — اشک شبنم سے لو نکلتی ہے

لامکاں کے لیے عروسِ حیات — موت کے بھیس میں نکلتی ہے

تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر — دوستی کے لہو سے پلتی ہے

ہوشیار اے وفا کے دیوانے — یہ وفا آنسوؤں میں ڈھلتی ہے

تھک گیا چاند سو چلے تارے — اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے

شامِ غم میں خیال ہے اُن کا — اور جنگل میں آگ جلتی ہے

یاس لے بیٹھتی ہے کشتی کو — آس ساحل پہ ہاتھ ملتی ہے

بعض اوقات دل کی دنیا بھی — آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے

مسجدوں میں سکوت کیا معنی — میکدوں میں شراب ڈھلتی ہے

عشرتِ بے ثبات کی لو میں — جسم بنتا ہے روح جلتی ہے

دورِ حاضر کی دوستی احسان
کس قدر جلد رخ بدلتی ہے

○

نظر فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
بزعمِ ہوش تجلی کی جستجو بے سود جنوں کی زد پہ خزاں آ گئی تو کیا ہوگا
نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
نہ رہنماؤں کی مجلس میں لے چلو مجھ کو میں بے ادب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہوگا
غمِ حیات سے بیشک ہے خودکشی آساں مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا
شبابِ لالہ و گل کو پکارنے والو خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہوگا
خوشی چھنی ہے تو غم کا بھی اعتماد نہ کر جو روح غم سے بھی اکتا گئی تو کیا ہوگا
یہ فکر کر کہ ان آسودگی کے دھوکوں میں تری خودی کو بھی موت آ گئی تو کیا ہوگا
وہ داستاں جو مصائب میں دفن ہے اب تک زبانِ خلق پہ گر آ گئی تو کیا ہوگا
لرز رہے ہیں جگر جس سے کوہساروں کے اگر وہ لہر یہاں آ گئی تو کیا ہوگا

وہ موت جس کی ہم احسان سن رہے ہیں خبر
رموزِ زیست بھی سمجھا گئی تو کیا ہوگا

○

پرسشِ غم کا شکریہ! کیا تجھے آگہی نہیں
تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں

دور تھا اک گزر گیا، نشہ تھا اک اتر گیا
اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں

تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں
دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

حضرتِ خلد کے لیے زاہدِ کج نظر جھکے
مشربِ عشق میں تو یہ جرم ہے بندگی نہیں

لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے وقت نہ وہ خدا دکھائے
جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

دل کی شگفتگی کے ساتھ راحتِ مے کدہ گئی
فرصتِ مے کشی تو ہے، حسرتِ مے کشی نہیں

ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ ماہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر، لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

دیکھ کے خشک و زرد پھول، دل ہے کچھ اس طرح ملول
جیسے تری خزاں کے بعد دورِ بہار ہی نہیں

ساغر نظامی

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا، مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو مجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

روح بلبل نے خزاں بن کے اُجاڑا گلشن
پھول کہتے رہے ہم پھول ہیں صیاد نہیں

حسن سے چوک ہوئی اس کی ہے تاریخ گواہ
عشق سے بھول ہوئی ہو، یہ مجھے یاد نہیں

بربطِ ماہ پہ مضرابِ فغاں رکھ دی تھی
میں نے اک نغمہ سنایا تھا تمہیں یاد نہیں

لاؤ، اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

○

نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

اس وقت کی اداسی ہے دیکھنے کے قابل
جب کوئی رو رہا ہو افسردہ چاندنی میں

کچھ تو لطیف ہوتیں گھڑیاں مصیبتوں کی
تم ایک دن تو ملتے دو دن کی زندگی میں

ہنگامۂ تبسم ہے میری ہر خموشی
تم مسکرا رہے ہو دل کی شگفتگی میں

خالی پڑے ہوئے ہیں پھولوں کے سب صحیفے
رازِ چمن نہاں ہے کلیوں کی خامشی میں

نگاہیں رُخ میں دل میں سمائے جاتے ہیں — ہر ایک عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں
جو اُٹھ سکے تھے نہ خود حسن کے اُٹھانے سے — وہ پردہ ہائے دوئی اب اٹھائے جاتے ہیں
جو گر سکے تھے نہ خود عشق کے گرانے سے — وہ سب حجابِ محبت گرائے جاتے ہیں
چھپا چھپا کے جنھیں مصلحت نے رکھا تھا — وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں
سنبھل کے اے نگہِ شوق! بزمِ دوست ہے یہ — یہاں خراب نظر آزمائے جاتے ہیں
نہ پوچھ کارگہِ عشق کا طلسم نہ پوچھ — قدم قدم پہ تماشے دکھائے جاتے ہیں
پتہ نہیں کہیں ان کا اور ان کے دیوانے — تصورات کی محفل سجائے جاتے ہیں
کہاں کی لغزشِ پا اب یہ حال ہے ساقی — کہ سر سے تا بہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ میکدہ ہے کوئی مدرسہ نہیں واعظ! — یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں
یہ قصرِ حسن ہے آتش کدہ محبت کا — بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں
تمام عالمِ محسوس کانپ اُٹھتا ہے — جب آنکھ سے کہیں آنسو بہائے جاتے ہیں
ہمارا حال تو دیکھا، ہماری طرف بھی دیکھ — نگاہ اٹھتی نہیں غم اُٹھائے جاتے ہیں

تلاش لازمۂ عاشقی نہیں ساغر
نہ ڈھونڈنے پہ بھی وہ ہم میں پائے جاتے ہیں

○

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھ میں تجھ میں فرق نہیں، مجھ میں تجھ میں فرق ہے یہ
تو دنیا پر ہنستا ہے، دنیا مجھ پہ روتی ہے

اس معمورِ خرابے سے ضبط ذرا ہشیار رہے
دل کی ہر گہرائی میں ایک اچھوتا موتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں، بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے، ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے؟

دل کی تو تشخیص ہوئی، چارہ گروں سے پوچھوں گا
دل جب دھک دھک کرتا ہے، وہ حالت کیا ہوتی ہے

ساون آئے، پھول کھلے، اک افسردہ یہ بول اُٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ برکھا کب ہوتی ہے

ذرّے اور تارے مل کر جادو روز جگاتے ہیں
فطرت کی بیداری میں ساری دنیا سوتی ہے

رات کے آنسو اے ساغر پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

○

○

ساون کی رُت آپہنچی کالے بادل چھائیں گے
کلیاں رنگ میں چھلکیں گی پھولوں میں رس آئیں گے

ہاں! وہ ملنے آئیں گے رحم ہی کچھ فرمائیں گے
حسن اگر چنچل لے گا، پھر قاتل بن جائیں گے

نالے گھونٹ دھندلکے میں شام ہوئی رات آپہنچی
پریم کے سونے مندر میں آخر وہ کب آئیں گے

ہستی کی بدمستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی ہوش میں جس دن آئیں گے

میری آنکھیں کچھ بھی نہیں تیرے جلوے جلوے ہیں
تو جب سامنے آئے گا، پردے سے پڑ جائیں گے

تارے کتنے ہی چٹکیں، جگنو کتنے ہی چمکیں
شمع کی زردی کہتی ہے، رات گئے وہ آئیں گے

○

راتوں کو تصوّر ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
برسے ہوئے سچے موتی ہیں بہتا ہوا خالص سونا ہے

دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست! تجھے بھی کھونا ہے

تمییز کمال و نقص اٹھا یہ تو روشن ہے دنیا پر
میں چندن ہوں تو کندن ہے میں مٹی ہوں تو سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ اللہ! کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا، دراصل ہمارا رونا ہے

ماتم ہے مری آواز شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ بھی دیپک کے سروں میں رونا ہے

اختر انصاری

○

کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق دماغ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امید کرم اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کے نکبت کے احساس کو
بنا لیں کسی عامیانہ سے کوزے ہی کو جام جم اتنی فرصت کہاں

ہیں آزاد افکار لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا نہ مستقبل اپنا کچھ اس طور سے صرف امروز ہیں
غم دوش یا فکر فردا میں اختر کریں سر کو خم اتنی فرصت کہاں

○

کوئی ما آل محبت مجھے بتاؤ نہیں
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد سے ان کی مہک سے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لیے سنگھاؤ نہیں

محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رلاؤ نہیں

اجڑ کے پھر نہیں بستا جہان دل اختر
بہار باغ کو اس پہ دلیل لاؤ نہیں

○

بہار آئی زمانہ ہوا ہے ساقی
ہمارے دل میں بھی اک لہر کاش آجاتی

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن
سلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

مرے پڑوس میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

لگا کے سینے سے شادابیوں کو سو جاتا
مجھے بہارِ جوانی میں موت آجاتی

بجا رہا ہے کوئی رات میں ستار اختر
دھڑک رہی ہے مری آرزوؤں کی چھاتی

○

حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلّم کی
سمیٹ لائے فقط تلخیاں تبسّم کی

متاعِ صبر کو اشکوں کی نذر کر بیٹھے
ہمارے پاس جو دولت تھی ہم نے یوں گم کی

اُڑا لی رونقِ گلزارِ دل کے زخموں نے
بہار چھین لی داغوں نے بزمِ انجم کی

مغنیہ! یہ تری وجد بار موسیقی
ہے بازگشت مری روح کے ترنّم کی

خمارِ چشم سے پھوٹی لبوں تک آ پہنچی
لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسّم کی

پلا رہی ہیں نظر کو شرابِ دل افروز
یہ رُخ پہ بکھری ہوئی مستیاں تکلّم کی

ہم اس اُداس خموشی پہ مرتے ہیں اختر
نثار جس پہ ہیں رعنائیاں تکلّم کی

○

خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں — نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں

بنت دو تحفہ خزاں کی تباہ کاری کا — بساطِ عیش بچھاؤ بہار کے دن ہیں

عذابِ گل کی دہائی سے جلا کے کانٹوں کو — لگی دلوں کی بجھاؤ بہار کے دن ہیں

ملا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل — کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں

بھرے کٹورے چمن کے یہ درس دیتے ہیں — چھلکتے جام لنڈھاؤ بہار کے دن ہیں

اب احتیاط پسندی ہے کمی ناشکور — متاعِ ضبط لٹاؤ بہار کے دن ہیں

شرارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکاؤ — حسین فتنے جگاؤ بہار کے دن ہیں

جنونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف — کوئی دلیل نہ لاؤ بہار کے دن ہیں

پرانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے — نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں

لچک رہی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات — یہ بارِ ہستی کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اختر جاں دادۂ رخِ گل کو
امامِ وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

○

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی —— گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

شاد عارفی

بہ قولِ غالب ہوا کیا ہے "جو شہرِ دہقاں کے لہو کا"
نشیمنوں سے وہی تعلق ہے آج کل نظمِ شعلہ خو کا

ہجومِ حرماں میں کوئی موقع نہیں مغنّیِ خوش گلو کا
تمہیں مبارک۔ مگر مرے ہاں نہیں ہے مصرف خم و سبو کا

وہاں بہاروں سے باغبانوں کی سازشیں بار ور نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اُٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

یہ اگلے وقتوں کے رہنما۔ ان کی مصلحت پر نگاہ رکھیے
پٹے ہوئے راستوں پہ چل کر فریب دیتے ہیں جستجو کا

ہم اُن کے دعووں پہ ٹوپیاں کیوں اچھال دیں جو بے سیاست
ہوا کے جھونکے قدم کی آہٹ پہ رُخ بدلتے ہیں گفتگو کا

کسی کے ظاہر سے اس کے باطن پہ جائزہ سہل بھی نہیں ہے
شراب کی تلخیوں سے پہلے سوال آتا ہے رنگ و بُو کا

چمن میں پودوں کے سُوکھ جانے کی شکوہ سنجی کو طنز کہہ کر
کہاں کھلاتے، گلا دبا دیجے عندلیبانِ خوش گلو کا

جو بن بلائے تمہاری محفل میں آئے ہیں اُن کو کیا کہوں میں
وہ اس میں عزت سمجھ رہے ہیں تو ایسی عزت پہ میں نے تھوکا

جوان شاعر تو شاد ان وحشتوں سے دامن بچا چلے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانی و رفو کا

○

بنا پائی نہ ذرّے کو نگینا
تو پھر مصرف ترا اے چشمِ بینا

سرہانے کوئی رکھ جاتا ہے مینا
خدا کا نام لینا اور پینا

نظر ہے اور تماشائے بد و نیک
بُری اچھی بھی پڑتی ہے پینا

پسیجا ہے بتوں کا دل ہمیں پر
یہیں پتھر کو آیا ہے پسینا

نگینہ ہے دلِ بربادِ الفت
مگر جو ٹوٹ جائے وہ نگینا

حجاب آلودہ رخسارِ جوانی
دیا پھولوں کو شبنم نے پسینا

جہاں اندھے ادب کے پاسباں ہوں
وہاں کیا "عرضِ جوہر" کا قرینا

کہاں ہیں تجربہ کارانِ خلوت
دھڑکتا ہے مرا دل اس کا سینا

مرا مسلک ہے صلح و آشتی شاد
کمینہ ہے جو رکھے مجھ سے کینا

○

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

سحر کو شمع بجھانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں

روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں

وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

سراب بحر کی موجوں سے ناخدا ہو گا
اگر میں خون بہانے کی بات کرتا ہوں

وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

اس انجمن سے اٹھا ہوں کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں

دبی زباں سے گزارش ہے ناگوار اگر
تو کیا سوال اٹھانے کی بات کرتا ہوں

نقاب ہٹتے زمانہ نہ اٹھ سکے گی کہیں
گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں

تھکے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
بجھے ہوؤں کو سلگانے کی بات کرتا ہوں

○

موج کو آپ کنارا سمجھیں
ہم کو اس باب میں ہارا سمجھیں

آپ جیئے خون کو پارا سمجھیں
وہ سمجھتے ہیں اشارا سمجھیں

بے اصولی کو وہ پیارا سمجھیں
بزم سے مجھ کو سدھارا سمجھیں

یہ سمجھنا کوئی توہین نہیں
غلطی کر کے دوبارا سمجھیں

غالباً یہ تو نہ ممکن ہو گا
ہم تباہی کو نظارا سمجھیں

ہو کے آزاد ہوا اندازہ
جیتنے والے کو ہارا سمجھیں

فرصتِ عشق میسر ہی کہاں
اب کسے عشق کا مارا سمجھیں

اس سے پہلے کہ اجڑ جائے چمن
باغبانوں کو خدارا سمجھیں

حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں
اور دل میں ستم آرا سمجھیں

آگیا وقت کہ وہ گھبرا کر
پھول کو سرخ ستارا سمجھیں

واسطہ اُن سے پڑا ہے اے شاد

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاج غم دوراں ہے کوئی

ٹوکئے اس کو جو اس وقت غزلخواں ہے کوئی
جیل میں عشق لڑانے کا بھی امکاں ہے کوئی

اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رو پودے
ہم غریبوں کا بہر حال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رُسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

گل رخسار فسردہ ۔ نہ جبین عرق آلود
آپ کس طرح یہ کہتے ہیں پشیماں ہے کوئی

جاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھالا ساقی
شیخ صاحب ہیں یہ سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

حرص دربان کو آقا کا مصاحب مانے
ضمیر آقا کو سمجھتا ہے کہ درباں ہے کوئی

ضبط اظہار وفا کوئی بڑی بات نہیں
ضبط بہتان خطا سہل ہے آساں ہے کوئی

مجھ سے کافر کے یہاں شاد مکمل سرقہ
عسس شہر بڑا صاحب ایماں ہے کوئی

یہ سجدہ ہے کہ سجدہ بہ وفا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

تعین رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بیکسی کی انتہا ہے

ہماری جرأتوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا ۔ لیکن پسینہ آ گیا ہے

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا ۔ میں سمجھا رہنما ہے

برابر ہیں نقصان درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

بہ ہر حالت بتوں کو پُوجتے ہیں
بہ ہر صورت ۔ ہمارا بھی خدا ہے

یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

نہال سیوہاروی

○

اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ہوگا — وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا

وہ دھوم زمانے میں ترے جوشِ جنوں کی — وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا

سنتے تو نہ تھے وہ تجلی کی حکایت — وہ تذکرۂ داغِ جگر یاد تو ہوگا

ہر گام پہ وہ حسن کی پُر ہوش نگاہیں — وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا

ہر مرحلۂ دنیائے محبت میں تغیّر — ہر سانس میں وہ رنگِ دگر یاد تو ہوگا

وہ دل کو ترے حسنِ دل آرا سے تعلق — وہ خاک سے بیزار نظر یاد تو ہوگا

وہ ناز کہ جو سر سے اک بے خبری سی — وہ طعنۂ ہر اہلِ خبر یاد تو ہوگا

وہ دیدۂ کہ تھا وہ کشِ آرائشِ گیتی — پہروں طرفِ راہگزر یاد تو ہوگا

وہ حسن کے جذبات کا بھرپور تلاطم — طوفان کی موجوں میں گزر یاد تو ہوگا

گم کردہ سکوں پا کے مجھے اپنی گلی میں — کہنا وہ تجاہل سے "کدھر؟" یاد تو ہوگا

بھولی تو نہ ہوگی مری الفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ہوگا

○

ہے کدھر وہ سلسلۂ کرم ہے کہاں وہ ساقیٔ نیک خو
کہ یہاں ہے میکدہ تشنگی سے پکارتا ہے سبو سبو

ہوں ازل سے راہروِ طلب یہ ندائے غیب ہے روز و شب
ابھی اور چل ابھی اور چل یہی جستجو یہی جستجو

تری حکمتوں کی خبر کہاں جو ہو پردہ در وہ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظرِ گلستاں نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہوں حدیں تمام خیال کی نہ ہو شرح تیرے جمال کی
جو ازل سے تا بہ ابد رہے یہی تذکرہ یہی گفتگو

مری چار دن کی یہ زندگی اسی ذوق و شوق میں کٹ گئی
کبھی یہ حکایتِ آرزو کبھی وہ حکایتِ آرزو

ترا جلوہ رونقِ بحر و بر تو ہر ایک خوب سے خوب تر
کبھی اپنی سمت نگاہ کر کہ فروغِ بزمِ جہاں ہے تو

ترے ولولے ہیں اگر جواں ہو برنگِ سیلِ رواں دواں
کہ ہے ننگِ ہمتِ آدمی روشِ قناعتِ آب جو

ستمِ زمانہ سے تجھ کو رم ہیں فدائے لذتِ ہر الم
تجھے آشیاں کی تلاش ہے مجھے بجلیوں کی ہے جستجو

نہال

○

دھوم کتنی ہے یہ عالم ہے طوفانوں کی
ایک ہلکی سی تڑپ ہے مرے ارمانوں کی

یہی بے لوث محبت یہی غمخواریٔ خلق
اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی

اے مری ہمتِ مردانہ تری عمر دراز
توڑ ڈالی ہے کلائی کئی طوفانوں کی

آج کچھ لوگ وہاں جمع تھے باچشمِ پُرآب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

کس قدر عام ہے اس دہر میں احساسِ حیات
رگِ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغازِ شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

بات کب سنتے ہیں دنیا کی ترے دیوانے
نہ سنے بات یہ دنیا ترے دیوانوں کی

جس قدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعتِ فکر
عقل رکھتی ہے بنائیں نئے زندانوں کی

اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں
کہ نگاہیں طرفِ شمع ہیں پروانوں کی

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی

○

عبث ہے گرم تلاشِ اثر فغاں کے لیے
فغاں ہے سینۂ سوزاں کے امتحاں کے لیے

اُڑا لیے ہیں کچھ اربابِ گلستاں نے تو کیا
ہزار شیوۂ نو ہیں مری فغاں کے لیے

زمینِ کوچۂ جاناں سے آ رہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

ہے ختم حوصلہ مندی وجودِ آدم پر
ستیزہ کار ہے فتحِ عجم جہاں کے لیے

چمن کی سرد ہواؤں نے دی مجھے تسکین
میں دل گرفتہ ہوا جب سکونِ جاں کے لیے

الٰہی محفلِ انجم میں جلوہ گر ہے کون
یہ چاندنی نے کیا کھیت کس جواں کے لیے

ہے سخت بے ادبی گر کہے فسانۂ عشق
ہر ایک بات مناسب نہیں زباں کے لیے

اندھیری رات، تھکی ہمتیں، کڑی منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

سجائی فکرِ درخشاں نے میری بزمِ نجوم
تھی منتظر یہ زمیں نازِ آسماں کے لیے

بہار کا رنگ بھی نگاہوں میں اک فریب بہار سا ہے
حیات میں دلکشی نہیں ہے حیات میں انتشار سا ہے

زمانہ کیا دیکھئے دکھائے نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور میں خشمگیں ہے زمیں کے دل میں غبار سا ہے

کہاں کی بیگانگی تو جب سے رہے نہ احساس جیب و دامن
اگر ہے احساس جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

کچھ آج ایسی بری بھی یہ گزری دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
بڑے سنبھالے تھما تھا دل میں وہ نالہ بے اختیار سا ہے

الٰہی امید وفا نہ توڑو سیاست دلبری نہ چھوڑو
کبھی جو فردوس رنگ و بو تھا وہ ایک اجڑا دیار سا ہے

نہال رندی ہے مستی بے معرفت لازم ہے یقینی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

○

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے — کیا سے کیا یہ مئے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گزاری ہے غم عشق و محبت میں حیات — کچھ بسر و غم ایام ہوئی جاتی ہے

ہوتا جاتا ہے یہ عالم ہمہ تن عالم درد — خلش غم خلش عام ہوئی جاتی ہے

آ چلا پیر مغاں وقت چراغان حیات — زرد ہے مہر مبیں شام ہوئی جاتی ہے

ہوس سیر و تماشا ہے کہ ہوتی نہیں ختم — زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

کن حقائق پہ نظر اب ہے کہ یہ بزم وجود — اک صنم خانہ اوہام ہوئی جاتی ہے

صحبت پیر مغاں میں یہ کھلی عظمت عشق — عقل بھی دُرد تہ جام ہوئی جاتی ہے

المدد المدد اے نیر اقبال و عروج — تیرہ بختوں کی سحر شام ہوئی جاتی ہے

العجب العجب اے ہمت مردانہ کہ تو — شاکی گردش ایام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو شکل در و دیوار ہے اور — کتنی رنگین مری شام ہوئی جاتی ہے

کیوں نہ وجد آئے تری نکتہ طرازی پہ نہال
غزل اک نغمۂ الہام ہوئی جاتی ہے

○

اسرار الحق مجاز

○

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کی اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

○

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں
یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
بھی ہے حسن، مگر عشق کا جواب نہیں
مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں
جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں
یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں
یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسین انکھڑیوں میں خواب نہیں
نہ پوچھیے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں
سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں
مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبت بھی کامیاب نہیں

[illegible]ازِ تمنا پہ عتاب اور زیادہ
[illegible]اں میری محبت کا جواب اور زیادہ

[illegible]وش نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
[illegible]ونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

[illegible]زادہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
[illegible]نے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

[illegible]ٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
[illegible]یکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

[illegible]پکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
[illegible]ھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ

[illegible]وگی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
[illegible]ئے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیِ فیاض شراب اور زیادہ

○

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

○

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

روداد غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

○

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

[illegible]

معین احسن جذبی

○

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یوں ہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اُجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے مری دیوانگی کو غیرت آئے
ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سینکڑوں ناسور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دیئے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیِ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

○

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پہ کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں سے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دنیا
وہی نغمہ گل تک فغاں ہو نہ جائے

جسے سازِ دوراں پہ گانا نہ آیا
وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں
وہ سجدہ بھی نذرِ بتاں ہو نہ جائے

نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ تارے ہی چمکیں
مرا غم غمِ دو جہاں ہو نہ جائے

احمد ندیم قاسمی

○

افق نہاں ہے تو حسنِ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوس، گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور ناصحِ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بیچارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کیے، چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

○

مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جُو تو نہیں

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بُو تو نہیں

پگھل پگھل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

یہ سب درست شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

افق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا تھا ندیم
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جُو تو نہیں

میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی
زمیں پہ یہ ستارے کبھی اتارو بھی

مری غیور امنگو شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہے تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
ذرا اس نقش گرو! اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھیں لیکن
نقاب اٹھاؤ نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

○

بگاڑ ہو کہ بناؤ عجیب ترے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلائیں تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قرنہ دکھاؤ بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے مری حسین خطاؤ

ادھر شباب کا مس ہے اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

○

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے ‌ ‌ ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں ‌ ‌ آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کون تھے آخر جو منزل کے قریب ‌ ‌ آئنے کی چادریں پھیلا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب ‌ ‌ کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا ‌ ‌ اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے
اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب ‌ ‌ اک پہیلی بن کے ہر سو چھا گئے
پھر وہی اختر شماری کا نظام ‌ ‌ ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے
رہنماؤ رات ابھی باقی سہی ‌ ‌ آج سیارے اگر ٹکرا گئے
جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار ‌ ‌ وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے
کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد ‌ ‌ لیجئے! اگلے زمانے آگئے
آدمی کے ارتقا کا مدعا ‌ ‌ وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

○

بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہجوم گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بفیضِ لذتِ تخلیق خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں گھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئنہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب یہ تارے یہ شہر لالہ و گل
ابھی وہ آ نہ چکے اور رات جاتی ہے

○

عدم

○

اُن مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اس حرفِ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اے مرگِ ناگہاں
اُس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدم کس گریز سے
اُس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

○

غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں، مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا، وہ رنگ برسے، وہ کیف جاگا، وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے، تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں میں ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو، تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو، یہ ہلکی ہلکی سی دلنشیں بُو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس ایک پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدم خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
ادھر بھی سورج نکل رہا ہے، اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

○

یہ کیسی سرگوشیٔ ازل سازِ دل کے پردے ہلا رہی ہے
مری سماعت کھنک رہی ہے کہ تیری آواز آ رہی ہے

حوادثِ روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی تری نظر اعتبارِ مستی
بہار اقرار کر رہی ہے شراب ایمان لا رہی ہے

فسانہ خواں دیکھنا شبِ زندگی کا انجام تو نہیں ہے
کہ شمع کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھے بھی کچھ نیند آ رہی ہے

اگر کوئی خاص چیز ہوتی تو خیر دامن بھگو بھی لیتے
شراب سے تو بہت پرانے مذاق کی باس آ رہی ہے

خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے عدم کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روشن روش ہی آخر دلوں کو رستے دکھا رہی ہے

○

پھولوں کی ٹہنیوں پہ نشیمن بنائیے
بجلی گرے تو جشنِ چراغاں منائیے

کلیوں کے انگ انگ میں میٹھا سا درد ہے
بیمار نکہتوں کو ذرا گدگدائیے

کب سے سلگ رہی ہے جوانی کی گرم رات
زلفیں بکھیر کر مرے پہلو میں آئیے

بہکی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ
جی چاہتا ہے شامِ ابد تک تو جائیے

ناسازیٔ حیات بھی ہے اک نشاطِ تلخ
حالات کی روش پہ ذرا مسکرائیے

سن کر جسے حواس میں ٹھنڈک سی آئے
ایسی کوئی اداس کہانی سنائیے

رستے میں ہر قدم پہ خرابات ہے عدم
یہ حال ہو تو کس طرح دامن بچائیے

سیف الدّین سیف

○

دلوں کو توڑنے والو تمھیں کسی سے کیا
ملو تو آنکھ چرالو تمھیں کسی سے کیا

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمھیں؟
تم اپنی چال سنبھالو تمھیں کسی سے کیا

چمک کے اور بڑھاؤ مری سیہ بختی
کسی کے گھر کے اُجالو تمھیں کسی سے کیا

نظر بچا کے گزر جاؤ میری تربت سے
کسی پہ خاک نہ ڈالو تمھیں کسی سے کیا

مجھے خود اپنی نظر میں بنا کے بیگانہ
جہاں کو اپنا بنالو تمھیں کسی سے کیا

قریبِ نزع بھی کیوں چین لے سکے کوئی
نقاب رُخ سے اُٹھالو تمھیں کسی سے کیا

○

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں
کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں

تری نگاہ سے بدلی ہے کس طرح دُنیا
جو دل کشی تھی خزاں میں بہار میں بھی نہیں

بھڑک اُٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی
قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

عجب سکون کا عالم ہے یاس کا عالم
یہ دل کشی تو غمِ انتظار میں بھی نہیں

ہلاک جبرِ مسلسل یہی سمجھتے ہیں
نظامِ دہر ترے اختیار میں بھی نہیں

قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
قضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

عروس شام ابھی گیسوؤں کے سائے میں
کنیز بن کے کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس اڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دم فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان! ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیف حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

○

سیف

بڑے غضب میں ہے جشنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی محفل اسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیِ چشمِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے اب زلفِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں
تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

ہمیں تو شعلۂ خرمن فروز بھی نہ ملا
تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے

خیالِ منزلِ مقصد سے منزلوں آگے
نگاہ گردِ پسِ کارواں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو
وہ کاہش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیفؔ وہاں ہم علاجِ غم کے لیے
دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

ظہیر کاشمیری

○

اب صاحبِ دوراں آتے ہیں اب فاتحِ میداں آتے ہیں
وہ شہر تو شبیرِ قاتل تھے، اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

آہنگِ تفنگ و تیر ہیں ہم، گاتے ہیں سرودِ آزادی
ہنگامۂ دار و گیر ہیں ہم، سرمست و غزل خواں آتے ہیں

جو تند بگولوں سے اُلجھے، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے، اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

ہم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
اس بزم میں خنجر در دامن جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اُجالا برسے گا
ہم لوگ برنگِ نورِ سحر اے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبّوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس دھج سے اجل کے چہرے پر ہم خونِ شہیداں آتے ہیں

○

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہشِ بے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا ترے آنے سے بھی آباد نہیں

حسن تنہائی سے گھبرائے تو اتنا کہہ دو
عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہِ شکستِ دل تھی
اب نگاہِ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا دل ترے جلووں سے نہیں صاعقہ بار
کون سی بزم تری یاد سے آباد نہیں

ہم نہ سوچیں گے کبھی کوہ کنی کی تدبیر
قسمتِ عشق اگر تیشۂ فرہاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے عذرِ جفا کا پہلو
تیری محفل میں کوئی صورتِ فریاد نہیں

شب مہتاب بھی اپنی، بھری برسات بھی اپنی
تمہارے دم قدم سے زندگی تھی زندگی اپنی

یہاں پابندیٔ ناز و جنوں کی بات ہے ورنہ
جمالِ یار سے کچھ کم نہیں تابندگی اپنی

مجھے شادابیٔ صحنِ چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

تمہارا غم اسے آشوبِ صرصر سے بچائے گا
ہواؤں سے بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگی اپنی

گر تم بھی تو اک بوئے گریزاں کی طرح نکلے
گزرنے کو گزر جاتی بہارِ دوستی اپنی

ظہیرؔ اس چشمکِ اول پہ یوں محسوس ہوتا ہے
بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

○

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم کفن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دلِ بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحومِ تمنا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زریں گراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیرؔ
حسن پر سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

○

○

ابھی تو کاوشِ بوئے بہار باقی ہے
ابھی تجسسِ دامانِ یار باقی ہے

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والے
ستارہ ہائے سحر کا شمار باقی ہے

تمھارے ساتھ غمِ دوستی گزر ہی گیا
تمھارے بعد غمِ روزگار باقی ہے

ابھی سے تذکرۂ دل پہ وہ بگڑ بیٹھے
ابھی تو قصۂ منصور و دار باقی ہے

ظہیر اب بھی امیرانِ شہر کے سر میں
شرابِ نیم شبی کا خمار باقی ہے

○

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی ہے

غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے

زخمِ سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
عظمتِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی ہے

دلِ پرخوں سے کہو حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے

ابھی خونابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر! اک نئی افتاد ابھی باقی ہے

بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی ہے

دلِ مرحوم کی خاموش صداؤں میں ظہیر
اک سسکتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیل شفائی

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
دیکھی ہے میں نے آنکھ جھکی پھر آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر راج کریں؟
آپ سے مجھ کو شکوہ ہے خود آپ نے بے پروائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

○

پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جائیے
پھر جو نگاہِ یار کہے مان جائیے

پا بوسیِ جمال بھی حسنِ طلب سہی
جوشِ طلب میں تا بگریبان جائیے

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے

یا بے رخی سے دیجیے دادِ سپردگی!
یا سادگی سے ہو کے پشیمان جائیے

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

اپنی غزل قتیل وہ کوئل کی کوک ہے
جس کی تڑپ کو دور سے پہچان جائیے

چمن کی آبرو بن کر صبا کے ساتھ چلتے ہیں
سبک رفتار ہیں لیکن ادا کے ساتھ چلتے ہیں

عجب کیا ہے جو منزل کا تصوّر ہی بدل جائے
مسافر بے رخی سے رہنما کے ساتھ چلتے ہیں

خدا جانے کہاں ٹھہریں گے جا کر ولولے دل کے
یہ دیوانے تو رہوارِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

ستارے ڈوب جائیں یا افق سے آفتاب ابھرے
اندھیرے تو بہر صورت ضیا کے ساتھ چلتے ہیں

دمِ رخصت ہم اپنے آنسوؤں کو روک بھی لیتے
مگر یہ کاروان تیری رضا کے ساتھ چلتے ہیں

قتیل اس بے مروت کے نہ چھیڑو تذکرے ہم سے
یہ وہ نشتر ہیں جو ذکرِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

○

اندیشۂ اربابِ حرم ساتھ رہے گا
جنت بھی ملے گی تو یہ غم ساتھ رہے گا

پیاسے ہی گزر جائیں گے ہم راہِ طلب سے
عبرت کے لیے ساغرِ جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ آئے درِ زندانِ وفا تک
مر کر بھی یہ غم تیری قسم ساتھ رہے گا

افلاک سے پلکوں پہ اتر آئیں گے تارے
کھل کر بھی شبِ غم کا بھرم ساتھ رہے گا

منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلی
ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

میخانہ بہت دور نہیں دیدۂ [illegible] سے
آ گردشِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

راہوں میں قتیل آئیں گے سو آئنہ خانے
لیکن مرا گلپوشِ قلم ساتھ رہے گا

○

ساحر لدھیانوی

○

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

ہرچند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

○

طرب زاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خون اُگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ہمیں یہ فکر اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی
اُنھیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

○

عقائد وہم ہیں مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

تجھے اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

○

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات ساغر سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بام حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکس شعور محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغ محفل جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نئے جہاں بسائے ہیں فکر آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگ شادی و غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مجروح سلطان پوری

○

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

○

اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل
شرابِ خام پئیں رقصِ ناتمام کریں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

غمِ جہاں کو صنم دل بنا کے کچھ نہ ملا
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی
پیامِ زیر لبی کو صلائے عام کریں

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار
رخِ نگار کی ضو سے فروغِ بام کریں

پھر اٹھ کے گرم کریں کاروبارِ زلف و جنوں
پھر اپنے ساتھ اسے بھی اسیرِ دام کریں

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گُل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلانوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

○

لیے بیٹھا ہے دل اک عزمِ بے باکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

دلِ سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی
نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

○

شکیل بدایونی

○

مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

وہ اگر برا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بو میں
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

مجھے تجھ سے خاص نسبت میں رہینِ موجِ طوفاں
جنھیں زندگی تھی پیاری انھیں مل گیا کنارا

مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے
وہی بات پوچھتے ہیں جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیل دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

○

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل
زندگی ہی زندگی ہے آج کل

ان کا ذکر ان کی تمنا ان کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

جل رہی ہے دل میں شمعِ آرزو
غمکدے میں روشنی ہے آج کل

تو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

عرضِ غم پر مسکراتے بھی نہیں
برہمی سی برہمی ہے آج کل

حاصلِ ترکِ محبت دیکھنا
انجمن سونی پڑی ہے آج کل

دل میں اور مایوسیوں میں اے شکیل
اتحادِ باہمی ہے آج کل

پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ

سما کر مجھ میں وہ جانِ شباب آہستہ آہستہ
بنا دے گا مجھے اپنا جواب آہستہ آہستہ

یہ محفل زاہدانِ خشک کی محفل ہے اے رندو!
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ

مری نظریں بھی گو رفتہ رفتہ بھولے جاتی ہیں
ہوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ

شکیل اس درجہ مایوسی شروعِ عشق میں کیسی
ابھی تو اور ہونا ہے خراب آہستہ آہستہ

○

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انھیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبرِ شباب ہے نہ وہ رنگِ قہرِ عتاب ہے
دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

○

○

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبت آئینہ ہو چکی تھی وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُن کو کہاں سے پہلے

مسرتیں رازدارِ غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
جبھی تو صحنِ چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

[illegible] رہا تھا کہ ناامیدی نہ پردہ دارِ امید ہوگی
نظر اٹھا کر جو میں نے دیکھا غبار تھا کارواں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام میکش پکار اٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

قسم فریبِ نگاہ و دل کی ہمیں جو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید لکھے ہوئے تھے شکیل قسمت میں جورِ پیہم
کھلیں جو آنکھیں اس انجمن میں نظر ملی آسماں سے پہلے

○

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

خوشی نہ غم کی نہ غم خوشی کا عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغِ افسردۂ محبت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے

اہانتِ چشمِ مست ہے یہ کہ ہوش چھا جائے بےخودی پر
نظر اٹھا کر تو دیکھ ساقی یہ کون گر کر سنبھل رہا ہے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

کہاں یہ مستی کی وارداتیں کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے

شکیل تفسیرِ شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو ہے بس اتنی
جو نالہ سینے میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

فضل احمد کریم فضلی

تمہیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں

حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کماں اور بھی ہیں

سبھی کو محبت میں ہوتے ہیں صدمے
ابھی کیا ابھی امتحاں اور بھی ہیں

چلو دھوم سے جشنِ ماتم منائیں
ہمیں اک نہیں نوحہ خواں اور بھی ہیں

نہیں ختم کچھ آسماں پر خدائی
مرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں

نقاب اس نے رخ سے اٹھائی تو لیکن
حجاباتِ کچھ درمیاں اور بھی ہیں

فریبِ کرم اک تو ان کا ہے اس پر
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں

وفا ان سے اپنی جتانے گئے تھے
مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں

نہیں صبر ہی کی کمی تجھ میں فضلی
مری جان کچھ خامیاں اور بھی ہیں

○

بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں
ہماری تنگ دامانی کے دن ہیں

عنادل کی غزل خوانی کے دن ہیں
گلوں کی چاک دامانی کے دن ہیں

جدھر دیکھو کھلے ہیں لالہ و گل
یہ خونِ دل کی ارزانی کے دن ہیں

ہوا دامانِ گل دامانِ یوسف
نظر کی پاک دامانی کے دن ہیں

سبک رو ہے نسیم روح پرور
مگر پھر بھی گراں جانی کے دن ہیں

دلِ پر درد امڈا آ رہا ہے
یہ بحرِ غم میں طغیانی کے دن ہیں

یہی دن ماحصل ہیں زندگی کے
یہی، جو دل کی نادانی کے دن ہیں

جمالِ زندگی کی خیر یا رب
کمالِ عقلِ انسانی کے دن ہیں

غزل پاکیزہ ہے فضلی ابھی تک
یہ دن ہر چند عریانی کے دن ہیں

فضلی

○

پھر ایسے خیالات آنے لگے
کہ ہم خود بخود گنگنانے لگے

بہار تمہارا عجب حال ہے
نظارے بھی مسکرانے لگے

جوانی کی اللہ رے سرشاریاں
قدم خود بخود ڈگمگانے لگے

اندھیرا اندھیرا سا چھانے لگا
مرے پاس سے جب وہ جانے لگے

یونہی عمر گزرے گی امید میں
وہ کاہے کو تشریف لانے لگے

اکیلے میں گاتے تھے میری غزل
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے

ترا روٹھنا ہے یہ بے فائدہ
تجھے کیوں وہ فضلی منانے لگے

○

آغاز شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا
یہ گریۂ بے سبب ہے پیارے

اپنے ہاتھوں سے تو پلا دے
پینے کا مزہ تو جب ہے پیارے

اک آگ جلائے دے رہی ہے
دل جیسے ابولہب ہے پیارے

پھر بعد میں آکے کیا کرے گا
آنے کا تو وقت اب ہے پیارے

کیا حال کہوں، کرم ہے تیرا
آگے حدِ ادب ہے پیارے

کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی
کیوں خندۂ زیرِ لب ہے پیارے

بے بات کی بات پر بگڑنا
غصہ تیرا غضب ہے پیارے

یہ پھول سے کہہ رہی ہے شبنم
کیوں ہنستا ہے کیا سبب ہے پیارے

اپنے فضلی سے جو خفا ہو
اس کا کوئی سبب ہے پیارے

فضلی

اب وہ ہلکی ہوئی سی رات نہیں
بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں

پھر وہی جاگنا ہے دن کی طرح
رات ہے اور جیسے رات نہیں

بات اپنی تھیں نہ یاد رہی
غیر جانے دو، کوئی بات نہیں

کچھ نہیں ہے تو یاد ہے اُن کی
ان سے ترکِ تعلقات نہیں

پھر بھی دل کو بڑی اُمیدیں ہیں
گو بظاہر توقعات نہیں

عشق ہوتا ہے خود بخود پیدا
عشق کے کچھ لوازمات نہیں

ایسے فضلی کے شعر کم ہوں گے
جن میں کچھ دل کی واردات نہیں

○

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام
شعر بھی اک طرح کا ہے الہام

عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس کے آگے ہے بس خدا کا نام

کام ان کا ہے دیں نہ دیر انعام
چاہیے ہم کو اپنے کام سے کام

زندگی ہے ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی نہ کوئی صبح، نہ شام

راہرو تھک کے رہ گئے آخر
زندگی تھی کچھ ایسی تیز خرام

زلفِ دوراں سنوارنے والے
ہیں بڑی چیز عاشقانِ کرام

گر تمنا نہیں تو حسرت ہے
کیا ہوا کاروبارِ شوق تمام

میں نے مانا کہ ہوں تہی ساغر
شکر صد شکر ہے تو ہاتھ میں جام

لو مبارک ہو تم کو اے فضلی
اب وہ لیتے نہیں تمہارا نام

○

ناصر کاظمی

○

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا — حسن خود محوِ تماشا ہوگا

سن کے آوازۂ زنجیرِ صبا — قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

جرسِ شوق اگر ساتھ رہی — ہر نفس شہپرِ عنقا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا — ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

کون دیکھے گا طلوعِ خورشید — ذرہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں — ہم سا بیدرد کوئی کیا ہوگا

پھر سلگنے لگا صحرائے خیال — ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا

پھر کسی دھیان کے صد راہے پر — دلِ حیرت زدہ تنہا ہوگا

سرِ روش رنگ بہتے ہوں گے — عالمِ خاک شفق زا ہوگا

پھر کسی صبحِ طرب کا جادو — پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں — جشنِ رامش گری برپا ہوگا

پھر نئی رت کا اشارا پا کر — وہ سمن بو چمن آرا ہوگا

گلِ شب تاب کی خوشبو لے کر — ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید — نکہتِ گل کا بسیرا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی — اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

تجھ کو ہر پھول میں عریاں سوتے — چاندنی رات نے دیکھا ہوگا

دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں — پتہ پتہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

○

دل ہوا پھر درِ میخانۂ گل — پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن — پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری — لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے — میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارا پا کر — چاند نکلا سرِ میخانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا — سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا — اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں — ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے — ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کل ترا دور تھا اے بادِ صبا — ہم ہیں اب سرخیٔ افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

○

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سن

ہر نفس دامِ گرفتاری ہے
تو گرفتارِ بلا غور سے سن

دل تڑپ اٹھتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سن

اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال
رہروِ آبلہ پا غور سے سن

اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سن

کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سن

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ مری بزم میں آ غور سے سن

کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سن

ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لے کو ذرا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سن

رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن

خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سن

آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سن

عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

ہر قدم راہِ طلب میں ناصر
جرسِ دل کی صدا غور سے سن

○

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشۂ خواب گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

ابنِ انشا

○

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا، کام ہُوا بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بیچاروں کا

جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلا لگا ہے نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کی نصیحت وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو اُن پیاروں کا

○

سانحہ ہم پر یہ پہلا ہے مری جاں کوئی — ایسے دامن سے ملا آہے گریباں کوئی
قیس صاحب کا تو اس غم میں عجب حال ہُوا — اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی
ہم نے اپنے کو کوئی دیر سنبھالا ہوتا — آن نکلے اگر آنسو سرِ مژگاں کوئی
یارو اس دردِ محبت کی دوا بتلاؤ — ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی
یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا — ان سے چھوٹی ہے بھلا خوئے غزالاں کوئی
ہم کسی سمت بھی نکلیں وہیں جا کر نکلیں — ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی
ابتری یاد میں روئیں گے نہ حیراں ہوں گے — ان سے پیماں ہے کوئی دل سے ہے پیماں کوئی
سونی راتوں میں سرِ بسترِ خوابِ راحت — بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی
بھیگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تنہا — کھویا کھویا نظر آتا ہے خراماں کوئی
دوستو! دوستو! اس شخص کو جا کر ڈھونڈو — اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آیا اس خانۂ ویراں میں بھی مہماں کوئی

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاؔ جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گناہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں، لیکن بھری بہار کے بیچ؟

اے سیمو! اے خوش نظرو! اک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہر نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گل خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منت قاصد کون اٹھائے، شکوہ درباں کون کرے
نامہ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کریں — نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم بھی آنکھ جھپک لیں، سو لیں۔ اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سنا ہے تم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پیت کا کاروبار بہت ہے اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

انشاؔ جی ہم نظم کے شاعر، پھر بھی — خیر جو ہیں سو ہیں
کام کی بات غزل میں کہنا سب کے بس کی بات نہیں

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگائی تھی من میں — اب من کا اجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

جی گھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں، ہر نیر ندی بن بہتے ہیں — اس برکھا سے جی کی آگ بجھے؟ یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

کبھی بول مدھو بھی من بھول گئی، ہم تم ہیں، ملے آئے — اس من کو نہ لوگو بھٹکاؤ، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا روپ نہیں ہوتا، ہر روپ کو نام نہیں دیتے — کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں کچھ روپ ہیں اپنے درپن میں

کبھی من کے ابھتا میں آؤ، وہ مورتیں تم کو دکھلائیں — وہ مورتیں تم کو دکھلائیں، ہم کھو گئے جن کے درشن میں

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیو! — سبھی باتیں کہ اپنے شیام میں تھیں، اب دیکھ لو اس موہن میں

ہر ایک پہ نظریں اٹھتی تھیں، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا — اس شہر میں روپ کا کال نہیں، کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

بازاروں میں چکا لیے ملتے ہیں، یا بیت کے مارے ملتے ہیں — کچھ پورب میں کچھ پچھم میں، کچھ اتر میں، کچھ دکھن میں

شہروں میں پھرے سنیاس لیے، جو تاکے تیئیں بھگوان کہے — انشا سا کوئی نہ دیکھا، کہنے کو ہیں جوگی ہر بن میں

اس حسن کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے — وہی رنگ حنا، وہی بند قبا، وہی بوٹوں کھلے پیراہن میں

ہم لوگ کہیں آنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے — کبھی پھول بھی دیکھے غرفوں میں، کبھی قوس قزح کسی چلمن میں

ہم ان سے جو مل کر دور ہوئے، مجبور ہوئے، رنجور ہوئے — اب دن کا کاٹنا مشکل ہے، یاں جان رہے گی الجھن میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شب ماہ کا لطف گنوا ڈالا — اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو، پھر رات ہے ہر ہر روزن میں

کبھی میر فقیر کی بیتوں سے کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی

ان برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

○

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں کی

سر زانو پہ رکھے ہوئے کیا سوچ رہی ہو
کچھ بات سمجھتی ہو محبت زدگاں کی

تم میری طرف دیکھ کے چپ ہو سی گئی تھیں
وہ ساعت خوش وقت نشاط گزراں کی

اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایان تمنا
اک رات ہے مہتاب کے ایام جواں کی

اب اور ہی حالت ہے مگر جان تمنا
ہم نالہ کشاں رہے گنہاں غم زدگاں کی

اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے ہوئے تارو
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے یہاں کی؟

برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب تو پیارو
بس بات سنی راہ چلا کاہکشاں کی

انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی

مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

اے دوستو اے دوستو اے درد نصیبو
گلیوں میں چلو سیر کریں شہر بتاں کی

ہم جائیں کسی سمت کسی چوک پہ ٹھہریں
کہنا نہ کوئی بات کسی سود و زیاں کی

انشا کی غزل سن لو پہ رنجور نہ ہونا
دیوانہ ہے دیوانے نے اک بات بیاں کی

ہوتا ہے یہی عشق میں ہستیا رسبھی کا
باتیں یہی دیکھی ہیں محبت زدگاں کی

(ل)

آنند نرائن مُلّا

چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ
آ یہاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ

اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
اے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ

مے رنگیں پسِ مینا سے اشارے کب تک
ایک دن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ

حسن کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ

تو بدل دے نہ کہیں جوہرِ انساں کا بھی رنگ
اے زمانے کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ

دیکھ کیا دام لگاتی ہے نگاہِ مُلّا
غنچۂ تر! تو کبھی دستِ گُل افروش میں آ

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا، آئی سحر یا وقتِ شام آیا

زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا

اٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پر وہ گام آیا
محبت میں نری ترکِ محبت کا مقام آیا

اسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

ذرا لَو اور دل کی تیز کر سیلا سا یہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا

توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا، شیخ کوثر لے اڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا مُلّا کا جام آیا

روشؔ صدیقی

اس سے بڑھکر تو کوئی بے سروساماں نہ ملا
دل ملا جس کو مگر دردِ غریباں نہ ملا

اک ذرا ذوقِ تجسس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

تلخیٔ بادۂ اندوہ و وفا کیا کم ہے
اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا

کرلیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا

اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بُت کدے میں بھی وہ غارتگرِ ایماں نہ ملا

نسبتِ پائے نگاریں ہے یہ اے موجِ نسیم
خاک سے سلسلۂ لالہ و ریحاں نہ ملا

بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اسے یزداں جسے انساں نہ ملا

ان سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

○

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھکر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھکر

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہے بہشت؟
حیراں ہوں صورتِ درودیوار دیکھکر

بادہ بقدرِ ظرف سہی رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مے خوار دیکھکر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھکر

شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اب حشر تک حجاب نشیں ہے نگاہِ شوق
چھپنا تھا رنگِ حسرتِ دیدار دیکھ کر

رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمعِ صبح کے آثار دیکھکر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے روشؔ
اُس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھکر

میراجی

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دُنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا
چُپکے چُپکے بہا کر آنسو، دل کے دکھ کو دھونا ہوگا

بیرن ریت بڑی دُنیا کی، آنکھ سے ٹپکا جو بھی موتی
پلکوں ہی سے اُٹھانا ہوگا، پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

پیاروں سے مل جائیں پیارے، اَن ہونی کب ہونی ہوگی
کانٹے پھول بنیں گے کیسے، کب سُکھ سیج بچھونا ہوگا

بہتے بہتے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہوگا

میراجی کیوں سوچ ستائے، پل پل ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے اپنے دل میں سمونا ہوگا

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں!
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گذری اُن کے سہارے گذری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں!

ایک ٹھکانا آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے!
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں، باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادیٔ ہمہ ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

جوش ملسیانی

○

تری یاد میں کب قیامت نہ ٹوٹی تجھے ہم نے کب حشر برپا نہ دیکھا
بجز اک نگاہِ مسیحا نفس کے محبت کے ماروں نے کیا کیا نہ دیکھا

بہت سیر کی باغِ جنت کی ہم نے مگر کچھ مزا زندگی کا نہ دیکھا
کسی دل میں دردِ محبت نہ پایا کسی دل میں داغِ تمنا نہ دیکھا

جنونِ محبت میں دیوانگی میں تری بے رخی کا بھی ہے قدرداں ہوں
بڑا تو نے احسان مجھ پر کیا یہ تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا!

ترے آستاں کا پتہ کس سے پائیں کرے رہبری کون بھٹکے ہوؤں کی
یہ راہِ طلب ہے کہ راہِ عدم ہے کسی کا بھی نقشِ کفِ پا نہ دیکھا

محبت کہاں یہ تو بیچارگی ہے ستم بھی سہیں پھر کرم اس کو سمجھیں
یہ جبر اس لئے کرلیا ہے گوارا کہ اس کے سوا کوئی چارا نہ دیکھا!

نیازِ محبت سے یہ بے نیازی خلوصِ محبت سے اتنا تغافل
مرا درد تم نے، مرا حال تم نے، نہ جانا، نہ سمجھا، نہ پوچھا، نہ دیکھا

تمہیں جوش ہم خوب پہچانتے ہیں تمہاری بلانوشیاں جانتے ہیں
کہاں تم کہاں پارسائی کا جامہ کبھی ہم نے ایسا دکھاوا نہ دیکھا

○

بلا سے کوئی ہاتھ ملتا رہے
ترا حسن سانچے میں ڈھلتا رہے

ہر اک دل میں چمکے محبت کا داغ
یہ سکہ زمانے میں چلتا رہے

وہ ہمدرد کیا جس کی ہر بات میں
شکایت کا پہلو نکلتا رہے!

بدل جائے خود بھی تو حیرت ہے کیا
جو ہر روز وعدے بدلتا رہے

مری بے قراری پہ کہتے ہیں وہ
نکلتا ہے دم تو نکلتا رہے!

پلائی ہے ساقی جو آنکھوں سے آج
اسی کا بس اب دور چلتا رہے

تمہیں ہم سحابِ کرم بھی کہیں
امیدوں کا خرمن بھی جلتا رہے

یہ طولِ سفر یہ نشیب و فراز
مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے

کوئی جوہری جوش ہو یا نہ ہو
سخنور [illegible]

جلال الدّین اکبر

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے
مَیں اُن کو دیکھتا رہتا ہُوں، وُہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

ان کی وہ حیا، وہ خاموشی، اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سُننے کو سب کچھ سنتے ہیں، ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے، کیوں کر کہئے
جو دل پہ گذرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

آ دیکھ کے ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہوا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبر شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

○

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبّت ہے آپ سے !

کیا آپ جانتے ہیں، مجھے تو خبر نہیں
کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس دل کی آرزوئے محبّت کو کیا کہوں
جس دل کو آرزوئے محبّت ہے آپ سے

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر
شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

آل احمد سرور

○

غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا
لاکھ مجبور ہوئے ان کو پکارا نہ گیا

کیا ہو روئے تو آیا ہے بہاروں کا سلام
صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا

معرکۂ عشق کا سر دے کے بھی سر ہو نہ سکا
کون راہی تھا جو اس راہ میں مارا نہ گیا

وہ بھی وقت آتا ہے ساقی بھی بدل جاتے ہیں
مے کدے پر کبھی مستوں کا اجارا نہ گیا

شوق کی بات کب الفاظ میں ڈھل سکتی تھی
اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا نہ گیا

گاہ ٹکرا دئے شیشے، کبھی چھلکا دئے جام
رائیگاں ایک بھی ساقی کا اشارا نہ گیا

آئینے جتنے بھی دیکھے وہ مکدر تھے سرور
جوہرِ صدق و صفا پھر بھی ہمارا نہ گیا

○

ہم برق و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے
اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے

گو قطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے
پر شوق کی روداد کب الفاظ میں آئے

زلفوں کو دیا ہے رخِ زیبا نے عجب رنگ
جلووں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے

یہ عشق کے شعلے بھی عجب چیز ہیں یعنی
جو آگ لگائے وہی خود آگ بجھائے

ڈھلتی ہے وہ مے اک ترے پیمانے میں ساقی
مستی کو بھی جو ہوش کے آداب سکھائے

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائیٔ افکار کے اعجاز دکھائے

جس دل پہ کسی کی نگہِ لطف پڑی تھی
بیٹھے ہیں سرور اس کو کلیجے سے لگائے

ماہر القادری

○

احساسِ خوشی مٹ جاتا ہے، افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دل پردہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

دو حرف بھی میرے سن نہ سکے، تم اتنے کیوں بیزار ہوئے
میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا، اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

یہ سود و زیاں کے پیمانے، یہ جھوٹے سچے افسانے
ان اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے

اک دوسری بوتل آنے تک یہ دُردِ تہِ ساغر ہی سہی
او تشنۂ مے! بیتاب نہ ہو، ساقی کو ندامت ہوتی ہے

ماہر کی سادہ باتوں سے اللہ بچاتا ہی رکھے!
خود تو یہ بڑے ہی حضرت ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

○

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے

سرو و صنوبر سب کو دیکھا!
ان کا سا انداز کہاں ہے

دل خوابیدہ، رُوح فسردہ
وہ جوشِ آغاز کہاں ہے

پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلی ساز کہاں ہے

بُت خانے کا عزم ہے ماہر
کعبے کا در باز کہاں ہے

سراج الدّین ظفرؔ

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گُل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں
بیادِ دیدۂ مخمور یہ پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں
وہ رِند ہیں نہ تماشائے بہار کا احساں
درود ہم تری موجِ شراب کے حوالہ کریں
کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوش ربایانِ بیست سالہ کریں
برس پڑے جو گلستاں میں اس نظر سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں
سبو اٹھا کہ گدایانِ کوئے مے خانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں
حدیثِ زہد ہو یا وارداتِ نوشاں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں
دکھا صحیفۂ رُخ اس طرح کہ اہلِ بہار!
ورق ورق خجالت سے بیاضِ لالہ کریں
اٹھو جلا کے مئے سُرخ سے چراغِ ابد
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں
ارادہ نیچی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفرؔ
تلاشِ کنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

درِ مے خانہ سے دیوارِ چمن تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے
ہاتھ میخواروں کے بے قصد اٹھے تھے لیکن
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے
مدرسے میں کہاں اس زلف کا موضوعِ جدید
لوگ پہنچے تو روایاتِ کہن تک پہنچے
راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے
آئیں ہم دست درازی پہ تو میخانے سے
سلسلہ انجمنِ سرو و سمن تک پہنچے
اک قبائے سبک و تنگ میں سو سو ہیں طلسم
کیا کوئی حُسن کے اسرارِ کہن تک پہنچے
آپ ہی آپ جو کھل جائے تری زلفِ دراز
ناگہاں بے ہُنری نقطۂ فن تک پہنچے
اے سخن فہم ہم اُس بزم سے آئے ہیں جہاں
حیرتِ آئینۂ اسلوبِ سخن تک پہنچے
اس طرح شوقِ غزالاں میں غزلخواں ہو ظفرؔ
شہرتِ مشکِ غزل شہرِ ختن تک پہنچے

مختار صدیقی

○

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کون سی سستی ہے یہاں

دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

چھوڑیے صرفہ ہیں ساون بھادوں
دیکھو ہر آنکھ برستی ہے یہاں

اب تو ہے اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ہی پستی ہے یہاں

○

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر و فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو ہم ایسے کہاں اور سوز و گداز عشق کہاں
سچ ہے مرے آئینۂ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت شاید ایام رخصت ہیں
بن کارن اب بات دگرنہ ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

اہلِ جنوں کو فصلِ خزاں سے اب کے بھی گو نہ ربط ملا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرت نے سمجھایا، نومیدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر تو کی جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

یوسف ظفر

تعمیرِ زندگی کو نمایاں کیا گیا
تخریبِ کائنات کا ساماں کیا گیا

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگیٔ داماں کیا گیا

کھوئے ہوؤں پہ تیری نظر کی نوازشیں
آئینہ دے کے اور بھی حیراں کیا گیا

آوارگیٔ زلف سے آسودگی ملی!
آسودگی ملی کہ پریشاں کیا گیا

وہ خوش نصیب ہوں کہ غمِ التفات سے
میرے غمِ حیات کا درماں کیا گیا

تنہائیاں بچھا کے جہانِ خراب میں
میرے لئے نگاہ کا ساماں کیا گیا

پھیلا کے بے ثباتیٔ عالم کی داستاں
مجھ پر حرام کیفِ بہاراں کیا گیا

بھڑکا کے آتشِ رخِ جاناں کی آرزو
مجھ کو رہینِ آتشِ دوراں کیا گیا

نومیدیٔ طلب نے بڑھا کے طلب کا رنگ
امیدِ دیدِ دوست کو ارزاں کیا گیا

یہ بھی کرم کہ مجھ کو شبانِ سیاہ میں
ناموسِ دلنوازیٔ ہجراں کیا گیا

جمعیتِ جمال کا حسن کمال دیکھ
آخر یہی ہوا کہ پریشاں کیا گیا

دیکھ چمن چمن کو بہار و خزاں کا رنگ
میرے خیال و خواب پہ احساں کیا گیا

آ، اور کائنات کے پھولوں کی داد دے
جن سے ترا جمال نمایاں کیا گیا

○

یارو! ہر غمِ یاراں ہے قریب آجاؤ
پیار دو پھر فصلِ بہاراں ہے قریب آجاؤ

دور رہ کر بھی نہیں تم نے حکایاتِ وفا
قرب میں بھی وہی عنواں ہے قریب آجاؤ

ہم محبت کے مسافر ہیں کہیں دیکھ نہ لے
گھات میں گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جان پیاری ہے کہ تم بھی ہو مری جاں کیا کیا
غمِ جاں ہی غمِ جاناں ہے قریب آجاؤ

آج دنیا کو نہیں اپنے غموں سے فرصت
آج مل بیٹھنا آساں ہے قریب آجاؤ

کس مروت پہ زمانے سے ڈریں، دور رہیں
آؤ اللہ نگہباں ہے قریب آجاؤ

میرے ہی پہلو میں سوزاں میں سکوں ممکن ہے
چار سو گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جاؤ، اب جاؤ، کہ وہ عہدِ وفا ختم ہوا
جب بھی دیکھو کہ پھر امکاں ہے قریب آجاؤ

میں زمانے کی کڑی دھوپ کا مارا ہوں ظفر
تم جہاں ہو چمنستاں [illegible]

انجم رومانی

ہر چند انہیں عہد فراموش نہ ہوگا
لیکن ہمیں اس وقت کوئی ہوش نہ ہوگا

دیکھو گے تو آئے گی تمہیں اپنی جفا یاد
خاموش جسے پاؤ گے خاموش نہ ہوگا

گذرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں قرب سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہرِ غمِ ہستی ہو کہ مے ہو
ہم سا بھی زمانے میں بلا نوش نہ ہوگا

ہونے کو تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

پاؤ گے نہ آزادِ غمِ انجم کسی دل کو
ہوگا غمِ فردا جو غمِ دوش نہ ہوگا

جہاں تک گیا کاروانِ خیال
نہ تھا کچھ بجز حسرتِ پائمال

مجھے تیرا، تجھ کو ہے میرا خیال
مگر زندگی پھر بھی ہے خستہ حال

جہاں تک ہے دیر و حرم کا سوال
رہیں چپ تو مشکل، کہیں تو محال

تری کائنات ایک حیرت کدہ
شناسا مگر اجنبی خد و خال

مری کائنات ایک زخمِ کہن
مقدر میں جس کے نہیں اندمال

نئی زندگی کے نئے مکر و فن
نئے آدمی کی نئی چال ڈھال

ہوئے رخصت انجم سحر کے قریب
نہ دیکھا گیا شاید اپنا مآل

قیوم نظر

○

یوں بیٹھ گئے غبار سے ہم
کچھ کہہ نہ سکے بہار سے ہم

یہ زندگی عمر بھر کا رونا
گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ جبر کی لذتوں کا عالم
باز آئے اس اختیار سے ہم

ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ
خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم

یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں
پھرتے رہے بے قرار سے ہم

وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں
جب تم سے تھے ہمکنار سے ہم

اب آخرِ شب نظر ہے شاید
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم

○

ماتھے پہ ٹیکا صندل کا اب، دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے مارے بیٹھے ہیں
روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آہ نشانی جینے کی رہتی تھی مگر جب وُہ بھی نہیں
کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پہ ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو!
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے یوں کب تک جوبن رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

عبدالمجید حیرت

یہاں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پہ نثار ہستیِ پروانہ ہو گئی

صد شکر آج ہو تو گئی اُن سے گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

اللہ رے اشکباریِ شمعِ شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گذر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

○

مرہمِ زخمِ جگر ہو جائے
ایک ایسی بھی نظر ہو جائے

اک اشارہ بھی اگر ہو جائے
اس شبِ غم کی سحر ہو جائے

صبح یہ فکر کہ ہو جائے شام
شام کو، یہ کہ سحر ہو جائے

ہو نہ اتنا بھی پریشاں کوئی
کہ زمانے کو خبر ہو جائے

یوں تو جو کچھ بھی کسی پر گذرے
دل نہ افسردہ مگر ہو جائے

فکرِ فردا بھی کریں گے حیرت
پہلے یہ شب تو بسر ہو جائے

سکندر علی وجد

○

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ابھی آیا ہے ہوش لے یادِ جاناں
نہ تڑپا، بار بار آئے نہ آئے

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

کیا جو تم نے اپنے دل سے پوچھو
ہمارا اعتبار آئے نہ آئے

نگاہِ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے

بڑھے گا کارواں منزل بہ منزل
غبارِ رہگذار آئے نہ آئے

○

جب وہ مسرور نظر آتا ہے
ہر طرف نور نظر آتا ہے

مَیں تو مے خوار ہوں تو کیوں ساقی!
نشے میں چُور نظر آتا ہے

قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے
تو بڑی دُور نظر آتا ہے

مَیں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں
تو بھی مجبور نظر آتا ہے

خاکساری کو چُھپانے کے لئے
وجد مغرور نظر آتا ہے

ادیب سہارنپوری

○

اک خلش کو حاصلِ عمرِ رواں رہنے دیا
جان کر ہم نے انہیں نامہرباں رہنے دیا

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے
فاصلہ بھی میرے انکے درمیاں رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اپنے اپنے حوصلے اپنی طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے
باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا

یہ بھی کیا جینے میں جینا ہے بغیر انکے ادیبؔ
شمع گُل کر دی گئی باقی دھواں رہنے دیا

○

وہ پو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی
وہ شب کی زلفِ شکن در شکن میں آگ لگی

سلگ اٹھی وہ ردائے نجوم و کاہکشاں!
وہ دیکھ دامنِ صبحِ کہن میں آگ لگی

نشاطِ گرمیٔ محفل تھی جس کی تابانی
اسی چراغ سے کیوں انجمن میں آگ لگی

ہزار شمس و قمر بجھ گئے پہ یہ نہ بجھی!
یہ کس شرر سے پتنگوں کے من میں آگ لگی

تمام عمر کے آنسو اسے بجھا نہ سکے
جو دل سے تا بہ جگر دم زدن میں آگ لگی

بھلا سکے گی نہ دنیا یہ حادثہ کہ ادیبؔ
چراغِ لالہ و گل سے چمن میں آگ لگی

ذوالفقار علی بخاری

بسائی میں نے جو قلبِ حزیں میں
وہ دُنیا کام آئی کارِ دیں میں

وہی ہے اصل میں جانِ تمنا
جو حسرت ہے نگاہِ واپسیں میں

ترے شوقِ سراپا کی کشش سے
سمٹ آیا ہوں میں اپنی جبیں میں

ہے پیچ و تاب میں ہر موجِ ساحل
وہ بیتابی ہے موجِ تہ نشیں میں

حقیقت ہے کہ تم ہو جانِ خوبی
کہ خوبی ہے وطن کی سرزمیں میں

محبت ہے کہ وہ عکسِ مسرت
اتر آیا مرے قلبِ حزیں میں

جنوں کے راج میں انصاف ہوگا
نہ ہوگا فرق جیب و آستیں میں

بہت کچھ پاؤ گے دنیا میں پیارے
محبت پاؤ گے لیکن ہمیں میں

بخاری کی تڑپ حافظ کی مستی
تمہارے نغمۂ وجد آفریں میں

زندگی آزار تھی آزار ہے تیرے بغیر
کارِ سہلِ مرگ بھی دشوار ہے تیرے بغیر

کام یوں آ کر رُکے جیسے کبھی چلتے نہ تھے
عمرِ فانی وقتِ بے رفتار ہے تیرے بغیر

کیا بتاؤں کس طرح اب کٹ رہی ہے زندگی
میری ہر ہر سانس اک تلوار ہے تیرے بغیر

تیرا غم تھا اور تجھ ہی سے بیاں کرتا تھا میں
کون سا غم قابلِ اظہار ہے تیرے بغیر

میرے غم کی تلخیوں کا اس سے کچھ اندازہ کر
مجھ کو مے نوشی سے بھی انکار ہے تیرے بغیر

غلام ربّانی تاباںؔ

○

جنوں خود نما خود نگر بھی نہیں
خرد کی طرح کم نظر بھی نہیں

کوئی راہزن کا خطر بھی نہیں
کہ دامن میں گردِ سفر بھی نہیں

یہاں ہوش و ایماں سبھی لُٹ گئے
مزا یہ ہے ان کی خبر بھی نہیں

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب
غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں!

نظر معتبر ہے خبر معتبر
مگر اس قدر معتبر بھی نہیں

تری انجمن مرکزِ آرزو!
تری انجمن میں گزر بھی نہیں

کہاں جائیں تاباںؔ گنہگارِ شوق
سزا بھی نہیں درگزر بھی نہیں!

○

چھٹے غبارِ نظر بامِ طور آجائے
پیو شراب کہ چہرہ پہ نُور آجائے

اُٹھاؤ جام بنامِ حیات بادہ کشو
نظارے جھومیں، نظر کو سرور آجائے

شراب خانہ میں کوثر کا ذکر! کیا کہئے
کسی کی عقل میں جیسے فتور آجائے

تمام زہد و ریاضت ہو غرقِ موجِ شراب
جو میکدے میں وُہ شیدائے حور آجائے

مقامِ دار سے گذرو تو زندگی پاؤ!
پیو جو زہرِ ہلاہل سرور آجائے

نگاہ تیز، نفس گرم، آرزو بیباک!
جسے ہو ناز ہمارے حضور آجائے!

یہ کاروبارِ مشیت بھی خوب ہے تاباں!
کسی پہ برق گرے زد پہ طور آجائے

رازؔ مرادآبادی

ہر اک شکستِ تمنا پہ مسکراتے ہیں
وہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

کبھی کبھی تو وہ اس طرح یاد آتے ہیں
ہم اسکے بعد ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں

یقینِ عشق نہیں، اعتبارِ حسن نہیں
یہ وہم کیا مرے دل میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا چیز ہے، خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم
اب اعتبار کی حد سے گزرتے جاتے ہیں

○

غم کہ تھا حریفِ جاں اب حریفِ جاناں ہے
اب وہ زلف برہم ہے اب وہ چشم گریاں ہے

دستوں میں دامن کی ان دنوں گریباں ہے
ہم نفس کہیں شاید موسمِ بہاراں ہے

رنگ و بو کے پردے میں کون یہ خراماں ہے
ہر نفس معطر ہے ہر نظر غزل خواں ہے

بندگی یہ کیا جانے، دیر کیا، حرم کیا ہے
ہم جہاں پہ ہیں واعظ، کفر ہے نہ ایماں ہے

شکریہ مگر ناصح تو یہ رازؔ کیا سمجھے
جورِ برملا ان کا التفاتِ پنہاں ہے

مجید امجد

○

کیا روپ دوستی کا، کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں، کوئی نہیں کسی کا

اک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی افق پہ تاگا سا روشنی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا!

○

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا

یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجومِ رنگ فراواں سہی۔ مگر، پھر بھی
بہار۔ نوحۂ صد عندلیب، کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی افق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب کیا کہنا

شان الحق حقی

○

اثر نہ ہو تو اسی نطقِ بے اثر سے کہہ
چھپا نہ دردِ محبت جہان بھر سے کہہ

جو کہہ چکا ہے تو اندازِ تازہ تر سے کہہ
خبر کی بات ہے اک گوشِ بے خبر سے کہہ

چمن چمن سے اُلجھ رہے گا پلۂ خزاں
روش روش کو بتا دے شجر شجر سے کہہ

بیانِ شوق نہیں قیل و قال کا محتاج
کبھی زباں میں ادا کر کبھی نظر سے کہہ

قدم قدم پہ کیے گوشِ بے اثر سے خطاب
مرادِ دل کی گدایانِ رہگزر سے کہہ

شبابِ تشنہ کی خوں بار خوشیوں کو نہ بھول
مرے فسانۂ رنگیں کو بیشتر سے کہہ

سفر ہے شرطِ حیات اور محبت ہے شرطِ سفر
پکار کر یہ رفیقانِ ہم سفر سے کہہ

○

اے دل ترے خیال کی دنیا کہاں سے لائیں
ان وحشتوں کے واسطے صحرا کہاں سے لائیں

حیرت تو ہے یہی کہ ہو دنیا سے دل کو میل
ہو جس سے دل کو میل وہ دنیا کہاں سے لائیں

دیکھا تھا جو نہالِ تمنا کے سائے میں
اے بے دلی وہ خوابِ دل افزا کہاں سے لائیں

روشن تھے جو کبھی وہ نظارے کدھر گئے
برپا تھا جو کبھی وہ تماشا کہاں سے لائیں

کیا اس نگاہِ حوصلہ افزا کو دیں جواب؟
گم کر دیا ہے وہ تمنا کہاں سے لائیں

ہے لطفِ دوست حرفِ تقاضا کا منتظر
اے بے بسی مجالِ تقاضا کہاں سے لائیں

حق ہے بہت نہ کارِ جنوں دشتِ نیست میں
[illegible] کہاں سے لائیں

باقیؔ صدیقی

○

ہم ذرّے ہیں خاکِ رہگذر کے
دیکھو ہمیں بام سے اُتر کے

چُپ ہو گئے یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پَر کے

وعدہ نہ دلاؤ یاد اُن کا
نادم ہوں خود اعتبار کر کے

اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

شبنم کی طرح حیات کے خواب
کچھ اور بکھر گئے بکھر کے

جب اُن کو خیالِ وضع آیا
انداز بدل گئے نظر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ
مل جائے گا چین جیسے مر کے

○

رسمِ سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے

جب چمن میں نہ کہیں چین ملا
بابِ زنداں پہ صدا دی ہم نے

آنچ صیاد کے گھر تک پہنچی
اپنی شعلوں کو ہوا دی ہم نے

خونِ دل سے درِ مےخانہ پہ
تیری تصویر بنا دی ہم نے

دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

جگن ناتھ آزاد

○

جو دل کا راز بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے
یہاں پتھر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

زبانوں پہ دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خود دار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

○

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دُور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وُہ کہ جنھیں اُٹھا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

تیری حسیں فضا میں مرے اے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں؟

آزاد سازِ دل پہ ہیں رقصاں وُہ زمزمے
خود سُن سکوں مگر نہ کسی کو سُنا سکوں

عرش ملسیانی

○

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے
انگور کی مے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے

جب تیرِ ملامت چلتے تھے روکے سے کسی کے رک نہ سکے
اب چاکِ دلِ انسانیت سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے

اک صبر کے گھونٹ سے مٹ جاتی تشنہ لبوں کی تشنہ لبی
کم ظرفیِ دنیا کے صدقے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

وہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے
بجھنے کا سلیقہ آساں ہے، جلنے کا قرینہ مشکل ہے

کہنے کو رفو کر ہی لیں گے دنیا والے سب زخم اپنے
جو زخم دلِ انساں پہ لگا، اس زخم کا سینا مشکل ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

ملنے کو ملے گا بالآخر اے عرش سکونِ ساحل بھی
طوفانِ حوادث سے لیکن بچ جائے سفینہ، مشکل ہے

○

دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی
مگر وہ یاد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی

چمن میں کون ہے پرسانِ حالِ شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی

نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا
لباسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی

کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی!

عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی!

زمانہ ہنستا ہے مجھ پہ ہزار بار ہنسے
تمہاری آنکھ میں لیکن یہ کیوں نمی آئی

دیئے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہزار دیدہ پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

ظہور نظر

حیات وقفِ غمِ روزگار کیوں کرتے
میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھ سے پیار کیوں کرتے

نہ میری راہ میں تارے نہ میرے پاس چراغ
وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے

نگاہ صرف بُلاوا نہیں کچھ اور بھی ہے
یہ جانتے تو ترا اعتبار کیوں کرتے!

غمِ حیات میں ہوتا اگر نہ ہاتھ ترا!
تو ہم خرد میں جنوں کو شمار کیوں کرتے

کوئی تو بات ہے ورنہ جفاؤں کے مارے
تجھے بُھلا کے ترا انتظار کیوں کرتے!

نظرؔ چمن میں اگر واقعی بہار آتی!
تو پھول خواہشِ ابرِ بہار کیوں کرتے

رو لیتے تھے ہنس لیتے تھے بس میں نہ تھا جب اپنا جی
تم نے ہمیں دیوانہ کہا ہے ایسی تو کوئی بات نہ تھی

اب یہ تمہارا کام کہ جانو ہم پروانے تھے یا دیپ
دن بیتا تو جلتے جلتے، جلتے جلتے رات کٹی

گُلشن گُلشن محفل محفل ایک ہی قصہ ایک ہی بات
ظالم دنیا، جابر دنیا، جانے یہ کب بدلے گی

ٹپکے کتنے ہاتھ نہ جانے اُن کے میلے دامن پر
کل تک تھے ہم چاک گریباں اُن سے پوچھے آج کوئی

ہم ہیں مشعل والے پہلے ہم سے دو دو ہاتھ کرو
پھر بکھرا لینا اندھیارا نگر نگر بستی بستی!

تم ہو آگ تو ہم پانی ہیں، تم ہو دھوپ تو ہم چھاؤں
اپنا تمہارا ساتھ ہی کیا ہے ہم پرجا تم راجہ جی

گلی گلی میں خون کے دھبے ڈگر ڈگر پہ راکھ کے ڈھیر
جشن منانے والے یارو ایک نظر اس جانب بھی!

ضیاؔ جالندھری

○

چھیڑی بھی جو رسم و راہ کی بات
وہ سُن نہ سکے نگاہ کی بات

ہر لحظہ بدل رہے ہیں حالات
مجھ سے نہ کرو نباہ کی بات

کہتے ہیں تری مژہ کے تارے
خود میری شبِ سیاہ کی بات

اب ہے وُہ نگہ نہ وُہ تبسم
کچھ اور تھی گاہ گاہ کی بات

کیا یاد نہ آئے گا یہ انجام!
کس دل سے کریئے چاہ کی بات

○

کیا سروکار اب کسی سے مجھے
واسطہ تھا تو تھا تجھی سے مجھے

بے حسی کا بھی اب نہیں احساس
کیا ہُوا تیری بے رُخی سے مجھے

موت کی آرزُو بھی کر دیکھوں
کیا امیدیں تھیں زندگی سے مجھے

پھر کسی پہ نہ اعتبار آئے
یُوں اُتارو نہ اپنے جی سے مجھے

تیرا غم بھی نہ ہو تو کیا جینا
کچھ تسلی ہے درد ہی سے مجھے

کتنا پُرکار ہو گیا ہُوں کہ تھا
واسطہ تیری سادگی سے مجھے

کر گئے کس قدر تباہ ضیاؔ
دشمن، اندازِ دوستی سے مجھے

احمد راہی

○

غمِ حیات میں کوئی کمی نہیں آئی
نظر فریب تھی تیری جمال آرائی

وہ داستاں جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دُہرائی

فسانے عام سہی میری چشمِ حیراں کے
تماشا بنتے رہے ہیں یہاں تماشائی

تری وفا، تری مجبوریاں بجا، لیکن
یہ سوزشِ غمِ ہجراں، یہ سردِ تنہائی

کسی کے عشق تمنا کا پاس ہے ورنہ
مجھے خیالِ جہاں ہے نہ خوفِ رسوائی

میں سوچتا ہوں زمانے کا حال کیا ہوگا
اگر یہ اُلجھی ہوئی زلف تُو نے سُلجھائی

کہیں یہ اپنی محبت کی انتہا تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

○

کبھی تری کبھی اپنی حیات کا غم ہے
ہر ایک رنگ میں ناکامیوں کا ماتم ہے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطرابِ پیہم ہے

مرے مذاقِ الم آشنا کا کیا ہوگا!
تری نگاہ میں شعلے ہیں اب نہ شبنم ہے

سحر سے رشتۂ امید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لَو شام ہی سے مدھم ہے

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی راہی
کہ ہر قدم پہ عجب بے بسی کا عالم ہے

عارف عبدالمتین

میری سوچ لرز اٹھی ہے دیکھ کے پیار کا یہ عالم
تیری آنکھوں سے ٹپکا ہے آنسو بن کر میرا غم

دل کو ناز ہے سلجھاؤ پر لیکن میں نے یہ دیکھا ہے
سلجھانے سے اور الجھا ہے تیری زلف کا ایک اک خم

دن کے بولتے ہنگامے میں اکثر سویا رہتا ہے
کروٹ لیکر جاگ اٹھتا ہے رات کی چپ میں تیرا غم

ہجر کے سنولائے لمحوں میں آس بھی تنہا چھوڑ گئی
کس سے پوچھوں کون بتائے رات ہوئی ہے کتنی کم

تیری دھن میں تجھ سے بھی شاید آگے جا نکلا ہوں
تیرے پہلو میں بیٹھا ہوں پھر بھی آنکھیں ہیں پُرنم

تیرا غم ہم دیوانوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا
ایک زمانہ ہم سے خفا ہے ایک جہاں سے ہم برہم

ترے بازوؤں کا سہارا تو لے لوں مگر ان میں بھی پیچ گئی ہے نگ
میں صحرا سے بچ کر چمن میں تو آؤں یہ صحرا سے کچھ کم نہیں ہے چ

میری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن ہو
یہ راہ آج پھر تیرہ و تار ہے، غالبًا چاند کو لگ گیا ہے گہ

ہر اک سمت ناگن کی صورت لپکتی ہوئی تیرگی سے ہراساں ن
عجب کیا کہ لَو دے اٹھے میرے لمسِ فروزاں سے تیرا شگفتہ بد

ہے اشکوں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ مروت کا اعجاز
غموں کی ہواؤں میں اڑتا ہوا دیکھ کر آ رہے ہیں کوئی پیرہن

فراقِ لب و زلف پر منحصر کم ہی پائی ہے اہلِ وفا کی تڑپ
تم آغوش کے تنگ حلقے میں ہو، پھر بھی ہر لمحہ افزوں ہے دل کی جلن

شہرت بخاری

○

وہ پاس آئے آس بنے اور پلٹ گئے
کتنے ہی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئے

ہر رُخ میں بہار ہوئی خیمہ زن، مگر
دامن کے ساتھ ساتھ یہاں دل بھی پھٹ گئے

راہوں کا پیچ کچھ ایسا پڑا کہ ہم
منزل قریب آئی تو رہبر سے کٹ گئے

دل دے کے اس طرح سے طبیعت سنبھل گئی
گویا تمام عمر کے جھگڑے نپٹ گئے

برسوں کے پیاسے دشت نوردوں سے پوچھئے
ان بادلوں کا پیار جو گھرتے ہی چھٹ گئے

بس ہے رہیں نہ جب غمِ دوراں کی وسعتیں
ہم لوگ اپنے گوشۂ دل میں سمٹ گئے

شہرتؔ انہیں بھلانے کی کوشش جو کی کبھی
دامانِ دل سے سینکڑوں نقشے لپٹ گئے

○

ہم پی گئے سب ہلے نہ لب تک
جی ہار گئے نجومِ شب تک

ہر چند گھٹائیں چھٹ گئی ہیں
پر دل پہ غبار سا ہے اب تک

خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آئے گا یہ دورِ جام سب تک

اشکوں نے فسانہ کر دیا ہے
وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

ہر غم کو اڑا دیا ہنسی میں
تم پیشِ نظر رہے ہو جب تک

مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو درِ کعبہ جانے کب تک

شہرتؔ کوئی اور بات چھیڑو
اٹھیں وہ نقابِ لطف جب تک

شہزاد احمد شہزاد

○

میری خاطر دیر نہ کرنا اور سفر کرتے جانا
لیکن چھوڑ کے جانے والو ایک نظر کرتے جانا

اتنا سکوں، اتنی خاموشی کیسے رات گزر سکتی ہے
جاتے جاتے محفلِ دل کو زیر و زبر کرتے جانا

ہجر کی شب کے تارو! تم کو ڈوب تو جانا ہے لیکن
میرے دل پر کیا گزری ان کو تو خبر کرتے جانا

روتی آنکھیں یا ہنستے لب آپ ہی اک رسوائی ہیں
چُپ چُپ رہنا اور طوافِ راہگذر کرتے جانا

اور ذرا چمکا دینا یادوں کے بھڑکتے شعلوں کو
اے غمِ جاناں اے غمِ دوراں دل پہ اثر کرتے جانا

ہم سے درد کے ماروں کی مجبوری کیا مختاری کیا
جینا اور نہ مرنا لیکن عمر بسر کرتے جانا

کس کو خبر شہزاد کہ ان آنکھوں میں کیسا جادو ہے
کہنا اور نہ سُننا لیکن دل میں گھر کرتے جانا

○

کھلے جو پھول تو مُنہ چھپ گیا ستاروں کا
مثالِ ابر چلا کارواں بہاروں کا

نہ مجھ سے پُوچھ شبِ ہجر دل پہ کیا گزری
یہ دیکھ حال ہے کیا میرے غمگساروں کا

نئی بہار ہنسے اک نیا چمن کھل جائے
سمجھ سکے کوئی مطلب اگر اشاروں کا

شبِ سیاہ کے لمحے گزار لینے دو
گھڑی گھڑی نہ کرو ذکر ماہ پاروں کا

دکھائی دیتی ہے سطحِ روپ رنگ کی بات
فضا میں رقص ہو جس طرح ابر پاروں کا

ہُوا نہ راہ میں حائل کوئی شگوفہ بھی
رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا

مجھے بھی اہلِ جہاں بھول جائینگے شہزاد
کسے خیال ہے ڈوبے ہُوئے ستاروں کا

سلام مچھلی شہری

یہ ابر و باد یہ طوفاں، یہ اندھیری رات
اب ایک موڑ پہ آ جا رفیقِ راہِ حیات

ہوا کے دوش پہ موجِ اجل خراماں ہے
مریضِ دہر پہ طاری ہیں نزع کے لمحات

حیات ایک تخیل نہیں حقیقت ہے
مجھے بتائی ہے آدم کے عزم نے یہ بات

مرے رفیق، محبت کے دن بھی آئیں گے
وہی حسین سویرا وہی کنواری رات

وہی گلاب کے موسم وہی شراب کے دَور
وہی سنہری گھٹائیں، وہی بھری برسات

سنائی جائے گی کوئل کو ہم نوا کر کے
سیہ بگولوں کو بھنوروں کی ایک راز کی بات

غزل کی ڈال سجا کر چمن کی دلہن کو ——
سلام نذر کرے گا سہاگ کی سوغات

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے

بس اک لطیف تبسم بس اک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

جہاں سے چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں
وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے

پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہو گا
نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

تری نگاہِ کرم کی قسم ہے اب بھی مجھے
یہی یقین کہ دنیا بدل تو سکتی ہے

سلام! جام و سبو کی یہ شاعری معلوم
وگرنہ اپنی طبیعت بہل تو سکتی ہے!

شاعر لکھنوی

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں　　غم دل کی فضا بدل رہے ہیں
گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے　　کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں
ایک ایک نفس میں روشنی ہے　　یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
چپ چپ سی ہے تلخیٔ زمانہ　　غم جام و سبو میں ڈھل رہے ہیں
مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا　　بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں
اللہ رے اعتبارِ ہستی　　ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں
اس سمت بھی گردشِ زمانہ!　　کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

ساحل پہ انہیں کا حق ہے شاعر
طوفاں کا جو رخ بدل رہے ہیں

○

جو غم حبیب سے دور تھے وہ خود اپنی آگ میں جل گئے
جو غم حبیب کو پا گئے وہ غموں سے ہنس کے نکل گئے

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل گئے
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل گئے

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

غم عیش یاس و امید کا نہ اثر حیات پہ ہو سکا
مری روحِ عشق وہی رہی یہ لباس تھے جو بدل گئے

نہ ہے شاعر اب غم نو بہ نو نہ وہ داغِ دل نہ وہ تازگی!
جنہیں اعتمادِ بہار تھا وہی پھول رنگ بدل گئے

جعفر طاہر

نے حرم سے نکلی ہے کوئے بتاں کی راہ
ہائے کہاں یہ آ کے ملی ہے کہاں کی راہ

صد آسمان امن و صد کہکشاں بدوش
بام بلند یار ترے آستاں کی راہ

ملک عدم میں قافلۂ عمر جا بسا
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اس بدگماں کی راہ

کُھلتا رہا ہے ذوقِ نظر گام گام پر
اب کیا رہا ہے پاس جو ہم لیں وہاں کی راہ

اے زلف خم بخم تجھے اپنا ہی واسطہ
ہموار ہونے پائے نہ عمرِ رواں کی راہ

کھلائے رنگ رنگ میں افکارِ نو بہ نو
یہ رہگزارِ شعر ہے کس گلستاں کی راہ

ظاہر یہ منزلیں، یہ مقامات، یہ حرم
اللہ رے یہ راہ، یہ کوئے بتاں کی راہ

عرصۂ ظلمت حیات کٹے — ہم نفس مسکرا کہ رات کٹے
ثمرِ آرزو کا ذکر نہ چھیڑ — چھونے پائے نہ تھے کہ ہات کٹے
کاش ہر زلف تیغ بن جائے — کاش زنجیرِ حادثات کٹے
اے بقائے دوام کے مالک — کس طرح عمرِ بے ثبات کٹے
آدمی جستجوئے راہ میں ہے — تجھ کو ضد ہے رہِ نجات کٹے

شبِ خلوت سخن سخن کی داد
اور سرِ بزم بات بات کٹے

شاعر لکھنوی

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں — غم دل کی فضا بدل رہے ہیں
گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے — کانٹوں پہ جو ہنس کے [illegible]
ایک ایک نفس میں روشنی ہے — یادوں [illegible]
چپ چپ سی ہے [illegible]
[illegible]

[illegible] سے تھا اشارا نہ رہا
اور تو لیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا
چھن گئی آخری امید بھی دل سے اشعر
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

[illegible]
ساغرِ بادۂ گل رنگ تو کچھ دور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے
دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ ابھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے
اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
مجھ کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے
ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے
میں جو اُس بزم میں جاتا نہیں اشعر مجھ کو
اپنے سہمے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

[illegible] کو یہ زندگی پھر بھی
[illegible] بھی

[illegible] کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی

[illegible] اک گردش زمیں تک ہے
[illegible] بات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی

[illegible] ں سازش ہے
کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی

[illegible] گماں یہ ہوتا ہے
[illegible] جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی

[illegible] ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیشروِ صبح و روشنی پھر بھی

[illegible] بہار تو ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آکر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پہ بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیم آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آ گئے یاد کب کے زمانے

حبیب اشعر

دل کے ہاتھوں کہیں دُنیا میں گزارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

صبر اے دل! کہ یہ حالت نہیں دیکھی جاتی
ٹھہر اے درد! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا

یوں تو اب بھی ہے وہی رنج وہی محرومی
وہ جو اک تیری طرف سے تھا اشارا نہ رہا

اور تو کیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا

چھن گئی آخری امید بھی دل سے اشعر
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

بے نیازی سے، مدارات سے ڈر لگتا ہے
جانے کیا بات ہے ہر بات سے ڈر لگتا ہے

ساغرِ بادۂ گل رنگ تو کچھ دُور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے

دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ اُبھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے

اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
مجھ کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھُٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

میں جو اُس بزم میں جاتا نہیں اشعر مجھ کو
اپنے سہمے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

مکین احسن کلیم

○

حیات مجھ پہ اک الزام ہی سہی پھر بھی
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ زندگی پھر بھی

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی
ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی

یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے
مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی

چمن اُجڑا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے
کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی

کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی

ہمیں پہ یورشِ ظلمت ہمیں ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیشروِ صبحِ درخشی پھر بھی

لبِ کلیم پہ اب نغمۂ بہار تو ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آکر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پر بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیم آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آگئے یاد کب کے زمانے

نورؔ بجنوری

ان گھٹاؤں میں اُجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر اگر آپ پسند ہیں تو سویرا ہی سہی

اے غمِ زیست بُلاتی ہیں مہکتی زلفیں
آج کی رات یہ پُر نور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وُہ کہاں بجھتی ہے
راہ شاداب سہی ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہلِ خرد خاک نشیں آ پہنچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

تو پریشان نہ ہو خالقِ فردوسِ بریں
یہ جہنم یہ جہاں آج سے میرا ہی سہی

کتنی یادیں ہیں کہ ناگن کی طرح ڈستی ہیں
نورؔ ان گلیوں کا اک آخری پھیرا ہی سہی

میری دُنیا سنگ و آہن ان کی دُنیا چاند ستارے
عقل کہاں تک دامن کھینچے عشق کہاں تک ہاتھ پسارے

اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں شاموں صبحوں کے متوالے
صُبح کے آنسو کون سکھائے رات کے گیسو کون سنوارے

آبلہ پا رہگیروں کو جھرنوں سے دِل بہلانے بھی دے
عزمِ جواں کو اور جواں کر اپنی منزل دُور ہے پیارے

چھم چھم چھم چھم ناچتی موجیں یہ سرگوشی کرتی جائیں
طوفانوں کی راہ تکیں گے کب تک یہ مجبور کنارے

نورؔ عقیدوں کے شعلوں میں رُوحیں جلتی دیکھ چکی ہیں
تم ہی بتاؤ ان آنکھوں سے آنسو ٹپکیں یا انگارے

لقمہ بجھا

جھوم کر گاؤ! میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

ایک سجدہ بنامِ مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ! میں شرابی ہوں

ساغر صدیقی

چراغِ طور جلاؤ! بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اُٹھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
اُنہیں کہیں سے بلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ! بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ! بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

عظیم مرتضیٰ

○

کچھ بھی ہو مرا حال نمایاں تو نہیں ہے
دل چاک سہی خیر، گریباں تو نہیں ہے

حسنِ طلب برق ہے تعمیرِ نشیمن
ورنہ ہوسِ سیرِ گلستاں تو نہیں ہے

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

ہم درد کے مارے ہی گراں جاں ہیں وگرنہ
جینا تری فرقت میں کچھ آساں تو نہیں ہے

ٹوٹا تو عزیز اور رہا اہلِ وفا کو
دل بھی کہیں اُس شوخ کا پیماں تو نہیں ہے

○

ترا خیال بھی ہے وضعِ غم کا پاس بھی ہے
مگر یہ بات کہ دنیا نظر شناس بھی ہے

بہارِ صبحِ ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچے کے آس پاس بھی ہے

جو ہو سکے تو چلے آؤ آج میری طرف
ملے بھی دیر ہوئی اور جی اداس بھی ہے

خلوصِ نیتِ رہرو پہ منحصر ہے عظیم
تمامِ عشق بہت دور بھی ہے پاس بھی ہے

جمیل ملک

کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
[illegible] کے نگر میں جگمگ جگمگ اپنے دیس میں رات ہی رات

نیلے نیلے امبر پر وہ چاند ——— وہ کرنوں کی برسات
[illegible] کھوئے کھوئے سے ہائے وہ مست منوہر گھات

رنگ کشش گھلائے میں صحرا صحرا بھٹکوں!
دل کا یہ سودا ہے ورنہ تیرا اور میرا کیا ساتھ

سب دنیاداری کی باتیں، دل میں اور زباں پہ اور
[illegible] بیار بٹھا کر آخر جان گئے تیری اوقات

چاہے اب اس کو اپناؤ چاہے ناز سے ٹھکراؤ!
اب سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمہارے ہات

دنیا کا منشا ہے پہلے ہم گھٹ گھٹ کر مر جائیں!
دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اک دن بدلیں گے حالات

ایک نظر کی لے سے میں نے سب کے دل پگھلائے ہیں
دنیا [illegible] وہم کہ میرے ہونٹوں پر ہے اپنی بات

○

یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں

صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے انکی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ چنچل جھلمل جگمگ تارے ہیں!

ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے بیچ بجھتے دیپ ہمارے ہیں

اک سپنے کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا، ہم پیار کی بازی ہارے ہیں

سب سے ہنس کر ملنے والے ہم کو کسی سے بیر نہیں
دنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

غزلِ جدید

ہری چند اختر

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونیکا وقت آیا

اسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونیکا وقت آیا

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونیکا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

وہی نالہ، وہی نغمہ، بس اک تفریقِ لفظی ہے
قفس کو منتشر کردو نشیمن نام ہو جائے

تصدق عصمتِ کونین اس مجذوبِ اُلفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے

یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

اسد ملتانی

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیریِ دام و قفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما
یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں

عجب نہیں جو محبت ہو زندۂ جاوید
کہ عرضِ شوق نفس دو نفس کی بات نہیں

پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اسد یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

کشفی ملتانی

دل دل ہی رہیگا، گُلِ تر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظورِ نظر ہو نہیں سکتا

جو ظلم کیا تُو نے، کیا بے جگری سے
ایسا تو کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

تھک تھک کے تری راہ میں یُوں بیٹھ گیا ہُوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

اظہارِ محبت مرے آنسو ہی کریں گے
اظہار بہ اندازِ دگر ہو نہیں سکتا

ہر بُوند لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو
جیسے کہ ہر اک قطرہ گُہر ہو نہیں سکتا

یہ عہدِ جوانی بھی ہے کچھ ایسا زمانہ
بے بادہ سرِ جوش بسر ہو نہیں سکتا

لے جائے گا یہ دل مجھے اُس بزم میں آخر
جس میں کہ صبا کا بھی گذر ہو نہیں سکتا

جب تک تری رحمت کا ہے کشفی کو سہارا
سچ یہ ہے گناہوں سے حذر ہو نہیں سکتا

عشرت رحمانی

دل ہی نہیں تو دل کے سہاروں کو کیا کروں
جب پاس تم نہیں تو بہاروں کو کیا کروں

جلوے ہیں جس کے چاند ستاروں میں تھی ضیا
اب وہ ہنسی نہیں تو ستاروں کو کیا کروں

تصویر یاد، تصورِ جاناں یہ سب فریب
میں اُن سے دور اُنکے نظاروں کو کیا کروں

وہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ رنگ و بُو
گذری ہوئی حسین بہاروں کو کیا کروں

خوابوں کے نور چھین لیا اے خیالِ یار
تیرے بغیر ایسے اشاروں کو کیا کروں

دل ہے خزاں نصیب گلستاں ہے پُر بہار
عشرت بھلا میں ایسے نظاروں کو کیا کروں

شوکت تھانوی

ہو راہزن کی ہدایت کہ راہبر کے فریب
مری نگاہ نے کھائے نظر نظر کے فریب

یہ بتکدے یہ کلیسا یہ مسجدیں یہ حرم
یہ سب فریب ہیں اور ایک سنگِ در کے فریب

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا
نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

پتہ چلا کہ ہر اک گام میں تھی اک منزل
کھلے ہیں منزلِ مقصود پہ سفر کے فریب

ان ہی کا نام محبت ان ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

وحید قریشی

○

غم کے ہاتھوں (شکرِ خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں

وہ بھی کیا دن تھے جن روز دل بیفکری میں سوتے تھے
اب کیسی اُفتاد پڑی ہے چین نہیں آرام نہیں

دل کے اُجڑتے ہی آنکھوں نے حیف یہ عالم دیکھ لیا
جلوہ سرِرہ کوئی نہیں ہے کوئی بروئے بام نہیں

جس کے اثر سے بیخود ہو کر اپنے تئیں ہم رسوا ہوں
موجِ مئے گل کے ہاتھوں میں ایسا کوئی جام نہیں

دل کا رونا، دل کا کھونا، لاکھ عذابِ الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں ہم ایسے ناکام نہیں

خلیل الرحمن اعظمی

○

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
فرصت ہو تو آ کر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
سر جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
پھر تو مداوا کرنا ہوگا اس آشفتہ مزاجی کا
وادی و صحرا چھوڑ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
ہم نے اپنی طرف سے خوباں کب تم کو بدنام کیا
اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
ورنہ رہا کچھ موجِ بلا کا رُخ بھی پھرا دُنیا کی ہوا کا
خیر اب کے اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا ہے
ہو پامالِ خزاں میں اک دن خاکِ چمن سے پھر اُٹھیں گے
اک اک بُوند جلی ہے لہو کی تب جا کر یہ رات کٹی

یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہ کے [illegible]
کتنے غبار ہیں اس من میں کتنے دل میں [illegible]
مسلکِ مہر و وفا میں واعظ ہم کافر بھی مسلماں [illegible]
اے غمِ جاناں اپنے پرائے سب ہی تجھ سے [illegible]
جنگل جنگل ڈھونڈتے پھرتے ہم کو سایۂ [illegible]
تم نے جو جو داغ دیئے ہیں وہ چھاتی پہ [illegible]
ورنہ میری دفاع کے بنانے کتنے اور بھی عنوان [illegible]
رونا کیا ہے دُکھ ساگر کا، اس کے ہم پر احسان [illegible]
دیکھیں کتنی زنجیریں ہیں دیکھیں کتنے زنداں [illegible]
اُن کا شغلہ جانے کیا ہو جو مقتولِ بہاراں [illegible]
تیرے لئے اے صبحِ طرب ہم کب سے چاک گریباں [illegible]

میرؔ کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمیؔ صاحب آپ کی غزلیں سن سن کر سب حیراں ہیں

شاد

نریش کمار

شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا
آنے والا ابھی نہیں آیا

زندگی کے غموں کو اپنا کر
ہم نے دراصل تجھ کو اپنایا

جستجو ہی دلوں کی منزل تھی
ہم نے کھو کر تجھے، تجھے پایا

زندگی نام ہے جدائی کا
آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا

ہم نے تیری جفا کے پردے میں
خود بھی دل پر بہت ستم ڈھایا

زندگی سے تو خیر شکوہ تھا،
ناتواں موت نے بھی ترسایا

شاد اہلِ طرب کو بھی اکثر
میری افسردگی پہ پیار آیا

حزیں

شعیب احمد

یوں غرق تھا ان جلووں میں حزیں نظریں بھی اُٹھانا بھول گیا
خود عینِ فسانہ بن تو گیا، عنوانِ فسانہ بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھیں، مانا وہ تبسم شُعلہ تھا
دل برق کی زد پہ خود آیا، یہ بات زمانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اس کی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوائیں کیا کرتیں دل ہوش میں آنا بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی، آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں نظریں جھکانا بھول گیا

نخشب جارچوی

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مُسکرائے
یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا
بہت اشک روکے بہت مُسکرائے

وہ اس طرح میرے برابر سے گذرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے رُوبرو گر نظر مطمئن ہو
تو سینے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے

میں اس احتیاطِ نظر کے تصدق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جوابِ شکایت تھا نخشب
مرے شعر اُس نے مجھی کو سُنائے

کیف

حکیم ہاشم جان

○

منزل ہے سفر میں مری یا میں ہوں سفر میں
اتنا بھی نہیں ہوش تری راہ گذر میں

حسرت ہے اب اتنی دلِ شوریدہ اثر میں
میں اُن کی نظر میں رہوں وہ میری نظر میں

کیا کیا نہ دکھائی تری رفتار نے شوخی
پس پس گئے فتنے بھی تری راہ گذر میں

تم چھپ نہیں سکتے، کہیں تم جا نہیں سکتے
تم میرے تخیّل میں ہو تم میری نظر میں

ہر قافلے والے سے نہ تھی رسم بڑھانی
ملنا تھا مسافر کی طرح کیف سفر میں

حمیدہ نسیم

بہت جادہ ہے منزل نہیں ہے
یہ مشکل آخری مشکل نہیں ہے

دلِ رہرو میں ہیں کچھ اور خطرے
خیالِ دوریٔ منزل نہیں ہے

خرد باطل خرد پر ناز باطل
مگر یہ جنوں باطل نہیں ہے

یہ دل بے مہر بھی ہے بے وفا بھی
نہیں یہ دل تو میرا دل نہیں ہے

ڈراتا ہے مجھے یوں خندۂ برق
مجھے اندیشۂ حاصل نہیں ہے

میں سب کچھ جانتا ہوں اپنا انجام
مگر اظہار کے قابل نہیں ہے

یہاں قعرِ دریا ہے سفینہ
نہیں اے ناخدا! ساحل نہیں ہے

یہاں مہر و وفا نادانیاں ہیں
یہ دنیا عشق کے قابل نہیں ہے

یہ ہے مرحوم امیدوں کا مدفن
کبھی دل تھا مگر اب دل نہیں ہے

تابش دہلوی

ہو گا سکوں بھی ہوتے ہوتے
سو جاؤں گا روتے روتے

آخر دل ہے ٹھہر جائے گا
شام و سحر کے ہوتے ہوتے

وحشت ناک ہے خوابِ ہستی
چونک پڑا ہوں سوتے سوتے

داغِ دل اشکوں سے مٹے گا
دُھلتے دُھلتے دھوتے دھوتے

آپ سے آپ ترے دیوانے
ہنس بھی دیتے ہیں روتے روتے

اختر ہوشیارپوری

پھر ابر برس کے کھل گیا ہے
مے خانے کا چہرہ دُھل گیا ہے

ان گالوں میں عکس ہے شفق کا
یا رنگ نظر میں گھل گیا ہے

ہشیار غمِ جہاں! ادھر سے
اک پیکرِ کیف دُھل گیا ہے

یہ تیرے بدن کی کسمساہٹ
پھولوں میں زمانہ تُل گیا ہے

اُف تیری نظر کی مے فشانی
دامانِ حیات دُھل گیا ہے

اسماں تو دُور دُور اختر
افسانۂ بوئے گُل گیا ہے!

اقبال صفی پوری

گزر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے
پھٹے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے افسانے

جہاں پہ چاک گریباں بھی چاکِ دل بن جائے
گزر رہے ہیں اب ان منزلوں سے دیوانے

مرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
جو دل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے

ترے حضور جنہیں کہہ سکی نہ گویائی!!
مرے سکوت نے دُہرا دیئے وہ افسانے

نگاہِ عشق میں دیر و حرم کی قید نہیں
کہیں بھی شمع جلے، اُڑ چلیں گے پروانے

تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے!
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ، نہ اعتبارِ جمال!
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے

نہ شمع بزم پہ کچھ آنچ آئے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے

خاطر غزنوی

جب اس زلف کی بات چلی
ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی

[illegible] پھر بھی ہنسی
دیکھ کے سب حالات کلی

شمع کا بھی انجام نہ پوچھ
پروانوں کے ساتھ جلی

پہلے بھی تم دور رہے
اب کے بھی برسات چلی

ان آنکھوں نے لوٹ کے بھی
اپنے اوپر بات نہ لی

خاطر یہ ہے بازیٔ دل
اس میں جیت سے مات بھلی

احمد فراز

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اڑاتی ہے خزاں
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موج رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ جہاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رَو
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

اب کسے رنجِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تم سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

فارغ بخاری

یہی ہے دورِ غمِ عاشقی تو کیا ہوگا
اسی طرح سے کٹی زندگی تو کیا ہوگا

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہم چارہ گری
ہوئی نہ درد میں پھر بھی کمی تو کیا ہوگا

یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا

امید ہے کہ کبھی تو لبوں پہ آئے گی
کبھی نہ آئی لبوں پر ہنسی تو کیا ہوگا

نفس نفس میں فغاں ہے نظر نظر میں ہراس
پھر اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہوگا

رضا ہمدانی

یہ دورِ مسرت یہ تیور تمہارے
اُبھرنے سے پہلے نہ ڈوبیں ستارے

بھنور سے لڑو، تند لہروں سے اُلجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

عجب چیز ہے یہ محبت کی بازی
جو ہارے وہ جیتے جو جیتے وہ ہارے

سیہ ناگنیں بن کے ڈستی ہیں کرنیں
کہاں کوئی یہ روزِ روشن گذارے

سفینے وہاں ڈوب کر ہی رہے ہیں
جہاں حوصلے ناخداؤں نے ہارے

کئی انقلابات آئے جہاں میں
مگر آج تک دن نہ بدلے ہمارے

رضاؔ سیل نو کی خبر دے رہے ہیں
افق کو یہ چھوتے ہوئے تیز دھارے

سلیم واحد سلیم

روح کی تلخ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
دشتِ وحشت ہو کہ زندانِ تمنا کچھ تو ہو

کب تلک یونہی رہیں گے اہلِ دل محروم [illegible]
جراتِ بے باک یا حسنِ تقاضا کچھ تو ہو

ایک سناٹے میں گم ہیں زندگی کی شورشیں
شورِ محشر یا سکوتِ حشر پیدا کچھ تو ہو

اک کرن بھی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو، کوئی آنسو، کوئی تارا کچھ تو ہو

ہم تو دیوانے تھے بربادی مقدر میں رہی
ہوش والوں نے مگر اس در سے پایا کچھ تو ہو

صبح کے نغموں سے گونج اٹھے بیابانِ امید
بول اٹھے یا سکوتِ شامِ صحرا کچھ تو ہو

ہم دلِ بیتاب کو بھی راہ پر لاتے سلیم
دل مگر راہِ وفا میں بھولا بھٹکا کچھ تو ہو

احمد ظفر

آپ کہیں تو گلشن ہے
ورنہ دل اک مدفن ہے

کیسے یہ دن رات کٹیں
ایک مسلسل الجھن ہے

آگ لگی ہے سانسوں میں
ہائے یہ کیسا ساون ہے

ان سے میری بات نہ پوچھ
ان سے میری ان بن ہے

پنچھی پنچھی سہم گیا
دوست یہ اچھا گلشن ہے

تاریکی مٹ جائے گی
مشعل مشعل روشن ہے

وقت کی ہر آواز ظفر
میرے دل کی دھڑکن ہے

ماہ لقا

چندا بی بی

○

[illegible] گا کے غیروں کو مغرور مت کرو
[illegible] جلنا ایسے دیوں سے دستور مت کرو

[illegible] سے بہا کے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
[illegible] عشق ہے اسے مشہور مت کرو

ہر چند دل دُکھانا کسی کا بُرا ہے پر
رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو

اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط
بجز ذکرِ یار تم کوئی مذکور مت کرو

روشن رکھو جہان میں مولا مثالِ مہر
چندا کے منہ سے نور کو تم دور مت کرو

○

شیشۂ دل کو دیا ہوں تیرے ہات
چور یا ثابت ہو رکھ تو اپنے سات

کعبۂ دل ہی سمجھ کر اپنا گھر
اے بُتِ نامہرباں رہ ایک رات

انتظار آخر ہُوا اے گلعذار
غنچۂ لب سے نہ کی پر تُو نے بات

دو ہی دن ملتے ہیں تم گھبرا گئے
پھر خدا ہی جانے کب ہو ایسی گھات

رُوبرو چندا کے ہووے کیا عجب
مشتری و زہرہ و پروین کو مات

ادا جعفری (بدایونی)

فریب کاریٔ تخئیل پر جو اترائے
اب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی اُلجھ جائے

گرہ کشائیٔ شبنم کی داد کیا دیں دل
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے
نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کمھلائے

تری نگاہ کی حیرانیوں کے افسانے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سلجھائے

○

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے — چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے اُن کے اشارے — بوجھل بوجھل تھکے تھکے
دیکھو دیکھو دامن اُلجھا — ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
ان کا تغافل اُن کی توجہ — اک دل اس پر لاکھ تہلکے
اُن کی تمنا اُن کی محبت — دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
غم نے اُٹھائے سینکڑوں طوفاں — دل نے بسائے لاکھ محلّے
پل میں ہنساؤ پل میں رُلاؤ — پل میں اُجالے پل میں دھندلکے
ہم نے نہ سمجھا تم نے نہ جانا — دل نے مچائے لاکھ تہلکے
لاکھ منایا لاکھ بھلایا — نین کٹورے بھر بھر چھلکے
کتنے اُلجھے کتنے سیدھے — رستے اُن کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں پاپڑ بیلے
چھلکے اب تو گھڑا اجل کے

زہرہ نگاہ

○

صبر و ضبط کے لے کے بیشمار نذرانے
تیری یاد آئی تھی، آج مجھ کو سمجھانے

پا گئے ہیں منزل کو خود بخود ہی دیوانے
عقل کے دوراہے پر کھو گئے ہیں فرزانے

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

ان نئی بہاروں پر ان نئے نظاروں پر
ایک نذر ہی کیا ہیں، رو رہے ہیں میخانے

ہائے کیا مصیبت ہے، ہائے کیا قیامت ہے
ہم ہی کھا گئے دھوکہ، ہم چلے تھے سمجھانے

○

خوش جو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو بُرا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

اُس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن
گردشِ دہر تجھے جان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

اس جگہ عقل نے دھوکا کھایا
جس جگہ دل ترے فرمان گئے

اختر

نواب اختر محل

اِک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

خطے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اُڑا دیا
غیروں نے آج اُن کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیر یار کی، نہ قصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

شیریں

نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا
مشہور اسی نے یہ کیا نام ہمارا

پیدا ہوئے ہم اُمتِ محبوبِ خدا میں
برتر نہ ہو کیوں رتبۂ اسلام ہمارا

ہم کہتے ہیں حج کوچۂ دلدار کا اپنے
ہے چادرِ تن جامۂ احرام ہمارا

فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے
کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا

پہلی سی رکاوٹ نہیں اب ہر نظر لطف
آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا

کافر کیا مجھ کو، تری اس زلف نے کافر
اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر شکنی کا
شیریں جو تخلص میں ہوا نام ہمارا

نزاکت

○

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

[illegible] گلِ زنداں میں وہ گلِ زرد
لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

سُرمۂ خاکِ پا عنایت ہو
آگیا ہے غُبار آنکھوں میں

یاد آئے کمر جو گُلشن میں
ہو رگِ گُل بھی خار آنکھوں میں

عالم

نواب بادشاہ محل

○

مجھ سے آزردہ میرا یار ہے آج
صبر کیسا، کسے قرار ہے آج

کل تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے کلام
باتیں کرنے میں مجھ سے عار ہے آج

ساقیا! کس کا جامِ عشق پیا
چشمِ بد دُور، کیا خُمار ہے آج

نہیں ثابت کہ کیا ہُوا دل کو
مثلِ سیماب بے قرار ہے آج

جلد آ، اے عزیزِ مصر جمال!
تیرا عالم کو انتظار ہے آج

مشتری

قمرن جان لکھنوی

○

مے ہے، گلزار ہے، ساقی ہے، گھٹا چھائی ہے
کہہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے

کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں
جان دیتی ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے

کیا جنوں خیز ہے اُس کے گلِ عارض کی بہار
کہ جسے دیکھیے خود رفتہ ہے، سودائی ہے

لی خبر اپنے مریضِ شبِ غم کی نہ کبھی
بس انہی باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے

شبِ فرقت کے جوائے مشتری جاگے تھے ہم
کیا تہِ خنجرِ قاتل ہمیں نیند آئی ہے

زہرہ

امراؤ جان لکھنوی

○

حوصلہ آپ کو جفا کا ہے
یہ نتیجہ مری وفا کا ہے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے
سامنا آج کس بلا کا ہے

اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں
آشنا کون آشنا کا ہے

شیخ نے کعبہ، برہمن نے دیر
درِ مے خانہ ہم نے تاکا ہے

کیا کرے رہ کے ہند میں زہرہ
عزم بالجزم کربلا کا ہے

نازک

زینت بیگم

○

کوچہ میں کوئی سکے، کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک
پر وہ بتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے

یاد آتی ہے اِن آنکھوں میں آمد وہ نشہ کی
ساقی نے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے

غش میں مجھے کل دیکھ کے، وہ ڈر کے یہ بولا
بس ہوش میں آ، کیوں مجھے بدنام کرے ہے

پیغامِ اجل چاہ ہے اُس بت کی، ولیکن
کب عاشقِ جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے

ملتے تمہیں تک دیکھا، تو آنکھیں نہ نکالو
منظور نہیں تو نظرے خوش گذرے ہے

نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا
گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک ورے ہے

موتی

موتی جان

○

گلابی رُوبرو ہے اور ہم ہیں
بس اب جام و سبو ہے اور ہم ہیں

سیا گر تو نے چاک جیب ناصح!
تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں

بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشد
ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں

شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی
خیالِ ماہ رو ہے اور ہم ہیں

یہ جی میں لہر گیا آئی کہ موتی
کنارِ آبِ جو ہے اور ہم ہیں

شیریں

سُنتا ہے کون کس سے کہوں ماجرائے دل
بہتر یہ ہے کسی سے نہ کوئی لگائے دل

کیونکر رہیں حواس جو قابُو سے جائے دل
اے کاش ! موت آئے کسی پر نہ آئے دل

باتیں وُہ دِل فریب ، ادائیں وُہ دل رُبا
ایسے پری جمال پہ کیونکر نہ آئے دِل

بے مہر و بے مروّت و نا آشنا ہو تُم
تُم سے خدا کرے نہ کوئی بھی لگائے دل

شیریںؔ کا یہ کلام ہے ، ہر وقت ہر گھڑی
جس کو خدا خراب کرے وُہ لگائے دل

لطیفؔ

محمدی جان صاحبہ

آیا جمالِ یار کا جلوہ نظر کہاں
نخلِ مُراد نے ابھی پایا ثمر کہاں

کرتے ہیں سیرِ عالمِ لاہوت کی بشر
ہوتا ہے مشتِ خاک کا دیکھو گزر کہاں

عاشق نے تیرے چھان لی دیر و حرم کی خاک
اب اور تجھ کو ڈھونڈے وُہ آ سیم بر کہاں

پوچھوں مَیں کس سے آہ کدھر جاؤں مَیں لطیفؔ
ملتی ہے رفتگانِ عدم کی خبر کہاں

شباب

سین بانڈی بنارسی

○

بے کسی کا لطف تنہائی میں کیا، کچھ بھی نہیں
یار پہلو میں نہ ہو جب تک مزا کچھ بھی نہیں

تم رہو پہلو میں میرے، میں تمہیں دیکھا کروں
حسرتِ دل اے صنم! اس کے سوا کچھ بھی نہیں

حسرتِ دل کی بدولت میری رسوائی ہوئی
اس کا شکوہ آپ سے اے دل ربا کچھ بھی نہیں

قسمتِ بد دیکھئے، پوچھا جو اس نے حالِ دل
مارے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

آپ ہی تو چھیڑ کر پوچھا ہمارا حالِ دل
بولے پھر منہ پھیر کے، ہم نے سنا کچھ بھی نہیں

کوچۂ الفت میں انساں دیکھ کر رکھے قدم
ابتدا اچھی ہے اس کی، انتہا کچھ بھی نہیں

دلبر

اسرار جان

○

سوجھی ہے کتنی دور کی مجھ کو خمار میں
بنت العنب کو پھر میں بٹھاؤں کنار میں

ہم لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں
پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

اللہ رے شوقِ کوچۂ قاتل کہ بعدِ مرگ
اڑ کر مرا غبار گیا کوئے یار میں

تم آگئے تو از سرِ نو زندگی ہوئی
باقی نہیں تھی جان مرے جسمِ زار میں

دلبر کو کربلا میں بلا لیجئے حسین
گھیرا ہے آفتوں نے بہت اس دیار میں

نورجہاں ناز

طے نیم جاں کا آج بھی جھگڑا نہ ہو سکا
تم سے ستم بھی اے ستم آرا نہ ہو سکا

جب دردِ دل کا تم سے مداوا نہ ہو سکا
پھر کچھ بھی تم سے حضرت عیسیٰ نہ ہو سکا

اللہ رے روانیٔ چشمِ شبِ فراق
یوں تیز رو کبھی کوئی دریا نہ ہو سکا

اندھیر ہے کہ موت بھی معشوق بن گئی
ہر چند چاہا رات کو مرنا نہ ہو سکا

کس وقت بہرِ پرسشِ بیمار آئے وہ
جب آنکھ سے بھی اپنی اشارا نہ ہو سکا

شوخ

شہزادی جان اکبر آبادی

تمہارے گیسو و رُخ پر نثار ہم بھی ہیں
اسی خیال میں لیل و نہار ہم بھی ہیں

جو دیکھا جانبِ غیر اُس نے دل پکار اُٹھا
نگاہِ لطف کے اُمّیدوار ہم بھی ہیں

مٹے ہیں آپ تو حورانِ خلد پر واعظ
بتانِ ہند پہ دل سے نثار ہم بھی ہیں

خود اپنے ہاتھ سے تعزیر آپ دیں ہم کو
خطا معاف ہو! تقصیروار ہم بھی ہیں

تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہے ایک نسبتِ خاص
جو آپ شوخ ہیں تو بے قرار ہم بھی ہیں

اختتامیہ

محمد حسین آزاد

○

رنج میں کی جو ہوں یاد ہیں خوں بار آنکھیں
بھرے دامن کو کریں دامنِ گلزار آنکھیں

ہیں غضب میں تری اے ترکِ جفاکار آنکھیں
دل دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں

چشمِ کافر میں نشہ کے ہیں جو ڈورے ساقی
کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زنار آنکھیں

ہے اک جا پہ جم کیونکہ رہیں دو بیمار
تیرا بیمار ہے دل اُن کی ہیں بیمار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

آغا غازی پوری

○

تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطف غبارِ پسِ محمل دینا

ذوق میں صورتِ موج آکے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

ایک فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

مرزا ہادی رُسوا

نالہ رُکتا ہے، تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے، تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھتے دیکھتے پھر تیر خطا ہوتا ہے

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا؟
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

حالِ دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ رُسوا
ایسی باتوں سے وُہ بے درد خفا ہوتا ہے

راسخ عظیم آبادی

مرا سینہ اسے محبت جو بنے تو باغ کرنا
یہ اسی لئے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا

وہ کہاں ہیں جنھوں کو تری جستجو نے کھویا
کبھی گم شُدوں کا اپنے نہ سراغ کرنا

مجھے رفتگی سی کچھ ہے تری چشم دیکھ ساقی
نہ شراب سے لبالب تو مرا ایاغ کرنا

غم دہر سے رہائی نہیں جیتے جی میسّر
نہ خیالِ دار ہی اسے دلِ بے فراغ کرنا

دو جہاں میں تُم کو بس ہے یہی داغِ یار راسخ
شبِ گور کا بھی اپنی تم اسے چراغ کرنا

بے نظیر شاہ

[illegible] ارباب نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو [illegible] نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردۂ حسنِ مجاز میں

[illegible] نگہ جو حسن میں تم جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہیں زلفِ ایاز میں

[illegible] دیدہ یوں طرب آشنائے نوید ہوں
[illegible] ہیں خموشیاں سحرِ دل کے پردۂ راز میں

تو چراغِ دیر و حرم سہی تجھے کیا پڑی ہے جو تو نے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

[illegible] دادِ وفا ملی یہ ارادِ دستِ دعا ملی
[illegible] وفا نے اٹھائے مرے پھول دامنِ ناز میں

جو بنا یہاں وہی لٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

قاضی صادق اختر

جب پردہ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز عذاب ثواب کا

کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض ہیں کروں
کیجے جو آپ مجھ کو نہ موردِ عتاب کا

تقویٰ ہمارے آگے ہے جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

بیٹھے ہوئے کنجِ باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور واں محل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شیخ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

سینے سے اپنا سینہ ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ ریشِ حق تو جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائیے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مائل دہلوی

محمد تقی بیگ

○

بیخودی میں قدمِ غیر پہ سر رکھتے ہیں
شوق سا شوق ترے خستہ جگر رکھتے ہیں

آج کہتی ہے شبِ غم کی سیاہی کچھ اور
آج مر جائیں جو ارمانِ سحر رکھتے ہیں

تم نے دیکھے ہی نہیں درد محبت والے
لاکھوں ایسے ہیں کہ باتوں میں اثر رکھتے ہیں

ہم کو مرنے کا نہیں رنج خوشی ہے اس کی
کہ ہم اپنی خوشی میں اثر رکھتے ہیں

کیا ہوا حضرتِ مائل نے جو دیکھا اس کو
اہلِ دل جتنے ہیں سب ذوقِ نظر رکھتے ہیں

بزم اکبر آبادی

○

مزے اب ان کی اُلفت میں وہ حاصل ہوتے جاتے ہیں
کہ اعضا جس قدر اپنے ہیں سب دل ہوتے جاتے ہیں

کبھی رہتے ہیں آنکھوں میں کبھی رہتے ہیں وہ دل میں
یہ دونوں گھر ہمارے عیش منزل ہوتے جاتے ہیں

مُراد آئی تری اے دل کہ جویا تھا شہادت کا
سنا ہے وہ ستم کرنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں

مرے غم خوار ہمدم ہو کے دم بھرنے لگے ان کا
بڑے عیّار اب تو حضرتِ دل ہوتے جاتے ہیں

عجب کچھ بزم اب تو صاحبانِ فن کی حالت ہے
کہ منہ کی کھاتے جاتے ہیں مقابل ہوتے جاتے ہیں

سورج نرائن مہر

ہمارے حال کی جا کر انہیں خبر تو کریں
وہ کیوں نہ آئیں گے تدبیر چارہ گر تو کریں

کہیں گے عرض بھی کچھ چین لے ذرا اے دل
وہ انجمن میں ہماری طرف نظر تو کریں

بہت سے تشنۂ دیدار روز جا بیٹھیں
کبھی وہ سوئے رہگذر گذر تو کریں

جلا دے شمع کی مانند تو مجھے اے عشق
کہ اور لوگ ذرا تجھ سے الحذر تو کریں

ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بزمِ اعدا کا
کہ ذکر وہ ہے یہ منظور ہو جو شر تو کریں

نہ مجھ سے جذبۂ دل یہ بھی ہو سکا افسوس
کہ قبرِ مہر پہ وہ ایک دن گذر تو کریں

ثاقب کانپوری

اس عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں اے ہوسِ خام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

خالی ہوئے سب جام، نہیں کوئی بھی میکش
اے دُردِ تہِ جام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حسنِ لبِ بام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

اپنے دلِ بیتاب سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انہیں الزام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

تارے سے چمکنے لگے تاریک فضا میں
ہاتھوں میں لئے جام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

امجد حیدر آبادی

کام کب حسبِ مدعا نہ ہوا
اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو
مجھ سے جو اک نفس جدا نہ ہوا

کیا ملا وحدتِ وجودی سے
بندہ بندہ رہا، خدا نہ ہوا

بندگی میں یہ کبریائی ہے
غیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

پاک ہستی سے میری نسبت ہے
میں بُرا ہو کے بھی بُرا نہ ہوا

غیر کی کیا شکایت اے امجد
آہ! جب میرا دل، مِرا نہ ہوا

جگر بریلوی

دل اکیلا رہ کے اُجڑ گیا مجھے میہماں کی تلاش ہے
گل و لالہ کی نہیں ہے ہوس ہمیں باغباں کی تلاش ہے

کوئی اور ہونگے جو بھولے ہوں ہمیں عہدِ رفتہ ہے یاد ابھی
ہمیں ہے بہار کی آرزو ہمیں گلستاں کی تلاش ہے

سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رُخ کیا
ہمیں غیر بس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے

پر و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دِل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے

ہے عجب جگر کا غمِ نہاں، ہے عجیب حسن میں رواں دواں
کبھی داستاں سے ہے بے غرض کبھی داستاں کی تلاش ہے

قمر بدایونی

وہ جو کچھ کہے سچ کہے کہہ چکا
یہ قول اس کا قائم رہے رہ چکا

محبت سی شے اور ظاہر نہ ہو
یہ راز اور مخفی رہے رہ چکا

جو کہتا ہے مجھ سے یہاں نامہ بر
یہی ان سے جا کر کہے کہہ چکا

اب اس چشمِ حیراں میں آنسو کہاں
یہ دریا کہاں تک بہے بہہ چکا

سنے گا وہ کیا حالِ دل غور سے
جو تمہید ہی پر کہے کہہ چکا

حسینوں کی بے باکیاں دیکھ کر
یہ دل میرے بس میں رہے رہ چکا

قمر ہیں نقاہت سے دم ہی نہیں
بیاں اب کہاں تک کہے کہہ چکا

اُمید امیٹھوی

آئینہ ہے اگرچہ سکندر لئے ہوئے
میں اس سے کوئی چیز ہوں بہتر لئے ہوئے

کہتا ہے ان سے دردِ محبت کی داستاں
دل کے عوض جو بیٹھے ہیں پتھر لئے ہوئے

وہ چیز ہے کچھ اور جو ہوتی ہے جانستاں
قاتل وہی نہیں کہ ہو خنجر لئے ہوئے

واعظ یہ خوبیاں ترے جامِ طہور کی
محراب جھک پڑے نہ کہیں در لئے ہوئے

بس جانئے کہ غم سے زمانہ خراب ہے
جب دیکھئے مجھے مے و ساغر لئے ہوئے

اک وہ کہ جد و جہد سے قسمت بدل گئی
اک ہم کہ رو رہے ہیں مقدر لئے ہوئے

افسانے میں بھی رحمتِ حق کے سنا کیا
اک گوشہ میں الگ مے و ساغر لئے ہوئے

ملنا تھا اس نظر سے نظر کا کہ کوئی مچھینہ
دل تک اتر گئی مرے نشتر لئے ہوئے

امید پھر بھی مجھ سے زمانہ خلاف ہے
تیغ و علم لئے ہوں نہ لشکر لئے ہوئے

بنواری لال شعلہ

○

ہے عشق میں ابرو کے جو کاہیدہ تن اپنا
سایہ تری تلوار کا ہوگا کفن اپنا

اس منہ کی کریں بات ذرا منہ کو تو بنوائیں
غنچوں سے کہو صاف تو کرلیں دہن اپنا

پرکھولے ہوئے کرتی ہیں پریاں مرا ماتم
اندر کا اکھاڑا ہے یہ بیت الحزن اپنا

کیا کہتے ہیں سُن سُن کے مرے شعر کو شعلہ
اعدا کے لئے تیغ ہے گویا سخن اپنا

وحشی شاہجہانپوری

○

اس وعدہ کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دُشوار بھی ہے
ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

ہے دُور تو ہے پرواز وہی، نزدیک ہے تو انداز وہی
ظالم تری چتون ناز بھری کیا تیر بھی ہے تلوار بھی ہے

دینار و درم کچھ پاس نہیں ہاں! مہر و وفا کی دولت ہے
بازار جہاں میں دل میرا نادار بھی ہے زردار بھی ہے

جس طرح ہو اک زندانی غم آزاد حدود زنداں میں
اس دام گرہستی میں بشر مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

دُنیا کو ہے جانا ایک نے گھر اور ایک نے مانا راہ گذر
کہتے ہیں جسے مرنا وحشی آسان بھی ہے دُشوار بھی ہے

برقؔ دہلوی

[illegible] حجابِ رخِ پُرنور نہیں
تشنہ گر ہو نگہِ شوق تو کچھ دور نہیں

شبِ فرقت نظر آتے نہیں آثارِ سحر
اتنی ظلمت ہے رخِ شمع پہ بھی نور نہیں

رازِ سربستۂ فطرت نہ کھلا ہے نہ کھلے
میں ہوں اس سعی میں مصروف جو مشکور نہیں

صرف نیرنگیٔ نظارہ ہے خود اپنی نظر
عینِ وحدت ہے کوئی ناظر و منظور نہیں

نظر آتا نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں
ذوقِ صادق یہی کہتا ہے کہ کچھ دور نہیں

کیفیؔ چڑیا کوٹی

ہوئی تھیں پست جس دم ہمتیں جوشِ اسیراں کی
ستم دیکھو کہ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

خدارا مطربِ لذت نوا تو اس کو چھیڑے جا
ترے نغمے سے اب ملنے لگی جنبش رگِ جاں کی

مزا آیا ہے ان کو چھیڑنے کا صحنِ گلشن میں
اڑا جب رنگِ رخ رنگت نکھر آئی گلستاں کی

عدم کہتے ہیں جس کو صورتِ خوابِ پریشاں ہے
یہ ہستی کچھ نہیں تعبیر ہے خوابِ پریشاں کی

بہارِ دل کشا کھولے گی، بلبل نغمہ خواں ہو گی
کلی کے ہر ورق میں داستانیں ہیں گلستاں کی

میں بیٹھا ہوں جہاں تھک کر سمجھ میں آ گیا کیفیؔ
مری درماندگی سے اصل وسعت ہے بیاباں کی

اقبال احمد سہیلؔ

عرشِ بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا
جس دل کو تُو نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

درسِ جنونِ عشق کو کچھ ظرف چاہیئے
دیوانہ کیا بنے گا جو عاقل نہیں رہا

چشمِ کرم کی شوخیٔ طرزِ ستم نہ پُوچھ
غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا

گم تھی فضائے حُسن میں کل کائناتِ حُسن
اٹھا غبارِ قیس تو محمل نہیں رہا

اب بھی دلِ حزیں سے تغافل شعار ہاں
اب یہ تری نظر ہے مرا دل نہیں رہا

جب سے جمالِ عشق ہے پیشِ نظر سہیلؔ
میں آب و رنگِ حُسن کا قائل نہیں رہا

اکبر حیدری

جہانِ حُسن میں محوِ ترنّم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے وفا میری

دلِ مضطر کو جس پر اعتبارِ حکمرانی تھا
مرے احساسِ خودداری میں ہے وہ انتہا میری

امینِ دورِ مستقبل ہیں میری خاک کے ذرّے
حقیقت ہیں بقا کا پیش خیمہ ہے فنا میری

مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی
ہوئی ہے جذبۂ اشکِ خونفشاں میں وہ دُعا میری

جہانِ قدس تک رُوحِ تخیل سیر کر آئی
مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا میری

اک آنسو اور وُہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائیگی دُنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبرؔ
سُنی ہے کاتبِ قسمت نے برسوں التجا میری

مانی جائسی

نہ رہی وہ کشش تیغِ ادا میرے بعد
جذب کھو بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد

کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد
کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد

کشتنی میں تھا سو مقتل میں تہ تیغ ہوا
اب ہو منتظرِ اہلِ وفا میرے بعد

صبح آخر مری صبح شبِ ہجراں تھی مگر
شمع و پیمانہ میں بھی ربط نہ تھا میرے بعد

خلش پرسشِ محشر تھی مری سب بے گنہی
نظر آیا مرے قاتل کو خدا میرے بعد

رواں

(جگت موہن لال)

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھ اے مرے خلاقِ حُسن رائیگاں میرا

ہوا اس کو اُڑا لے جائے یا اب پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا مری جب آشیاں میرا

یہ کہہ کر رُوح نکلی ہے تنِ عاشق سے فرقت میں
مجھے مہلت ہے بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

عناصر سنتے ہیں دُنیا کی وسعت مسکراتی ہے
کسی سے پُوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

مرے بعد اور پھر کوئی نظر مجھ سا نہیں آتا
بہت دن تک کرینگے سوگ اہلِ خانداں میرا

رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

اطہر ہاپوڑی

وہ حُسنِ حیرت افزا اک نظر دیکھا نہیں جاتا
جدھر وہ جلوہ فرما ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

نظر سوزی غضب ہے اُس کے حُسنِ روز افزوں میں
بہت دیکھا ہے اس کو اب مگر دیکھا نہیں جاتا

نگاہیں جذب ہو جاتی ہیں اُس کے حُسنِ دلکش میں
کسی جانب پھر اس کو دیکھ کر دیکھا نہیں جاتا

کلیم اللہ سچ کہتے ہیں اُس کے حُسن کا جلوہ
وہ خود دکھلائے تو بھی اک نظر دیکھا نہیں جاتا

مرے ذوقِ نظر کی داد یوں دیتے ہیں وہ مجھکو
کہ اب دنیا میں یہ ذوقِ نظر دیکھا نہیں جاتا

یہ سب سوز و گدازِ شمع سے ہے گرمیٔ محفل
کوئی پروانہ ہنگامِ سحر دیکھا نہیں جاتا

مرے غمخوار اطہر اٹھ گئے یہ کہہ کے بالیں سے
یہ بیتابی کا عالم رات بھر دیکھا نہیں جاتا

بیتاب عظیم آبادی

نہ میرے دل نے نہ ادراکِ نکتہ جُو نے کیا
خدا گواہ ہے جو کچھ کیا وہ تُو نے کیا

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بُو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کہیں کے رہتے نہ آوارگانِ دشتِ جفا
بڑا کرم کششِ زُلفِ مُشکبو نے کیا

بہار آئی تو کیا ناشگفتہ خاطر کو
فسردہ اَور بھی اس موسمِ نمو نے کیا

تمہاری چارہ گری کو سلام ہے میرا
کہ ایک زخم کو سو زخم اک رفو نے کیا

وہ کیونکر آ کے ملے خود یہ حال مجھ سے پوچھ
بر آرِ مقصدِ دل ترکِ آرزو نے کیا

بجز اپنے دل کے نہ پایا کسی نے اس کا نشاں
ہزار عقل کو آوارہ جُستجو نے کیا

بڑی امید بندھی بے بسوں کو محشر کی
عجب کرشمہ ترے طرزِ گفتگو نے کیا

کہوں گا یار سے میں صاف صاف حشر کے دن
کہ مجھ سے ہجر میں جو کچھ ہُوا وہ تُو نے کیا

بجا رہے نہ مرے عقل و ہوش اے بیتاب
غضب کا مست مجھے پہلے ہی سبُو نے کیا

نشتر جالندھری

فضا ہے رقصاں کھلے ہیں تارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو
ابھی چلے آؤ گھر ہمارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

ادھر تو آؤ کہ ساز دل پر ترانۂ مہر و وفا کا چھیڑیں
اسی تمنا میں دن گزارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

کسی نے میلی نظر سے دیکھا نہیں تو غیرت سے کٹ مرے ہم
لگے اُبلنے لہو کے دھارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہاری خاطر لپکتے شعلوں کو ہم نے بڑھ کر گلے لگایا
گل اِن کو جانا جو تھے شرارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہارے کہنے پہ زلف و قامت سمجھ کے دار و رسن کو چوما
میلۂ خوں میں بھرے طرارے، کبھی ہمارا کہا بھی مانو

یہ کس کی تربت ہے آہ نشتر کہ اب تک آواز آ رہی ہے
ہمیں تو ہیں بے رخی کے مارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

نجم آفندی

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور
پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سنا ہے
شاید کوئی رستے میں مری طرح گرا اور
اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور
منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور
للہ گلہ کر کے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اُس نے کہا اور
کیا زیر لب اے دوست ہے اظہار حقائق
حق ہو کہ وہ ناحق ہو ذرا لے تو بڑھا اور
دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا منعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور
یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

مجنوں گورکھپوری

رہ جائیں فلک والے شورش سے نہ بیگانہ
زاہد کو تڑپا دے اے نعرۂ مستانہ

پھر اور بھی جلوے ہیں کچھ اور بلاوے ہیں
لے تیرا خدا حافظ اے جلوۂ جانانہ

میخانے کی حرمت کا کچھ پاس بھی ہے لازم
لغزش میں قرینے سے اے لغزش مستانہ

آزادی کی دھومیں ہیں شہرے ہیں ترقی کے
ہر گام ہے پسپائی ہر وضع غلامانہ

اے عقل و خرد والو مجنوں کا گلہ کیسا
دیوانے کو کیا کہیے دیوانہ ہے دیوانہ

میکش اکبر آبادی

رات اس محفل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں
تجھ سے اپنی زندگی کے ماجرے
ٹھہر ہمدم سانس لے لوں تو کہوں
ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں
آپ کی میری کہانی ایک ہے
کہئے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں
آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں
دیکھنا ہے تیرا یہ عالم مجھے
چاہے بہ نکلے مری آنکھوں سے خوں
ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

بہزاد لکھنوی

○

عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم
دل جھکا نفس نفس سر جھکا قدم قدم

مقصدِ حیات ہے، مرکزِ ممات ہے
روئے یار رخ بہ رخ زلفِ یار خم بہ خم

آ دلِ بلند ہو، اے خلش دوچند ہو
پھر سکون دے چلا اضطراب دم بدم

کچھ خرد سے کام لے کچھ جنوں سے کام لے
آ رہی ہیں منزلیں راہ میں قدم قدم

میں عجیب رند تھا ہوش سے نہ بچ سکا
بے خودی میں بھی رہا امتیازِ بیش و کم

جلیل قدوائی

○

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں
ترے ہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر
کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہِ خاموشی
بیانِ رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں
کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

عطائے خاص ہے تیری مرا فروغِ جنوں
[illegible] ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہہ دے کہ میرا عشق جلیل
بہانہ ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

اثر صہبائی

آنسوؤں کی جھڑی عمر بھر ہوتی رہی
دل کی دنیا منتشر ہی منتشر ہوتی رہی

ہر حسیں کی بندگی ذکرِ خدا کے ساتھ ساتھ
ہر زمانے میں بہ اندازِ دگر ہوتی رہی

بادۂ الفت میں ناکامیوں کی آندھیاں
آتشِ شوقِ محبت تیز تر ہوتی رہی

تجھ سے مل کر پھر نہ بہم ہو سکا دل کا سکوں
عقل کون و مکاں زیر و زبر ہوتی رہی

پھر عجب عالم رہا ہے دورِ الفت میں اثر
روح پر اک بارشِ کیف و اثر ہوتی رہی

امین حزیں

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہمنشیں تم سے بیاں حسن کی بیداد نہ کر

پھونک دے نغمۂ جاں سوز سے سامانِ قفس
بلبلِ تفتہ جگر شکوۂ صیاد نہ کر

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ ہو دل مستِ خودی
آسماں تک سے یہ کہہ دے مری امداد نہ کر

یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف امیں
ظرف عالی ہے ترا جیتِ فرہاد نہ کر

عبدالمجید بھٹی

○

اٹھنے کو ہے چلمن، وہ نہاں ہوں کہ عیاں اور
آنکھوں میں نہ آئے گا نیا کوئی سماں اور

گلشن میں ہم رہ کے بھی ہیں اجنبی دونوں
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور

یہ ترش نگاہی بھی ہے اقرار محبت
کیوں اپنی جفا پر انہیں ہوتا ہے گماں اور

مغرور خداوندو! ڈرو صدق و فا سے
وہ وقت بھی آتا ہے کہ جھکتی ہے کماں اور

یارب ہے وفا داد طلب اُن کی جفا سے
دے اور نہ دل ان کو نہ دے ہم کو زباں اور

وامق جونپوری

○

زباں تک جو نہ آئے وہ محبت اور ہوتی ہے
فسانہ اور ہوتا ہے، حقیقت اور ہوتی ہے

نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے

یہ مانا شیشۂ دل رونقِ بازارِ اُلفت ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو قیمت اور ہوتی ہے

نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں کو
چھپانے سے زمانے بھر میں شہرت اور ہوتی ہے

یہ مانا حُسن کی فطرت بہت نازک ہے لے وامق
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

ن م راشد

پلا ساقیا مئے جاں پلا کہ میں لاؤں پھر خبرِ جنوں
یہ تری رات چھپنے کہیں نظر آئے پھر سحرِ جنوں

غمِ عاشقی میں گرہ کشا نہ خرد ہوئی نہ جنوں ہوا
وہ ستم ہے کہ نہیں رہا نہ پتہ خرد نہ سرِ جنوں

رہی منزلیں وہی دشت و در ترے دل زدوں کے ہیں رہبر
وہی آرزو وہی جستجو وہی راہ پُر خطرِ جنوں

نہیں امتیاز مرے مہر و شب و روز میرے غبارِ راہ
کہ تمام دورِ فلک کا اور ہے علیحدہ بال و پرِ جنوں

دمِ نظارہ کا ہوش تھا کوئی جوش تھا نہ خروش تھا
کہ آپ ان کی نگاہ تھی سرِ راہ پردہ درِ جنوں

اسی ایک لغزشِ کارواں میں نکل کے آج رواں دواں
کھلا دیا تھا الست میں کہیں ایک طاقِ درِ جنوں

نہ تو اُس کے ہاتھ میں ہو قلم نہ تو واسطہ اسے سنگ سے
تھا ایک پارۂ سنگ سے کمالِ نقش گرِ جنوں

ہے وہ مبتلا کو تعجب ہے جسے لئے وہ دعا بہ لب
کھلے تھا رہیں نہ زدِ شب ہے نگار خود نگرِ جنوں

تھا عجیب سا شبِ بے نوا وہ سرود دولتِ بے بہا
ہوا ہم سے ... نظر جنوں

جمیل مظہری

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوشش پیہم تو ہوتی اُٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کیلئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

ہستی ہے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا سے اگر ہوتا نہ جدا قطرہ کیونکر قطرہ ہوتا

ق
اسے گو کہ بہت تقصیر تو نے فطرت کی پہنائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں اے کاش نہیں توڑا ہوتا

تخئیل غلط آزادی کی جب فطرت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؛

پابند نہ ہوتی گر یہ زمیں سورج سے جا کر مل جاتی
پابند نہ گر ہوتیں موجیں ساحل کی جگہ دریا ہوتا

پابند نہ ہوتے گر تارے تو آپس میں ٹکرا جاتے
سارا یہ طلسمِ ارض و سما اک پل میں ٹوٹ گیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ ہوا چلتی اک ایسی تیز آندھی
ذرات میں اک ہلچل ہوتی شیرازۂ کل بکھرا ہوتا

گر یہ ہی حل محدود ہے یہ فلسفۂ اخلاق یہی
اے کاش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی سمجھا ہوتا

آزادی مطلق لعنت ہے ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کا خلعت انساں نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

ہر بات جمیل زار کی ہے تدبیرِ بقا تعلیمِ عمل!
خاموش سہی خوددار سہی تم نے تو کبھی چھیڑا ہوتا

جاں نثار اختر

ہر سمت افق پہ ہیں دھندلکے
پیمانۂ صبح جلد چھلکے

آغازِ نوائے شوق جیسے
چھیڑے کوئی ساز ہلکے ہلکے

کچھ بھید کھُلے مری نظر سے
کچھ راز تری ہنسی سے جھلکے

موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو
دامن پہ ترے اگر نہ ڈھلکے

وہ رنگ رہا نہ روشنی میں
اس سے تو حسین تھے دھندلکے

یہ منتِ مہر و ماہ کب تک
گیتی سے کہو کہ آپ چھلکے

اِس شیشۂ آرزو سے اختر
کیا جانئے کتنے رنگ چھلکے

علی سردار جعفری

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

لبوں پہ مُہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کیلئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اُجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

کوئی یہ ایوانِ حکمرانی میں جا کے میری طرف سے کہہ دے
زبان چھینی ہے تم نے جس کی یہ شاعرِ نغمہ زن وہی ہے

مخمور جالندھری

یہی ہیں ان کے نگار خانے، یہی ہیں ان کے محل رفیقو
جو کتنی صدیوں سے اپنے دل کی جلن سے ہیں کسک رہے ہیں

ہمیں گماں ہو چلا ہے ہم ابتدا سے پہچانتے ہیں ان کو
نگاہ کی اب ذرا سی اک چھیڑ ہی سے پردے سرک رہے ہیں

ہمیں اگر ان کے بند کھولے پکارتی ہے یہیں ہے سب کچھ
ادھر نہ جاؤ کہ خلد و کوثر سبھی طلسمِ فلک رہے ہیں

آلودہ مشرق سے ساغرِ آفتاب مخمور تم تک آیا
کرو نہ غم کیسے کیسے حالات شام سے صبح تک رہے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسن

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے
بہار باقی ہے زخمِ بہار باقی ہے

یہ انتظار کی گھڑیاں کنارِ جوئے چشم
امید ڈوب چکی، اعتبار باقی ہے

عجب نہیں ہے کہ شبنم سے موت ہو جائے
گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے

رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں بولا
ابھی تو جیب و گریباں میں تار باقی ہے

مری بہار کی آسودگی میں اے مسعود!
سنا ہے تُو ہی نقطۂ بے قرار باقی ہے

عظیم قریشی

رنگ کہاں ہے سایا سا ہے
نقش کہاں ہے دھوکا سا ہے

صبح کی رنگت زردی مائل!
شام نہیں ہے دھڑکا سا ہے

سیلِ عشق تھا کب ہوگا
دریا ہے اور چڑھتا سا ہے

حُسن و عشق بڑے دو کافر
دونوں میں اک جھگڑا سا ہے

دل نے بدلا روپ ہو شاید
دُور پرے جو کھرا سا ہے

آؤ پیار سے دھو لیں اس کو
نقش جہاں کچھ میلا سا ہے

آج عظیم کو شاداں دیکھا
شاعر ہے پر کانٹا سا ہے

حامد عزیز مدنی

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں

کُھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں میں فسوں
جو شاخِ گُل میں جو موجِ گہر میں ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

گذر رہا ہے تو آنکھیں چُرا کے یُوں نہ گذر
غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے ہیں

سرشتِ گِل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

شورؔ علیگ

مرے دل کی دھڑکن اس کے تبسم پہ گراں کیوں ہو
میں افسانہ ہوں اُس کا وہ مرا افسانہ خواں کیوں ہو

مرے کام آ گئی آخر مری کاشانہ بردوشی
لپکتی بجلیوں کی زد پہ میرا آشیاں کیوں ہو

کناروں سے گذر جانا ہی طوفانوں کی فطرت ہے
جہاں دُنیا ٹھہر جائے قدم میرا وہاں کیوں ہو

ترا جلوہ ہی جب تیرا ہی پردہ ہوتا جاتا ہے
تو پھر میری نگاہوں پر نگاہوں کا گماں کیوں ہو

نہیں وارفتۂ مطرب، نہ میں جاں دادۂ ساقی
اگر محفل سے اٹھ جاؤں تو محفل بدگماں کیوں ہو

میں جب جادہ میں ہوں اپنی جگہ اے شورؔ تنہا ہوں
جدا ہو جس کی منزل وہ رہینِ کارواں کیوں ہو

صدقؔ جائسی

کیا کرے چشم غلط انداز بے تقصیر ہے
اے شہ خوباں کہاں بھاری ہے ہلکا تیر ہے

میرا منہ چھوٹا، بڑی باتوں میں کیونکر دخل دوں
سامنے تصویر یوسف کے تری تصویر ہے

میں بھی دل رکھتا ہوں کیا مجھ کو نہیں شوقِ حرم
خاک بُت خانے کی لیکن پاؤں کی زنجیر ہے

آنکھ کے اندر نگاہِ ناز ہے کتنی غریب
آنکھ سے باہر یہی چلتی ہوئی شمشیر ہے

صدقؔ سچ پوچھو تو پُوجا حسن ہی کی ہے بجا
لب کشائی میں خدا کا خوف دامن گیر ہے

خمار بارہ بنکوی

ہجر کی رت غمگین فضائیں اُف ری محبت ہائے جوانی
جینے کے دن مرنے کی دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

وعدہ کی شب خاموش فضائیں دل میں خلش وہ آئیں نہ آئیں
در پہ نگاہیں لب پہ دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

مہکی ہوئی گلشن کی فضائیں بہکی ہوئی ساون کی گھٹائیں
ہاتھ میں ساغر سر پہ گھٹائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

رخصتِ جاناں ایک قیامت اس پہ قیامت مجھ سے اجازت
آنکھ میں آنسو لب پہ دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

ہم تھے خمار اور پہلوئے جاناں بس میں تھی جیسے گردشِ دوراں
کاش وہ دن اب یاد نہ آئیں اُف ری محبت ہائے جوانی

نشور واحدی

نظر نظر کو ساقیٔ حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تجلیات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دئے تو التفات کہتے آئے ہیں

ہنسی بجا نہیں تری یہ وعظِ ترکِ عشق پر
یہ بیخبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

یہ نوجواں تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

وہ ظرفِ مے جسے نہ زہر کی نظر سمجھ سکی
ہم اس کو شیشۂ تجلیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

یکرنگ

(مصطفٰے قلی خاں)

لب شیریں سے تلخ کاموں کو
بولنا تلخ کام ہے تیرا

ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تُو
یہی گویا سلام ہے تیرا

اگر آوے مرے گھر وُہ پیارا
کروں اس ماہ کو پُتلی کا تارا

مرا دشمن ہُوا یکرنگ وُہ شوخ
کیا کیوں عشق مَیں نے آشکارا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہو تو لے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

کلیم

محمد سبحن

ہر تار پیچ زُلف کا، عالم کی جان ہے
گویا یہ اژدھا تھا کہ سب کو نگل گیا

نقاب اپنے رُخ کا جو تو باز کرتا
تو گل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس
وے دن گئے کلیم کہ شیشہ سنگ تھا

قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم
آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا

بیری کی بھی سیر کر گئے ہم
اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پُر نم
یاں مارے ادب کے مر گئے ہم

محسن

محمد محسن

○

دل مرا وابستۂ ہر تارِ زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے

اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا، مگر
جان برلب آمدہ، حاضر ہے گر درکار ہے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
مجھ کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

جس دن تری گلی سے مَیں عزمِ سفر کیا
ہر یک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا

محسن مرا نہ مَیں تو بھلا جی کے کیا کروں
اک دل بساط میں تھا سو مَیں وہ بھی کھو چکا

ممتاز

حافظ فضلو

○

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ڈروں ہوں کس لئے رنجش سے، پیار میں کیا تھا
مَیں اب خزاں کو جو رو دوں، بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور ان کی خاطرِ امیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیٔ ناپائیدار میں کیا تھا

کیونکہ سرسبز ہو شاہی و گدائی کی ہوس
رہ گئی آہ مرے دِل میں خدائی کی ہوس

بال و پر توڑ کے جب تُو نے قفس کو سونپا
وہیں آخر ہوئی صیاد رہائی کی ہوس

گذرا کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں
آتا ہے نظر جامۂ گُل چاک چمن میں

مجذوب

مرزا غلام حیدر

○

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

ہمارا ہم سے جو عہد وفا ہے اس کو تم جانو
[illegible]یان کچھ ورع دگر ہووے تو میں جانوں

نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

آوے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ کبھی ہو بیٹھتے ہو، گاہ خدا ہو

ماہر

فخر الدین خان

○

چشم اس سے ترحم کی نہ رکھ رد رو کے ماہر
کب پہنچے ہے وہ دیدۂ خوں بار کسو کا

جو اسکے در پہ بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں وہ در کس کا
ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

میں تو مانوں ترا سخن ناصح
پر نہیں دل پہ اختیار اپنا

مدت ہوئی کہ دل کی مجھ تک خبر نہ پہنچی
ملتا نہیں نشاں کچھ اس بے نشاں سے مجھکو

تو تو کب اعتبار مانے ہے
جس پہ گذرے ہے سو ہی جانے ہے

کوئی نہ بھلا کام ہوا عمر میں ہم سے
امید ہے بخشش کی مگر تیرے کرم سے

غضنفر

غضنفر علی خاں

جاتے ہیں وہاں سے گر کہیں ہم
ہر پھر کے پھر آئے ہیں وہیں ہم

صد حیف کہ کنجِ بے کسی میں
کوئی نہیں اور ہیں ہمیں ہم

خاموشی کی مُہر ہے دہن پر
ہیں حلقۂ غم میں جُوں نگیں ہم

آیا نہ وُہ شوخ اور گئے آہ!
حسرت ہی بھرے تہِ زمیں ہم

تکتے رہے جانب دراسے والے
مُڑ مُڑ کے بوقتِ واپسیں ہم

قسمت میں تو ہجر ہے غضنفر
اب وُہ ہے تو آپ میں نہیں ہم

نصرت

بن ترے آئے پریشاں ہیں سبھی سامانِ عیش
مے کہیں، مطرب کہیں، ساقی کہیں، ساغر کہیں

کاروانِ عشق سے بچھڑا ہیں اب جاؤں کدھر
گم صدائے زنگ ہے اور چل بسے رہبر کہیں

جس کو غمِ عشقِ گل رخاں ہو
کب اس کو ہوائے بوستاں ہو

وہ دوست جو مہرباں ہو کیا غم
تو دشمنِ جاں مرا جہاں ہو

طبیبوں نے جو دیکھا نبض کو میری تو یہ بولے
یہ جاوے گا تمہارے جی کے ساتھ آزار دیکھو گے

نہ دوگے شربتِ دیدار گر بیمار کو اپنے
تو جی دے گا تمہارا طالبِ دیدار دیکھو گے

ذکی

[illegible]

قاصد کے ہوش [illegible] بڑا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

شکل حباب کیا کیا آنکھوں سے رنگ دیکھے
کیا چشم تر کا ساغر جام جہاں نما تھا

اک بات پر تمہارے سوجی ہے ہم تھے قرباں
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانئے وہ کیا تھا

آئی صبیح رنگ پہ سرخی شراب کی
مہتاب پر سفیدیہ کھنچی آفتاب کی

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی صفات کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

کس زندگی پہ کیجئے سامانِ بزمِ عیش
مہمان چار دن ہیں بہاریں شباب کی

قبول

مرزا مہدی علی خاں

یہ عشق ایسا نہیں جس کی حرارت دور ہو دل سے
رہیں گے زندہ جب تک ہم نہ اترے گا بخار اپنا

غرورِ حسن سے پھر کر نظر کرتا نہیں ظالم
پریشاں توسنِ جاناں کے پیچھے ہے غبار اپنا

ملے سب دوست دشمن اپنے ہوئے انس سے خالی
نہ گل اپنا ہوا گلزارِ عالم میں نہ خار اپنا

خزاں ہمیشہ ہے جامہ سے گل نہ باہر ہوں
اگر بہار کی دو دن ہوا ہوئی تو کیا

نہ کچھ جواب ملے گا، نہ تو پھرے گی ادھر
جو تجھ سے نامہ بری اے صبا ہوئی تو کیا

لحد میں جان سے ملنے کو جسم تڑپے گا
جو روح قیدِ بدن سے رہا ہوئی تو کیا

جسم ہلکا جو ہوا روح نے قوت پائی
عشق میں ترکِ غذا سے مری طاقت نہ گئی

سحر

(راجہ) نواب علی خاں

○

دل ترے زلفِ مسلسل کا گرفتار ہوا
سلسلہ مل گیا زنجیر سے سودائی کا

شانہ و آئینہ اب ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں
خود نمائی سے بڑھا شوق خود آرائی کا

حشر کرتا ہے یہ کہنا آپ کا بالائے بام
لو سوا نیزے پہ سورج آشکارا ہو گیا

ہائے ناکامی تب آیا ساقیٔ پیماں شکن
جب ہماری عمر کا لبریز ساغر ہو گیا

قفس میں نالوں سے مطلب ہے یہ اسیروں کا
بہار میں نہ چھٹے ساتھ ہم صفیروں کا

بہار ہے ترے کوچے کی اس قدر دلکش
کہ پاؤں اٹھ نہیں سکتا ہے راہ گیروں کا

آباد

مرزا مہدی حسن خاں

○

زمیں کو آسماں تیرے تصور نے بنایا ہے
ملا ہے مرتبہ دل کو ہمارے عرشِ اعظم کا

اسی حسرت میں آنکھوں سے انہیں ہر دم بہاتا ہوں
کوئی تو لختِ دل ہیرا نگیں ہو تیرے خاتم کا

جا کے ہو آتا ہے ہر دم یار تک پیکِ خیال
میں نہیں محتاج اب بہرِ خبر جاسوس کا

اب چھپانے سے ہمارے عیب چھپنے کے نہیں
سو جگہ سے چاک پردہ ہو گیا ناموس کا

تیس دن میں ایک دن دیکھا نہ روئے رشکِ ماہ
میں نے منہ اس چاند میں دیکھا تھا کس منحوس کا

آتا ہے جی میں چیر کے پہلو کو ایک دن
دکھلا دوں اس کو حالِ دلِ بے قرار کا

دل میں کبھی نہ گرد کدورت کو راہ دے
اس آئینہ میں کام نہیں ہے غبار کا

ماہ

مرزا عنایت علی بیگ

○

برباد میری خاک نہ کر کوئے یار سے
اِس سرزمیں سے مجھ کو نہ اے آسماں اُٹھا

کس روز روبرو مرے آئے وہ بے نقاب
آنکھوں کے سامنے سے یہ پردہ کہاں اُٹھا

کیا سوجھی ہم کو مشقِ تصوّر سے دُور کی
آنکھوں کے آگے پھر گئی صورت حضور کی

تم سے پری کی شکل ہے اچھی نہ حُور کی
دل دے رہا ہے مجھ کو خبر دُور دُور کی

اچھا ہُوا حرم سے نکالے گئے صنم
صورت یہی تھی شانِ خدا کے ظہور کی

تم سا حسیں زمانہ میں اب دوسرا نہیں
اعضاء ہیں سب بشر کے تو صورت ہے حُور کی

حاصل ہُوا ہے خواب میں مجھ کو وصالِ یار
یُوسف کو ڈھونڈتا ہُوں میں تعبیر کے لئے

خلیل

دوست علی

○

تھی کس کو صنم آپ کے آنے کی توقع
آنا مرے گھر میں ہے خدا ساز تمہارا

یاں داغ ہے واں آپ کا آئینہ مصفّا
دل سوز یہ میرا ہے وہ دمساز تمہارا

مرتا ہوں خبر لو مری اے رشکِ مسیحا
کیا حشر کو کام آئے گا اعجاز تمہارا

دیکھیں نہ تجھے صبح و مسا ہم سے نہ ہوگا
یہ اے بُتِ کافر یہ خدا ہم سے نہ ہوگا

ترجیح عبث دیتے ہو فرہاد کو ہم پر
سر پھوڑ کے مر جائیں یہ کیا ہم سے نہ ہوگا

مُجرم ہیں گنہگار ہیں شرمندہ ہیں دل میں
مُنہ اس کی طرف وقتِ دُعا ہم سے نہ ہوگا

تعریفِ بُتاں کیجیے کیا حد سے زیادہ
کہہ دیجیے بندے کو خدا ہم سے نہ ہوگا !

منتہیٰ

مرزا مہتاب بیگ

اشک کو تاثیر دی اچھا کیا
قطرۂ ناچیز کو دریا کیا

شربت وصلت پلایا یار نے
ہجر کے بیمار کو اچھا کیا

دغطی دکھلاؤں گا فردِ جبیں
حشر میں پوچھا جو مجھ سے کیا کیا

تاثیرِ عشق گبر و مسلماں پہ کر گیا
ساقی شرابِ ناب سے دو جام بھر گیا

اچھا ہوا شباب کا عالم گذر گیا
اک جن چڑھا ہوا تھا جو سر سے اتر گیا

اس کا بندِ نقاب وا تو نہیں
درِ باغِ ارم کھلا تو نہیں

سر ہی حاضر ہے جانِ عاشق بھی
اور صاحب کا ادعا تو نہیں

اعظم

مرزا اعظم علی

ساقی نے دیا جام سے بے خبری کا
اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

ہر ظلم رسیدہ ہے ترے جور سے راضی
شکوہ نہیں کرتا کوئی بیدادگری کا

لیلیٰ کو کھولنے دو ذرا گیسوئے دراز
مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

آنکھوں کی آرزو ہے ذرا کھینچئے نگاہ
یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

کوئی محل ہیں نہیں ہے، پسِ پردہ ہم ہیں
برملا قیس کو دعویٰ ہے کہ لیلےٰ ہم ہیں

اس لئے چپ ہیں کہ کوئی نہیں سننے والا
ورنہ کہنے کو سراپا لب گویا ہم ہیں

سوانگ لاتے ہیں نئے رنگ بدلتے ہیں نئے
یہ طلسمی ہے جہاں اس میں تماشا ہم ہیں

واسطیؔ

سید فضل رسول خاں سندیلوی

○

مائل ہے زیست وصل ہوا اس جانِ جاں سے کیا
پردہ بعدِ مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

آزاد مثلِ سرو ہیں باغِ جہاں میں ہم
نفع و ضرر سے ہم کو بہار و خزاں سے کیا

پچھتا رہا ہوں کر کے کبوتر کو نامہ بر
نامہ تو لے چلا ہے کہے گا زباں سے کیا

ایسا خیالِ یار نے بے ہوش کر دیا
کچھ اپنی یاد ہے نہ مجھے اب کسی کی یاد

کاٹی تمام عمر غمِ ہجرِ یار میں
مرنے کے بعد خاک کروں زندگی کی یاد

رسوا کیا، خراب کیا، دربدر کیا
یادش بخیر، کیا کروں دل کی بدی کی یاد

ادا حقِ بندگی کا بھی کسی سے ہو نہیں سکتا
بڑے نافہم ہیں کرتے ہیں جو دعویٰ خدائی کا

جوشؔ

نوابِ احمد حسن خاں

○

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا
اُلفت بتا کے دوست کو دشمن بنا دیا

دامنِ حضرتِ یوسف کے اُڑائے پرزے
پاسِ عصمت تجھے اس وقت زلیخا نہ ہوا

حسرتیں مُردہ دلوں کی کبھی زندہ نہ ہوئیں
نام رکھا ہے عبث تم نے مسیحا اپنا

خضر گم کردہ راہ ہیں اے جوشؔ
چاہیے راستہ بتا دینا

مجھ جاں بلب کے پاس سے جاتے ہو گھر کہاں
پھر تم کہاں، یہ عاشقِ خستہ جگر کہاں

کہتے ہو کیا حضور کہ آئیں گے وقتِ صبح
اس شب کو خاتمہ ہے ہمارا، سحر کہاں

ان آنکھوں کی بدولت دل پہ آفت آ ہی جاتی ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

جنوں

نواب سراج الدولہ سراج جنگ علی محمد خاں

○

لا دوا تھا مرضِ عشق دوا کیا کرتا
التجا کر کے طبیبوں سے بھلا کیا کرتا

زندگی ہجر میں تھی موت سے بدتر میری
اپنے جینے کی خدا سے میں دعا کیا کرتا

چند دن جی کے فقط فرض ادا کرنا تھا
تیرا بیمار جو کرتا نہ قضا کیا کرتا

نہیں زیبا شکایت کیا کریں ہم خوش جمالوں کی
جدا ہوتی ہیں سب سے خصلتیں ان بے مثالوں کی

گرا یا دیدۂ مردم سے ہم کو چشم گریاں نے
دکھائی زردیٔ رخسار نے صورت ملالوں کی

درِ جاناں تلک موقع نہیں ملتا رسائی کا
ہمارا قصد ہے مدت سے قسمت آزمائی کا

جہاں میں چار سو شہرہ ہے جس کی بیوفائی کا
اسے دل دے کے کیوں الزام لوں ساری خدائی کا

ہوش

نواب نیاز احمد خاں

○

باغباں تو دشمنِ بلبل ہے اے خارِ چمن
تو بڑھا کر ہاتھ گلچیں کا گریباں گیر ہو

تب ہو لطفِ قید جب ڈالو گلے میں ہاتھ تم
طوقِ گردن میں پڑا ہو ہاتھ میں زنجیر ہو

زیست میں کیا پوچھتے ہو ہم سے حالِ بعد مرگ
خواب سے پہلے بیاں کیا خواب کی تعبیر ہو

ابھی تو عالمِ وحشت میں چاک کر دیتا
جو میرے ہاتھ میں دامانِ آرزو ہوتا

سمجھتے شیخ کو ہم راز دار تب تیرا
کہ لب پہ ذکرِ بتاں اور دل میں تو ہوتا

قطرۂ اشک ہوں دکھلایئے مجھ کو جلوہ
شجرِ طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا

گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم
شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

عیشی

طالب علی خاں لکھنوی

○

جلا دے شورِ او سوزِ نہانی
اٹھائے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

شرابِ صاف کا دے جام ساقی
مکدر ہے زلالِ زندگانی

نہ پیری میں ستا اے محنتِ عشق
اٹھاتی تھی ترے صدمے جوانی

کیا خاک درِ مے خانہ مجھ کو
جزاک اللہ دورِ آسمانی

شبِ غم میں موا جل جل کے عیشی
سنائے شمعِ محفل کی زبانی

غافل

منور خاں

○

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلا میرے بعد

گرم بازاریٔ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

منہ پہ لے دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

بیتاب

سنتوکھ رائے

○

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھو آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریقِ اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

جنت کی بھی کچھ ہوتی نہیں کیا ہم نشیں راہیں
کہو ان یوں ہمیں دکھ دیں ہم ان کو اس طرح چاہیں

مدت سے انتظار میں اپنی کٹی ہے یاں
اب تک جو ہم نہ آئے الٰہی کہاں رہے

عشق میں گا ہے عسل گہ نیش ہے
نت نیا یاں ماجرا درپیش ہے

خدا کسی کو گرفتارِ زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

گرفتار

سنگی بیگ

○

ساقی یہ غنیمت ہے جو دم جام سے گذرے
اس عالمِ فانی میں بھروسا نہیں دم کا

جستجو دنیا میں مت کراے گرفتار اس قدر
کیا بھروسا ہے جہاں میں عمرِ بے بنیاد کا

خانہ خراب عشق کا ہو اور کیا کہوں
خوابِ عدم سے سوتوں کو ناحق جگا دیا

لطف سے تیرے تو کچھ اور نہیں پر ہم کو
ناتوانی سے ہے ہر ایک قدم پر منزل

شکایت ترے جور کی کیا کریں ہم
خدا جو دکھاتا ہے ہم دیکھتے ہیں

جگر جل گیا آتشِ غم سے اپنا
تعجب ہے آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

حسن

خواجہ حسن

○

یہی سوزشِ عشق ہے تو الٰہی
اس آغاز کا کیونکر انجام ہوگا

رہی بے قراری اسیروں کی یوں ہی
تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا

موئے ہم تو پر بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا!

اگر نزع سے جان بخشی کو آئے
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارہ کیا

امنڈ کے آنکھ سے اک بار بہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا

خاموش

شاہ معین الدین

○

شکلِ انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا

ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق
سیم بر، بر میں چھپا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

ہو کے خاموش عجب سیر و تماشا دیکھا
رنگ بے رنگ ہوا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھا لے بلبل
باغ کو چھوڑ دے، جنگل کی ہوا لے بلبل

چھپے کرتی ہے کیا؟ اس سے نہیں کچھ حاصل
مثلِ پروانہ پر و بال جلا لے بلبل

چڑھا ہے سولی پہ خاموش ہو کے جب منصور
سوائے حق نظر آئی نہ دار آنکھوں میں

فیض

میر شمس الدین

○

حرم ہیں دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

اُڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے
مگر نہ تیغے میں دامانِ آرزو آیا

کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں ہے کر انصاف
اِدھر سے میں نکل آیا اُدھر سے تو آیا

خطِ جادہ ہوں یا میں نقشِ پا ہوں
غرضِ افتادگاں کا رونما ہوں

عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ
بہت راتوں جگا تھا، سو رہا ہوں

نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیضؔ مر مر کے جیا ہوں

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں
جو بُت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے

راقم

بندرا بن

○

نامہ کا میرے اس سے لے کر جواب پھرنا
پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا

اک وے بھی دن تھے یارب! جو تھا ہمیں میسر
گلشن میں ساتھ اُس کے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل
صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

مژگاں سے دل بچے تو، ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی

کہنے لگا کہ "ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی"

مائل

میر محمدی

○

تنا میں مر کے دل سے ترے دُور ہو گیا
ک دن بھی آ کے تُو نہ سرِ گور ہو گیا

نالے کو ہم نے ضبط کیا ناصحا تو کیا
ہے تو زرد رنگ چھپایا نہ جائے گا

اشک کی طرح گرا جب تو پھر اُٹھنا معلوم
میں وُہ اُفتادہ نہیں ہُوں کہ سنبھل جاؤں گا

سب یار ہیں تمہارے اغیار ہیں تو ہم ہیں
نکھوں میں یاں سبھوں کے اک خار ہیں تو ہم ہیں

چنگا بھلا ہے تو تو، پیارے! تری بلا سے
آزار ہے تو ہم کو، بیمار ہیں تو ہم ہیں

کیا تعجب نہیں گر مر گیا مائل تیرا
یار کیا لگتا ہے انسان کے مر جانے کو

عشق

رکن الدین

○

اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے
اس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا

دشت! تجھ کو قسم ہے مجنوں کی
عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

اپنی آنکھوں سے دیکھ لے نرگسِ چشم
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا

اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم
خاک میں آپ کو ملا دیکھا!

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شورِ حشر برپا کروں

باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دوانے
میں برقِ آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

سحر

اقبال بہادر ورما

○

کسی رنگ میں داستانی نہیں ہے
کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ضراؤ بھی حرفِ فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی شاد و آباد دنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں
سبو ہے مے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی
نری آگ ہے ان میں پانی نہیں ہے

ادے مجھ میں چھپ کر یہ کیا کہہ رہے ہو
مری بات میری زبانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے
یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا
خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا
محبت نہیں، مہربانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی
غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

عزیز صفی پوری

منشی ولایت علیخان

○

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا

گیا جو نامہ بر، آیا بہت سراسیمہ
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا

سنبھلتے حضرت موسیٰ مگر ستم یہ ہوا
دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سنا بھی دیا

میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغِ ہستی نے
قریبِ صبح کیا روشن اور بجھا بھی دیا

عزیز اس کے کرم پر فدا نہ ہوں کیونکر
کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

احسن لکھنوی

مہدی حسن

دل کی وحشت نہ گئی خاک میں مل جانے سے
آندھیاں اُٹھنے لگی ہیں مرے ویرانے سے

روز کرتا ہوں درستیٔ شکست توبہ
مے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ترے پیمانے سے

جام کے دورِ تسلسل سے ہے دنیا قائم
چرخ نے سیکھی ہے گردش مرے پیمانے سے

مل نہ جائے کوئی رستے میں خدا کا بندہ
منہ چھپائے ہوئے نکلا ہوں صنم خانے سے

ہوتی جاتی ہیں بہت وصل کی راتیں کوتاہ
[illegible] دل دو بدل لے مرے پیمانے سے

پردۂ رازِ حقیقت جو اُٹھا دوں احسن
شورِ تکبیر ہو پیدا ابھی بُت خانے سے

سرور

منشی درگا سہائے جہاں آبادی

کسی مست ناز کا ہے سببِ انتظار سوجا
کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اُٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کروں پیار سوجا

یہ تری صدائے نالہ تجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سوجا مرے راز دار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بے قرار سوجا!

طالب باغپتی

نور محمد لطافت علی خان

پہلے تو آفتاب بنایا شباب نے
پھر اس میں چار چاند لگائے حجاب نے

کسی کو ڈال دیا پیچ و تاب میں
کیا غضب کیا دلِ پُر اضطراب نے

اب کیا کہوں؟ کہوں نہ کہوں کشمکش میں ہوں
مارا ہے دلفریبیٔ طرزِ خطاب نے

نظارہ سوز روئے تجلی نہیں رہا
خود دیکھنے کی چیز بنایا نقاب نے

کچھ ازل میں حسن سے سورج نے روشنی
سورج سے کسبِ نور کیا ماہتاب نے

نقش و نگارِ عہدِ تمنا بھی مٹ گئے
ایسا مٹا دیا دلِ خانہ خراب نے

طالب کسی کے سامنے اُٹھ ہی نہیں سکی
ناکام ہی رکھا نگہِ انتخاب نے

نُور

میر وزیر علی

نہ داد ملتی تو پھر داد خواہ کیا کرتا؟
خدا کے سامنے عذرِ گناہ کیا کرتا؟

مواخذہ نہ بتوں سے تھا حشر میں منظور
خدا کو ظلم و ستم کا گواہ کیا کرتا؟

کسی میں نام کو بوئے وفا نہیں باقی
ہر ایک گُل چمنِ روزگار میں دیکھا

سفید بال ہوئے موسمِ جوانی میں
خزاں کا رنگ شروعِ بہار میں دیکھا

پاس جانا کہاں نصیب ہمیں
دُور سے دیکھنا غنیمت ہے

رات دن اس کا نام جپتے ہیں
عاشقوں کی یہی عبادت ہے

تیرے قدموں پہ دم نکل جائے
بس یہی دل میں ایک حسرت ہے

مدہوش

سنت پرشاد

عشق کی رَو میں کچھ اس طرح سے بہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حُسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

حسن سے سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اِس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردے کی ہے جو حضرتِ مدہوش سے
پردۂ شعر میں کس لُطف سے کہہ جاتے ہیں

کیفی حیدرآبادی

سید رضی الدین حسن

ترے انداز ظالم کیا ہیں کچھ بولا نہیں جاتا
سمجھ جاتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھایا نہیں جاتا

ترا چہرہ برابر دُور سے دیکھا نہیں جاتا
جھجکتا کیوں ہے؟ آ نزدیک آ، میں کھا نہیں جاتا

ترے جور و ستم بھُولے، ہم اپنے درد و غم بھُولے
مگر ظالم ترا یہ بھُولنا بھُولا نہیں جاتا

طبیعت اس کی، مرضی اس کی، دل اس کا، خوشی اس کی
جہاں جی چاہے جاتا ہے، نہیں چاہا نہیں جاتا

ذرا دل لینے والے بھی تو سوچیں اپنی گھاتوں کو
کسی پہ ادا کر تو مرا دل آ نہیں جاتا

آسی

عبدالعلیم

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

رشک خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا

تمام جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گُل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

وفورِ بیخودیٔ بزم سے نہ پوچھو، رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو کہ اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

○

پیر مُراد شاہ

○

یہاں ہجر میں کوئی دم دیکھتے ہیں
نہیں پھر تو مُلکِ عدم دیکھتے ہیں

جو اخلاص آپس میں ہوتے تھے یارو
سو رسم اس زمانے میں کم دیکھتے ہیں

اجل نے جو دی ہم کو فرصت تو ہم بھی
شتاب آپ کے آتے قدم دیکھتے ہیں

ہم اعمال پہ اپنے اے بندہ پرور
تمہارا ہی لطف و کرم دیکھتے ہیں

لڑاتا ہے غیروں سے اے شوخ انکھیں
چُراتا ہے جس وقت ہم دیکھتے ہیں

سیہ بختی سے اپنی اس زُلف میں دل
گرفتارِ پُر پیچ و خم دیکھتے ہیں

یہاں سیرِ دل جس کو مدِ نظر ہے
وہ کب جا کے باغِ ارم دیکھتے ہیں

مُراد آج کیا ہو گیا ہے جو تیری
لبیں خشک اور چشم نم دیکھتے ہیں

جگر بسوانی

سید محمد افتخار علی خان

○

وار کرتے ہیں وہ شمشیرِ ادا سے پہلے
جان لے لیتے ہیں عاشق کی قضا سے پہلے

دل پہ کرتے ہیں جفا آپ وفا سے پہلے
روز ملتی ہے سزا ہم کو خطا سے پہلے

عشق میں موت کا احسان اُٹھانا کیسا
جان دینے کا ارادہ ہے قضا سے پہلے

دلِ ناکام تمنا کا ہے یہ ہجر میں حال
ناامیدی ہوئی جاتی ہے دُعا سے پہلے

ہم خطاوار سرِ حشر نہ رُسوا ہوں گے
بخش دیتا ہے وہ اقرارِ خطا سے پہلے

کوئی اندازِ جفا کرتے ہیں ایجاد اگر
پوچھ لیتے ہیں وہ اربابِ وفا سے پہلے

خونِ دل تُو نے جگر کا نہ ملا ہوا اے شوخ
ہاتھ یوں سرخ نہ ہوتے تھے حنا سے پہلے

باسط بسوانی

○

اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا
تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا

کیا یُوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا
کہ جیسے حال کہتا ہے بہ مشکل بے زباں اپنا

وہی اک داستانِ عشق ہم دُہراتے رہتے ہیں
بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا

چھری گردن پہ رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں
وہی کل جو ہنسی سمجھے تھے باسط امتحاں اپنا

فیروز طغرائی

حکیم فیروز الدین

○

آرہا ہے تیر پیہم تیر پر — آفریں ہے جذبۂ نخچیر پر

ختم ہے ہم پر اسیری عشق کی — قفل ہے ہر حلقۂ زنجیر پر

دیکھ کر خط لال آنکھیں ہوگئیں — خوب سُرخی ہے مری تحریر پر

مر مٹے ہم پہ رقیبِ رُوسیہ — ظلمتیں صدقے ہوئیں تنویر پر

کاخِ ہستی ہے طلسمِ بے ثبات — رنگ ویرانی ہے اس تعمیر پر

ساتھ پیری سے جوانی کا نہیں — منحصر کیا ہے کمان و تیر پر

کہہ دیا جس نے ان آنکھوں کو غزال — صاد ہے اس شخص کی تقریر پر

کہہ تو دیں تاخیرِ وعدے کو ترے — پر اُسے تقدیم ہے تاخیر پر

دیکھ کر فیروز خوابِ زندگی
کھل گئیں آنکھیں مری تعبیر پر

جالبؔ دہلوی

سید بشارت علی

○

کسی عاشق پہ جب بیداد کرنا
ہمیں بھی او ستمگر یاد کرنا

تمہیں ظالم بنایا ظلم سہہ کر
نہ یہ محنت مری برباد کرنا

نیا عاشق ہو گر پیدا تو تم بھی
کوئی تازہ ستم ایجاد کرنا

مٹانا خاک پر لکھ کر مرا نام
بنوں جب میں تو یوں بیداد کرنا

احمد

خان احمد حسین خان

مجھے ڈھونڈے نہ کوئی اے ستمگر اشکباروں میں
کسی کو مجھ سے ملنا ہے تو آئے جاں نثاروں میں

دل پر داغ چشم خوں فشاں کے نام لیوا ہیں،
لگے ہیں ورنہ کیا سرخاب کے پر لالہ زاروں میں

عجب مہماں نوازی ہے سرائے ملکِ فانی کی
کہ مہمانوں کو لے جا کر سلاتے ہیں مزاروں میں

فلک سمجھائے اپنے ناز پروردہ ستاروں کو
چُرا لیتے ہیں میری نیند یہ شب کو اشاروں میں

ہمارے دامنِ ہستی کے ٹکڑے ہوں نہ اے ہمدم
جو دشتِ زندگی میں ہم کو اُلجھاتے ہیں خاروں میں

مَیں تجھ سے پُوچھتا ہُوں اے تپِ فرقت کی بیہوشی
یہی تھی پاس جو بیٹھی رہی تیمارداروں میں

ہمارے دل کو دیکھو دل میں آئے داغ کو دیکھو
نہ دیکھو ماہِ کامل کو نہ جاؤ لالہ زاروں میں

بہت خوش ہوگا سن کر بھولنے والا مرا احمد
مری تربت بھی یاروں کو نہیں ملتی مزاروں میں

سجّاد

سجّاد علی انصاری

آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی
پھُول میں شوخیٔ بہار نہ تھی

اس سے پہلے بھی تیری خاموشی
تھی مگر ایسی طرفہ کار نہ تھی

یاس پہ تُو نے کر دیا مجبُور
ورنہ امید مجھ پہ بار نہ تھی

مَیں نے دیکھا تری نگاہوں کو
ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

کس طرف لے کے چلا شوق کا انداز مجھے
آج کیوں روک رہی ہے تری آواز مجھے

خار رہ میں بھی نظر آتی ہے شادابیٔ گُل
لئے جاتا ہے کدھر حُسن فسوں ساز مجھے؟

مجھ کو افسونِ محبت نے مٹا کر چھوڑا
تو سمجھتا ہی رہا شعبدہ پرواز مجھے

بس کے ہر رنگ پہ یہ خوبیٔ انجام نثار
یاد آتی ہے وُہ نیرنگیٔ آغاز مجھے

شیدا

رام رچھپال سنگھ دہلوی

قیامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلا نہ مانیں گے
وہ جب تک حشر ہی برپا نہ ہولے گا نہ مانیں گے

نہ مانوگے تو روزِ حشر تم پچھتاؤگے دیکھو
مناؤگے مگر عشاقِ بے پروا نہ مانیں گے

وہ موسیٰ تھا کہ فقرہ چل گیا واں لن ترانی کا
تمھارے طالبِ دیدار یہ دعویٰ نہ مانیں گے

بجز عشقِ بتاں عشقِ خدا ہو، ہو نہیں سکتا
اگر ہم مان بھی لیں حضرتِ شیدا نہ مانیں گے

شمس مینائی

ابو المعانی شیخ عبدالرحمٰن امرتسری

سناؤں کیا کسی کو میں سنے گا کوئی کیا میری
نہ وہ عالم ہے اب میرا نہ وہ دلبستگی میری

گئے وہ دن کہ میں اور وہ شریکِ بزم ہوتے تھے
سنا کرتے تھے اہلِ دل کبھی ان کی کبھی میری

یہ منظر آخرِ شب کا ہے دیکھو چشمِ عبرت سے
کہ ہے مہمان کوئی دم کی شمعِ زندگی میری

نہ پوچھو کچھ یہ ظاہر داریاں رہنے بھی دو صاحب
کسی کو کیا کٹی جیسی کٹی ہاں کٹ گئی میری

تمہیں تو ایک ساعت کیلئے بھولا نہیں ہوں میں
مگر کہئے تمہیں بھی یاد کیا آئی کبھی میری

غضب ہوتے ہوئے آنکھیں دکھائی کچھ نہیں دیتا
سیاہی سے بدل کر رہ گئی ہے روشنی میری

یہ فیضِ صحبتِ اہلِ سخن ہے کچھ جو لکھتا ہوں
نہیں تو شمس کیا اردو مرا کیا فارسی میری

اشک

واجد علی خاں عرف اچھن صاحب رامپوری

اِک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اِن ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھئے
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

اے رازداں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

اس نکتہ چیں کو حال سُنانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

اظہر امرتسری

خدا بخش

یہ روزِ قیامت ہے تکمیلِ تمنا کر
یا آج بھی دھوکا دے یا وعدۂ فردا کر

یا پردے سے باہر آ جلوے کو بھی رسوا کر
یا عشق کی رُسوائی چھپ چھپ کے نہ دیکھا کر

یہ میرا سیہ خانہ یہ ہجر کی تاریکی
آ تُو بھی یہاں روشن شمعِ رُخِ زیبا کر

اے ساقیٔ مے خانہ اک ساغرِ بادہ سے
مفلس کو سکندر کر نادار کو دارا کر

مفہومِ تمنا پر آتی ہے ہنسی مجھ کو
جس وقت وہ کہتے ہیں اظہارِ تمنا کر

امروز کی محفل میں پینے دے مجھے واعظ
تو بیٹھ کے مسجد میں اندیشۂ فردا کر

مَیں طالبِ جلوہ ہُوں وہ کہتے ہیں اے اظہر
سُورج کی نگاہوں سے شبنم کو نہ دیکھا کر

عابد شاہجہانپوری

عابد حسین

○

[illegible] ظالم سے آشنا تھی نظر — ہم اُٹھے میکدے سے جب پی کر

دور ہوں انقلابِ عالم سے — میری دُنیا میں شام ہے نہ سحر

آپ اور پرسشِ دلِ غمگیں — یہ بھی شاید ہے اک فریبِ نظر

اب یہ عالم ہے وحشتِ دل کا — لوٹ آتا ہوں دو قدم چل کر

مرکزِ [illegible] نگاہ کیا کہئے — جیسے اک برق جیسے اک محشر

کون [illegible] میں سمجھا آپ آئے — اللہ اللہ یہ بے خودئ نظر

عرق آلودہ ہے جبینِ حسیں — جیسے شبنم گری ہو پھولوں پر

ذہن کو دے رہے ہیں اے عابدؔ
رشکِ فردوس ہے فضائے سحر

عیشؔ

جان محمد خان غوری فیروز پوری

○

ہم یوں تڑپ رہے ہیں ترے آستاں سے دُور
جیسے کوئی اسیرِ قفس آشیاں سے دُور

تُو ہر مقام پہ ہے نگاہوں کے سامنے
مَیں ہر مقام پہ ہُوں ترے آستاں سے دُور

منزل جُدا، خیال جُدا، شوقِ دل جُدا
مَیں کارواں کے ساتھ ہُوں یا کارواں سے دُور

بزمِ جہاں کی سیر بہت کر چُکا ہُوں مَیں
اے عشق لے چل اَور کہیں اس جہاں سے دُور

جنّت کی جُستجو ہے تو چل کے دیکھ لے
نزدیک ہے کہ پیرِ مغاں کی دُکاں سے دُور

ایک ایک سے زیادہ ہیں دُنیا میں کم نصیب
بلبل چمن سے ہم ہیں ترے آستاں سے دُور

اُن کا خیال عیشؔ پھر اُن کا خیال ہے
رہتے جہاں میں رہ کے ہوں رہتے جہاں سے دُور

نیّر واسطی

حکیم سیّد علی احمد

○

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے
عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے

پلکوں پہ مچل رہے ہیں انجم
کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے

آجاؤ کہ ایک بار ہنس لیں
رونے کو تو زندگی پڑی ہے

یہ ظلمتِ شب یہ جوشِ گریہ
برسات کی رات کی جھڑی ہے

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیّر کو سلامِ غم مبارک
منزل مگر عشق کی کڑی ہے

عبرت

محمد تبارک علی صدیقی

○

گو میسر تھا پھولوں کا سایا
پھر بھی کانٹوں کو ہنسنا نہ آیا

بے نیازانہ گذرے چمن سے
ہم نے پھولوں سے دامن بچایا

ان کی آنکھیں اور اشکِ محبت
یہ ستارہ کہاں جھلملایا

ان کی آواز پہ بڑھ رہا ہوں
اب نہ منزل نہ منزل کا سایا

درد گہوارۂ زندگی ہے
غم نے دل کو تھپک کر سلایا

یہ کہیں میرا دل تو نہیں ہے
ان کی مژگاں پہ کیا جگمگایا

اشک آنکھوں میں آئے اُمنڈ کر
پرسشِ غم نے طوفاں اُٹھایا

میرا کردار ہی مجھ کو عبرت
عرش سے فرش پہ کھینچ لایا

ہادی مچھلی شہری

شوریدگیِ حرماں جائے گی نہ یوں سر سے
[illegible]ہت ہی عنایت ہو ساقی مجھے ساغر سے

نقاشِ غمِ پنہاں ہے کون سوا اس کے
[illegible]ش داماں ہے نوک مژہ تر سے

دنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
[illegible]امیدگیِ غم سے شوریدگیِ سر سے

مانا کہ نصیبوں کا ہوتا ہے لکھا پورا
ٹکراؤں میں سر کب تک بے درد ترے در سے

اے پائے طلب چل، اے جوشِ وفا کام آ
سودائے محبت کو کچھ کام ہے اس در سے

بدنام نہ ہو جائے اندازِ ستمگاری
کیوں آنکھ چراتے ہو میرے دلِ مضطر سے

لائے غمِ فرقت کچھ اور ارادوں سے
سر پھوڑ کے دیوانے جاتے ہیں ترے در سے

بیکار گئی کوشش تدبیر نہ کام آئی
کچھ بس نہ چلا ہادی آخر کو مقدر سے

رسا جالندھری

محمد کبیر خاں

لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خوابِ زلیخا کہیں جسے

دل کی رگوں میں دوڑ کے بیتاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچنا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بے کسی کہ ہوا ہے وبالِ دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رسا
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے

وفا

پنڈت میلا رام

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے ان کی ارزانی مجھے

میں ہوں اور آزارِ استقبالِ دشمن صبح و شام
یعنی اس نے دی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

سعیِ لاحاصل ہے دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک دشتِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

اس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

نظیر

اصغر حسین خاں

تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا
فرزانہ جو ہوگا ترا دیوانہ رہے گا

شغلِ دف و چنگ و مے و پیمانہ رہے گا
ہم ہیں تو یہی جلسۂ رندانہ رہے گا

یہ شہرِ محبت بھی عجب شعبدہ گہ ہے
آباد بھی ہو جائے تو ویرانہ رہے گا

تم آپ نہ آؤ گے تو میں پہنچوں گا اُڑ کر
اک رات بھی بے شمع نہ پروانہ رہے گا

چلتے ہوئے دو جام ہیں ساقی تری آنکھیں
اب کس کو سرِ ساغر و پیمانہ رہے گا

کیا غم ہے جو اُٹھوایا ہے مجھ کو دمِ آخر
اب اس کی گلی میں مرا افسانہ رہے گا

گر ہیں یہی افکار نظیرؔ اہلِ حرم کے
کعبہ میں بھی اندازِ صنم خانہ رہے گا

طالب بدایونی

دل سے ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
پتھر کا نقش ہے یہ مٹایا نہ جائے گا

ہے پاس اب نہ خانۂ دل کو تباہ کر
اُجڑا جو یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا

ان کی تجلیاں ہیں مری آنکھ کا حجاب
پردہ وہ ہے پڑا کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہم سے نہ ہوگی بندگیٔ ماسوا کبھی
یہ سر کسی کے در پہ جھکایا نہ جائے گا

جاتے ہیں اُس سے کہنے کو ہم اپنا حالِ دل
پوچھا گر اس نے حال بتایا نہ جائے گا

دل میں نہ چھپ سکے گا کبھی رازِ حُسن و عشق
شعلوں کو خار و خس میں چھپایا نہ جائے گا

طالب بغیر عشق و محبت کے دہر میں
ہستی کو لازوال بنایا نہ جائے گا

ثاقب زیروی

محمد صدیق

دل و نظر پہ مسلط ہے اک سکوں دشمن
بدل رہی ہے محبت جنوں کا پیراہن

بنی ہے زمزمۂ شوق قلب کی دھڑکن
یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہوئی پسِ چلمن

نگاہِ شوق ہے اور ان کا عارضِ روشن
مچل رہی ہے دمِ صبح آئنہ پہ کرن

یہ کون حُسنِ بہاراں اِدھر سے گذرا ہے
مہک رہے ہیں ابھی تک گلوں کے پیراہن

نظر کو شوقِ نظارا ہے دل میں خودداری
دل و نگاہ کے رشتہ میں پڑ گئی اُلجھن

یہ اتفاق ہے یا مُعجزہ گناہوں کا
کہاں وہ رحمتِ کامل، کہاں میں تردامن

رہِ طلب میں کوئی کس پہ اعتبار کرے
جنوں خرد کا مخالف، خرد جنوں دشمن

وہ آنسوؤں پہ مرے مُسکرا دئے ثاقب
بکھر گئے مری حدِ نگاہ تک گلشن

حرماں خیرآبادی

ذبیح احمد

آہ اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں

جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یارب!
ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں

کیا چمن میں پھر کوئی غیرتِ بہار آیا!
پھول مسکراتے ہیں خار گنگناتے ہیں

کچھ تو لطف دیتی ہے آرزوئے دیرینہ
ہم جبھی تو آنکھوں سے اشکِ خوں بہاتے ہیں

آپ کی جفاؤں سے عذر کا کسے یارا
بس یہی قیامت ہے آپ بھول جاتے ہیں

اک غریقِ اُلفت کو خطرۂ تلاطم کیا
یعنی ڈوبنے والے آپ ڈوب جاتے ہیں

جس کو ایک اِک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں!

دل میں عشقِ رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں!

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجیے حرماں
آپ کی کہانی ہے آپ ہی سناتے ہیں

عاصی کرنالی

میں بھی پابندِ وفا ہوں مجھ پہ بھی بیداد ہو
مجھ سے لوگوں نے کہا ہے تم ستم ایجاد ہو

آپ اس کی خوش مذاقی کا تصور کیجیے
بجلیاں گرنے سے جس کا آشیاں برباد ہو

آؤ لکھ دیں وقت کی تاریخ کا اِک باب ہم
کچھ مرا افسانہ ہو کچھ آپ کی روداد ہو

وُہ فضا وُہ سرمئی شب، وُہ تری پہلی نظر
او تغافل آشنا، شاید تجھے کچھ یاد ہو

دیکھتا ہوں حُسن بھی کچھ زندہ دِل ہے یا نہیں
وہ ستم فرمائیے جو آپ کی ایجاد ہو

یُوں غمِ دوراں کو ہنستے کھیلتے دیجے شکست
مُسکرا دیجے اگر دل مائلِ فریاد ہو

ایک تارا ٹوٹ کر سارے اُفق پر چھا گیا
ہو کوئی برباد تو اس شان سے برباد ہو

شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے ملاحی کا وجُود
جب وُہ کہتے ہیں کہ عاصی اک غزل ارشاد ہو

لطیف انور گورداسپوری

رہِ وفا میں خاک خود اپنی اُڑا کے دیکھ
پھر دیکھنا ہے تجھکو تو سب کچھ لُٹا کے دیکھ

گرداب سے قریب کہ ساحل قریب ہے
اے ناخدا! بچا کے خدارا بچا کے دیکھ

رازِ شعور نہیں ہے حکایتِ طُور سے
اک بار اور میری نظر آزما کے دیکھ

اے بادِ صبح غنچے ابھی تک ہیں محوِ خواب
صحنِ بہاران کو ذرا گدگدا کے دیکھ

دیکھا نہیں ہے تونے اگر ظرفِ بادہ نوش
اے پیرِ میکدہ کبھی مجھ کو پلا کے دیکھ

کشتی کا رُخ بدلتا رہا کیوں ہوا کے ساتھ
ہر موجِ تند خیز کو ساحل بنا کے دیکھ

منظور

چودھری منظور احمد

گل قیس کے لب پر تھی اب میری زبانی ہے — روداد محبت بھی اک رام کہانی ہے
یہ مست نظر توبہ! یہ چال معاذ اللہ — اٹھتے ہوئے شعلے میں بہتا ہوا پانی ہے
اک گوشۂ عزلت میں اک بامِ تماشا پر — یہ میری تمنا ہے وہ تیری جوانی ہے
اک دُودِ چراغِ دل اک بوٹے گلِ رعنا — یہ میرا فسانہ ہے وہ تیری کہانی ہے
کرنوں کا قلم لے کر خورشید کے پردے میں — اے برقِ نظر تیری تصویر بنانی ہے
یہ کلبۂ غم جس کی تصویر سے ہے روشن — قندیلِ فلک! تجھ کو وہ شمع دکھانی ہے
آ دیدے سے پھولوں کی دامانِ نظر بھر لیں — خوش رنگ مناظر ہیں اور صبح سہانی ہے
گلزار میں اے مہوش! کچھ دیر ٹھہر جانا — خوشبو ترے بالوں کی غنچوں میں بسانی ہے

کچھ روز کی مہلت دے منظور کو محفل میں
اے موت ابھی دل کی روداد سنانی ہے

پیام شاہجہانپوری

محمد یمین خان

جو مصائب میں سے ہنس ہنس کے گذر جاتے ہیں
منزلیں ساتھ ہی رہتی ہیں جدھر جاتے ہیں

بات جب ہے کہ خزاں میں بھی ہو گلشن پہ بہار
موسمِ گل ہیں تو کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم بھلا تیری جفا سے کبھی منہ پھیریں گے
ہم تو وہ لوگ ہیں جو بات پہ مرجاتے ہیں

لوٹ کر میرا سکوں اپنا بچا کر دامن
ٹھیرئیے میرے حضور! آپ کدھر جاتے ہیں

کیا خبر کون ہیں آتے ہیں کہاں سے یہ لوگ
جب گذرتے ہیں تو رستے بھی سنور جاتے ہیں

کوثر نیازی

محمد حیات خاں

زہرِ اجل ہے چشمۂ حیواں ترے بغیر
صبحِ وطن ہے شامِ غریباں ترے بغیر

کٹتے نہیں کسی طرح لمحاتِ زندگی
رُک سی گئی ہے گردشِ دوراں ترے بغیر

"دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو"
ہے دشمنِ سکوں سروساماں ترے بغیر

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

تُو بھی عجیب چیز ہے اے ابتلائے دہر!
پختہ نہ ہو سکا کوئی انساں ترے بغیر

اک روز میرے طالعِ بیدار آ ہی جا!
جینا ہے ایک خوابِ پریشاں ترے بغیر

اے رحمتِ تمام! نگاہِ کرم ادھر
کیسے کٹے گا عرصۂ زنداں ترے بغیر

کسریٰ منہاس

غلام حسن

کہیں بھی خیر نہیں اپنے آشیانے کی
یہ کہہ رہی ہے پریشاں ہوا زمانے کی

جو رُو جبیں جھیل چکیں سختیاں زمانے کی
تلاش اُن کو بھی ہے اب مرے فسانے کی

شگوفے باغ میں پھولے نہیں سماتے ہیں
خبر بہار نے دی ہے یہ کس کے آنے کی

جو سمجھے جورِ حوادث کو زندگی کا نشاں
ستا سکیں اُسے کیا گردشیں زمانے کی

یہ بے بسی کا ہے عالم کہ کچھ نہیں معلوم
کشش کہاں لیے جاتی ہے آب و دانے کی

ذرا میں عمرِ گذشتہ سے پُوچھ لُوں تو کہوں
مجھے تو یاد نہیں تلخیاں زمانے کی

ہمارے سامنے سب کچھ ہے مثلِ آئینہ
"قسم نہ کھاؤ ضرورت نہیں بہانے کی"

تبسّم

عبدالرشید

غمِ دل کو عطائے دلبراں کہنا ہی پڑتا ہے
بمجبوری زمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

حقیقت میں ہم اپنے حال سے خود بھی نہیں واقف
مگر یاروں کو اپنے رازداں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا منتشر تنکے چمن میں بے حقیقت ہیں
انہیں ترتیب دے کر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

فنا کر دے حواس و ہوش کو جس حُسن کا جلوہ
تکلم ساتھ دے تو اس کو بیاں کہنا ہی پڑتا ہے

دروغِ مصلحت آمیز ہے مجبور کا مذہب
یہاں ظالم کو اکثر مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

پیا جاتا ہے خوں مزدور کا بزمِ امارت میں
مگر اس کو شرابِ ارغواں کہنا ہی پڑتا ہے

تبسّم! بادشاہی حرص و خواہش کی غلامی ہے
غلامِ نفس کو شاہِ زماں کہنا ہی پڑتا ہے!

ضیا جعفری

سید عنایت علی شاہ

○

فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے
خدا کرے کوئی گاتی ہوئی سحر آئے

اک ایسا دور بھی آیا ہے درد مندوں پر
فقط خوشی کے تصور سے اشک بھر آئے

تبسم لب شیریں کہ جاگ اٹھیں کلیاں
پیام زیر لب ایسا کہ پھول مسکائے

ہم اپنی بیکسیٔ غم پہ شب بہت روئے
کھلی جو چاندنی تم بار بار یاد آئے

بہار نو کی حکایت ہے لالہ زاروں میں
شرارِ گل سے نہ دامن ترا بھڑک جائے

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سائے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اتر آئے

یہ کارواں بھی ہراساں ہے رات بھی تاریک
جو نیند آگئی ہو مسلسل کوئی کدھر جائے

ولیؔ

سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (بہاری)

○

حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز
خالِ سیاہ ہے ستم فتنہ ہے چشم سحر ساز

نعمتِ لازوال ہے عشق نے کر دیا غنی!
جان ہے وقفِ بیخودی، دل ہے رہینِ سوز و ساز

اشک فشاں ہے چشم زار در پہ ہوں تیرے سجدہ بار
مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز

برق بھی بے قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں
حشر بھی پائمال ہے اُف رے ترا خرام ناز

دیر میں وُہ حرم میں وُہ مسجد و مے کدہ میں وُہ
عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز

میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در
تو بھی ہوئی نہ ملتفت تیری ادائے بے نیاز

شاہ و گدا کی کیا تمیز مسلکِ حسن و عشق میں
ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخر شب ہے اے ولیؔ اور وُہ محوِ خواب ہیں
اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

اختر اورینوی

پروفیسر اختر احمد

○

پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب اُن کی شرارت کیا کہئے
اُس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے

تھم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخمِ جگر کا ہنس دینا
آنا وہ تصور میں اُن کا اور چپکے سے رخصت کیا کہئے

ہوتے وہ سے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھ کو یہ شرف
کیا راز ہوا فاش الفت کا اب [illegible] کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سن کر
دکھ درد یہ سب کے سہتا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

جگر

سید شاہ نصیر الدین (بہاری)

○

اِس قدر ہیں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں
بانگِ بے ہنگام ہوں یا آہِ بے تاثیر ہوں

وہ ملا دل آہ جو کھلنے نہ پائے گا کبھی
گلشنِ ہستی میں گویا غنچۂ تصویر ہوں

زندگی بھر لاکھ تم دامن بچاتے ہی چلے
خاک ہو کر اب یہ حسرت ہے کہ دامنگیر ہوں

کیوں ملا آپے سے ناحق کیا دیکھتا سنتا نہیں
صانعِ قدرت کی میں اک بولتی تصویر ہوں

کوئی کتنا ہی جگائے ہوں گا اب بیدار کب
[illegible] یعنی میں سوئی ہوئی تقدیر ہوں

تمنا عمادی

مولانا محی الدین مجیبی (پھلواروی)

جس گلی سے لوگ اٹھتے تھے بہ مشکل مجھے
لو وہیں پھرے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رخ تو میرا پھیر دے اے موجِ دریا اس طرف
دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

خاک تو میں ہوں مگر خاکسترِ پروانہ ہوں
جانئے اک [illegible] گرمیٔ محفل مجھے

ناتواں ہوں کس طرح دوڑوں ذرا تھم ساربان
کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے

جاگتے میں کون آتا دل ہی کتنا چور کا
حشر پہنچا دیکھ کر سویا ہوا غافل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنا کس لئے کسبِ ہنر
اتنی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

محمود عالم وفا

ٹھہر جا اے دلِ مضطر ذرا آہ و فغاں کر لوں
نگہ جب ظلم پرور ہے خلش کو بھی جواں کر لوں

غلط ہے جستجوئے آستاں اے غیرتِ سجدہ
مزا جب ہے کہ پیدا ہر جگہ اک آستاں کر لوں

بہار آئی کھلے غنچے، ہنسا گل کونپلیں پھوٹیں
مگر اتنی کہاں فرصت کہ سیرِ بوستاں کر لوں

بڑے صانعِ عالم ہو بڑے مختارِ مطلق ہو
مٹا دو دستِ قدرت سے مرے دستِ پریشاں کو

زہے قسمت یہیں موجود ہر سامانِ وحشت ہے
جنوں میں کس لئے گھر چھوڑ کر جاؤں بیاباں کو

تمہاری بے بسی پر خود مجھے اب رحم آتا ہے
بڑے ناوک فگن نکلے نکالو نوکِ پیکاں کو

شمس منیری

پروفیسر حافظ شمس الدین

○

مرے غم الم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
ہے خزاں رسیدہ ریاضِ دل مجھے کیا امیدِ بہار ہے

اسے ڈھیر خاک کا جان کے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا یہ
یہ نشانِ راہ ہے شبہ کسی راہ رو کا مزار ہے

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرقِ مجاز ہے وہی نور ہے وہی نار ہے

کہو غم نصیب اسے یا خوشی، رہی شمس حالتِ دل وہی
یہی وہ ریاض ہے واقعی کہ خزاں بھی جس کی بہار ہے

غم نہیں حسرت نہیں وحشت نہیں
وہ بھی کیا دل جس میں کیفیت نہیں

دردِ دل کہنے کی طاقت تھی کبھی
اور اب سننے کی بھی طاقت نہیں

کیا کرے گا کوئی عزت آپ کی
آپ اپنے دل میں جب عزت نہیں

ہے غزل میں شمس اک لطفِ زباں
اس میں مضموں کی اگر وسعت نہیں

بیدل

پروفیسر عبدالمنان

○

تجلی کس آستانے کی زمیں پر
نشاں ٹھوکر کا ہے اپنی جبیں پر

لبوں پہ آ گیا آخر تبسم
نہ زور ان کا چلا چینِ جبیں پر

وہ دل جو تھا حریفِ شوخئ ناز
ہوا قربان چشمِ سرمگیں پر

یہ الزامِ محبت تیرا ناحق
غلط ہے عشق راحت آفریں پر

کہا کس نے میں مایوس لوٹا
غبارِ آستاں تو ہے جبیں پر

کیا جس وقت ضبط اللہ بیدل
قیامت ہو گئی قلبِ حزیں پر

منیر نیازی

○

یہ لڑکی جو اس وقت سرِ بام کھڑی ہے
اُڑتا ہوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہوئے بندِ قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہنِ سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اک شکل نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

بشیر منذر

○

آکے بادیدۂ تر جائیں گے — تجھ پہ کچھ تہمتیں دھر جائیں گے
موت لے جائیگی مہ پاروں کو — ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے
کم ہوئیں وسعتیں ویرانوں کی — تیرے دیوانے کدھر جائیں گے
چشمِ لیلےٰ سے گرے ہیں تو کیا — دلِ مجنوں میں اُتر جائیں گے
درِ مے خانہ ذرا وا کردو — صورتِ دور گذر جائیں گے

دلِ بیتاب! کوئی بات نہیں
یہ زمانے بھی گذر جائیں گے

اُردو غزل اور متغزّلین

اس مضمون کے دو حصّے ہیں :

پہلے حصّہ میں غزل پر جتنے ممتاز اہلِ قلم کی آرا مل سکی ہیں، انھیں یکجا کر دیا ہے۔ مولانا حالیؔ اور کلیم الدین احمد کے مضامین اس لیے مفصّل دے دیے ہیں کہ حالیؔ نے پرانی غزل سے روگردانی کا نعرہ بلند کیا اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے دیا۔ بہرحال اس موضوع پر اتنی مخالف اور موافق آرا اکٹھی کر دی گئی ہیں کہ آپ باسانی اردو غزل کے مستقبل کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کریں گے۔

دوسرے حصّے میں تذکرہ نویسوں نے ممتاز شعرا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، ویسے ہی لکھا کر دیا گیا ہے تاکہ شاعر کے بارے میں تمام ناقدین کی آرا کا ایک نظر میں علم ہو جائے۔

(ادارہ)

اُردو غزل اور متغزلین

حالی

(۱)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا، الا شاذ و نادر، بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر دیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور رد کرنے کے قابل صنف معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بے کار نہیں رہ سکتی اس لیے بہت سے خیالات جو وقتاً فوقتاً شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جن سے اس کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو دیکھ کر یا کسی حالت کو دیکھ کر برانگیختہ ہوتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے اور جب بہت سے خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قید کی قدر ڈھیلی کر دی جائے منسلک ہو سکتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں صرف غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد و سماع کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی جلسوں میں، تکیوں میں اور رنڈیوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو جاتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر متداول و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔ اسی لیے ہمارے نزدیک شعراء کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔

کہی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگزشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوا اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ جس ایک [illegible] سالہ نوجوان جس کو [illegible] کی کبھی ہوا تک نہیں لگی یا ایک ستر برس کا پیر [illegible] جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز [illegible] یا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاعرانہ [illegible] ایسے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھتا ہے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرتا ہے۔

محبت کچھ [illegible] اور شاہد بازی و کامجوئی پر موقوف نہیں۔ بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، شاگرد کو استاد کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر عالم اور جامعیت ہے اور جبکہ عشق کا اعلان کرنا اور معشوق کا پتہ بتانا سب بے غیرتی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور شہوت رانی میں محدود کر دیا جائے اور اسی سرکتہ کو فاش کرکے اپنی تنگ ظرفی اور سفلہ پن ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ضرور ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور روحانی و جسمانی اور [illegible] تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے صریح مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ و خط، مسیں بھیگنا، [illegible] ترسا بچہ، مغبچہ وغیرہ وغیرہ یا مثلاً کرتی، مہندی، چوٹیاں، چوڑی، [illegible] آرسی، جھومر وغیرہ۔

اگرچہ (جیسا کہ حیات سعدی کے خاتمہ میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے) مرد کا مطلوب قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور رسمی تقلید کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقائق و واقعات پر، لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نازیبا دستور ہے جو ذہنی اخلاق کو داغ لگاتا ہے لہذا اس کو جہاں تک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیے اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرا سے تا امروز اسی طریقہ پر غزل لکھتے چلے آتے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ جو فحش اور بے حیائی کی باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے اماموں کے کلام میں موجود ہیں، اگر ہم آج ویسی باتوں میں ان کی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں۔ پس جہاں ہم نے ان کی بہت سی [illegible] صداقت کے خوف سے چھوڑ دی ہیں ان کی ایک یہ [illegible] بھی چھوڑنی چاہیے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات و خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہے کیونکہ اگر مستورات کو کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اس کے کرشمہ و ناز و ادا کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور بیگانوں سے روشناس کرانا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی پر آپ ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں [illegible] اور [illegible] اصلی رہنے کے غزل گو [illegible] ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں اور یہی بات اب تک ہندوستان میں بھی موجود ہے کہ غزل میں مطلوب کبھی مرد کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں

ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں،
تہمتیں لگی ہیں، اجلاء وطن کیے گئے ہیں، کتابیں جلائی گئی ہیں، اور کیا کیا کچھ ہوا ہے جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ
بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے۔ بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان"۔ فقہا و واعظین ان کے
اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں
انھوں نے کہا شراب خوری، قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع باتیں کہتے
ہیں انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے
کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم حقوقِ الٰہی ادا نہیں کرتے انھوں نے کہا کہ
تم حقوقِ عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہلِ ظاہر پر چوٹیں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور ان کے لوازمات اور خلافِ شرع الفاظ مجاز او استعارہ
کے طور پر استعمال ہوتے ہیں یہ لوگ یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسنِ ظن جو رہزنِ طریقت
ہے اس سے محفوظ رہیں یا اس لیے کہ عشق و محبت کی لہر اس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب کھلتی ہے
اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھاڑ زیادہ بھڑکاتی اور ان کی زجر و ملامت جو سے گنہگار کی تحسین و آفرین سے زیادہ گنہگار ہوتی
ہے ہم سے سے نے لگی نہیں) روحانی کیفیت کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب سے اخیر درجہ کا ثبوت مولانا روم کی
اس رباعی سے ہوتا ہے ؎

ما بر سر کوئے زلف غارت کردیم — سر پاکاں را جذب زیارت کردیم
تکرار آنکہ روزہ خوردم رمضان — در عید نماز بے طہارت کردیم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنے ہیں کہ جب مجاہدہ
سے مشاہدہ تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آگئی اور جدائی کا الم
جاتا رہا۔ اب حضوری کی کیفیت جو کہ حقیقتِ صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدمِ طہارت اور جاگتے اور
سوتے غرض کہ ہر حالت میں دولتِ حضوری موجود ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلم صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے
بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے کیونکہ قلم صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے اور انسان [illegible]
کا مجبور ہونا اور اس لیے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہلِ ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا
موقع ملے۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو عشق مجازی غزل کہا جاتا ہے۔ یہی ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں دفعتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ گذشتہ میں یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انہی کے خیالات کو ادا کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور سچے جذبات کا آئینہ بنائیں۔ ممکن ہے کہ کلوخ ہی کسی نے دنیا کے سب جھگڑوں سے الگ رہنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر کو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایک ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آنا فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہوں گے بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر پڑے گا کیونکہ جب کہ ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھلائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً صائب ایک جگہ لکھتے ہیں :—

قناعت کن بنانِ خشک تا بے آرزو گردی

کہ خواہش ہاست الوانِ نعمت ہائے الوان را

دوسری جگہ یہی صائب کہتے ہیں :—

مروت بیکاری نگرداں روزگار خویش را

پردہ روئے توکل ساز کارِ خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ چونکہ شوق و آمد و آمد اور وجدانی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ اعلانیہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بحر بھی چلبلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کشش اور گیرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو عہد لیلیٰ تک نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تمام روئے زمین کی تمام طاقت چرس رہتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام یورپ کے گرد و پیش ہیں مر کھنے پچھلے جاتے ہیں پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے

چشم فتان، بت پرستی، توبہ شکنی، رندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام فارسی و اردو کی غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور تکرارات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانٹے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی اور اگر یہ التزام کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو ان سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بے شک اس سے کسی قدر مقدار بڑھ جائے گی مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکل گئے اور ان کے فضلات متاخرین کے کلام میں بھی چاک گریباں کا مضمون جو متاخرین میں ایک سے ۲۲ طرح پر باندھا ہے میر تقی کے ہاں اس طرح بندھا ہوا ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مگر کیا ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر چاک گریباں کا مضمون باندھا ہو۔

مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نہ کریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اس کو کسی پہلو سے نہ باندھیں یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کو پھر اعادہ نہ کریں۔ کیونکہ ایسا اس کے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صناعت میں کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ کعب ابن زہیر جو ایک مخضرمی شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے ؎

مَا اَرَانَا نَقُوْلُ اِلَّا مُعَارًا　　اَوْ مُعَادًا مِنْ قَوْلِنَا مَکْرُوْرًا

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لے کر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دہراتے ہیں)

پس جب آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شاعر کا یہ خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوشہ چینی سے ہم کو استغنا حاصل ہے یا ہم کو ضرورت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ:

کَمْ تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْآخِرِ　　"یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں"

اور دوسری یہ مثل ہے کہ

مَا تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْآخِرِ شَیْئًا　　"یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا"

ان دونوں مثلوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے ان کو پورا کریں لیکن اصول کے پکاؤ کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا نمونہ نہ موجود ہو۔

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرے اس میں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا بدیع کرے جس سے اس کی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اس مضمون کو اگلے شاعر سے چھین لیتا ہے مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں ؎

اندر ورطۂ ما خبر ندارد　　آسودہ کہ برکنارہ دریاست

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکباران ساحل ہا

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کر دیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے ۔

بزیر سایۂ گل می گزند طبل را　　　توانگران نخوردہ گزند ما چہ خبر

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا لیکن اس نے مضمون کو اپنے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات، اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بیدردوں کو ہمارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول (دہول: اصل) ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا۔ یہیں غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا ہے ۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز　　　گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس میرا یہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ متاخرین اس کے لیے ایک نرالا اسلوب پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسہ کر کے قدما کی کوششوں سے دست بردار ہو جائے۔

شفائی صفاہانی یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے ۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لیے معشوق کے عمومی بناؤ سنگار کافی نہیں ہیں۔ اب مشاطہ کو چاہیے کہ ان میں کچھ اور اضافہ کرے کیونکہ اب اس کے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی مگر بعینہٖ اول تو اس نے حسن کو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی محبت کا نقش اس کے دل میں نہیں بیٹھا پھر اس کو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کے حسن ذاتی سے کچھ دل بستگی نہیں رکھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے۔ تیسرے عشق جو جذبہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کو قصد اور ارادہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں ۔

زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ظاہرا یہ خیال اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو اصل خیال کے باندھنے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو نقائص اول کی حالت میں اس میں موجود رہتے وہ مدح کی حالت میں بالکل نہیں رہتے۔ مرزا نے ممدوح کو ایک ایسے کمال

کے ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتی ہے کہ اگر یہی حال ہے تو نشاۂ انسان کی زیب و زینت کے لیے اور رشتار سے پیدا کیے جائیں اس پر سوال یہ ہے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جا سکتا اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بخلاف فارسی شعر کے کہ اس کی بنا خود اصول شاعری اور آداب کشش و محبت کے خلاف ہے۔ عرفی شیرازی کہتا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَ لٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" لیکن بہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اس نے ادا ہوگیا ہے غالب اس سے بہتر اسلوب اختیار کرنا دشوار ہے۔ باایں ہمہ مرزا کی جرأت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں بظاہر اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس پر ایک لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے۔ عرفی کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں وہی درحقیقت اسرار ہیں۔ مرزا یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں وہ درحقیقت کاشف راز ہیں۔

بہرحال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے اور لوگ متعجب ہو کر ان سے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہاں تک ذہن پہنچا تو وہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتا دیتے تھے۔ ابو نواس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

وَ لَیْسَ لِلّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ　　اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

(یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے)

اصمعی نے اس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ ابو نواس نے صاف کہہ دیا کہ یہ خیال جریر کے اس شعر سے پیدا ہوا جو اس نے بنی تمیم کی تعریف میں کہا ہے ؎

اِذَا غَضِبَتْ عَلَیْکَ بَنُوْ تَمِیْمٍ　　حَسِبْتَ النَّاسَ کُلَّهُمْ غِضَابَا

(یعنی جب بنی تمیم تجھ سے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ تمام بنی آدم تجھ سے ناراض ہیں)

شاعری پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسی طرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے چھوڑتے گئے پچھلے ان میں کچھ تصرف کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسی طرح متصور ہے کہ قدما کے خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے تصرفات کرنے کے لیے شاعری کی پوری لیاقت ہونی چاہیے ورنہ پہلے خیالات

ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں ان سے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے ان میں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کر کے اور جن کی قوت تخیلہ ان سے کم درجہ کی ہے وہ انہی خیالات کو بعینہٖ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہاں تک کہ اپنی زبان میں ان کے ادا کرنے کی طاقت ہو ان کو شعر کے لباس میں ظاہر کریں اور اس طرح اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعراء نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کر دیا ہے ان پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے۔ ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ایک بزرگوار نے ساقی نامۂ سکندری اردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مولوی بھی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرے میوہ زیبا جو ہر شاخ کو — کہ دیوے نوازش کرے خاک کو
ہوا جب کہ آراستہ باغ خوش — بھر میوۂ شیریں و ہم ترش
بہ شادی لب پستہ خنداں ہوا — رطب اس پہ ہنستی تیر زنداں ہوا
ہوا چہرۂ نار افسردہ خستہ — کہ ہوں تاج پر لعل جوں دو ختہ
بہ رغبت بہر شاخ انجیر دار — لٹکنے لگے مرغ زنجیر خوار
اٹھایا لب خرما نے جوش انگیز — ہم از بوسے شیرہ ہم از لب شکر ریز

شاید اس مترجم کی نسبت تو یہ کہا جا سکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اس لیے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ از راہ عنایت زیادہ نہیں تو انہی چھ شعروں کو فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھ دیں۔ جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اس کی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعراء نے بعضے ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من وجہ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں۔ نظیری کا شعر ہے ؎

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ

اس کا ترجمہ کر دیا ہے لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے ہی لکھ ہے کہ عاشق خود رفتہ ہو جاتا ہے لیکن ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی شبیہ آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا قرین قیاس ہے۔ اس کے «از کار شدم» میں وہ تعمیم نہیں جو اس بات میں ہے کہ «چلا میں» نہیں معلوم کہ آپ سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگر سے چلا یا کہاں سے چلا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ «چلا میں» ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی جوش و حواس ہوگم کر بیٹھے اور «از کار شدم» میں یہ بات نہیں۔ سے معطل ہونے، معزول ہونے، پابیچ اور نکمے ہونے کو بھی «از کار رفتن» سے تعبیر کرتے ہیں۔

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را (الاصم)

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو (خواجہ میر درد)

ممکن ہے کہ خواجہ میر درد نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً ان کا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اوّل تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لایا جس میں خود درد کا لفظ ہی شاعر کے دعویٰ پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر «راہ مدہ» کی جگہ «یاد کرو» بولا جس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ درد کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو، دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں اطلاع کا ان کو اپنے پاس بلانا اور بڑی خوبی درد کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اس کو میر درد نے احتمال کی صورت میں اس طرح بیان کیا ہے «نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے» ان دونوں اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسے ایک شخص تو یہ کہے کہ «بدپرہیزی سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے» اور دوسرا یہ کہے «دیکھو کہیں بدپرہیزی میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو» دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخویف و تحذیر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟ (سعدی شیرازی)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے؟ (میر تقی میر)

میر کا یہ شعر ظاہرا سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر سعدی کے ہاں «خوب» کا لفظ ہے اور میر کے ہاں «پیارے» کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ خوب کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے لیکن پیارے کا پیارا ہونا ضرور ہے۔ پس سعدی کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر میر کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اس کے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے یا ان کا ماحصل موجود ہے مثلاً:

سعدی

۱۔ سگ بدریائے ہفتگانہ بشوے
چونکہ تر شد پلید تر باشد

اقوالِ عربی

اَلْکَلْبُ اَنْجَسُ مَا یَکُوْنُ اِذَا اغْتَسَلَ

سعدی	اقوالِ عربی
۲۔ ترا خامشی اے خداوند ہوش وقار است و نا اہل را پردہ پوش	اَلصَّمْتُ زِیْنَۃُ الْعَالِمِ وَ سَتْرُ الْجَاهِلِ
۳۔ تو کجا سے پدر چہ کردی خیر تا ہمہ چشم داری از پسرت	رَاعِ اَبَاکَ یَرْعَاکَ ابْنُکَ
۴۔ شپرہ گر وصلِ آفتاب نخواہد رونقِ بازارِ آفتاب نکاہد	سَنَاءُ ذُکَاءٍ لَا یَزُوْلُ مِنْ دُعَاءِ الْخُفَّاشِ
۵۔ نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بد بخت آنکہ مرد و ہشت	اَسْعِیْدُ مَنْ اَکَلَ وَ زَرَعَ وَالشَّقِیُّ مَنْ مَاتَ وَ وَدَعَ
۶۔ پادشاہاں بخردمنداں محتاج تر اند کہ خردمنداں بہ پادشاہاں	اَلسُّلْطَانُ اَحْوَجُ اِلَی الْعُقَلَاءِ مِنَ الْعُقَلَاءِ اِلَی السُّلْطَانِ

اہلِ یورپ جو آج تقریباً ہر طرح علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جس کی شاعری اور انشا کا لب لباب ان کی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ جس قوم اور جس زبان کے خیالات ہم کو بہم پہنچیں ان سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں۔ ورصرف انہی چند فرسودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے ہیں قناعت کر کے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابلِ ملامت ہے جیسی مال و دولت میں حرص۔

(۹) جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انہی کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عشقیہ مضامین ہمارے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی برابر انہی کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح قصائد کی تمہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی وتیرہ رہا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ، مثنوی اور واسوخت کا میدان وسیع ہے لہٰذا ان میں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہو سکتی ہے۔ بخلاف غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو اوپرا معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختہ میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نبھ جاتے ہیں مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے انہی الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں جن گوں کی

غزل مسلسل بھی ہے۔ جدید لوگ ہیں جنہوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔ اردو میں دلّی سے لے کر انشا اور مصحفی تک عموماً سب کی غزل میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد دلّی میں مومن، غالب، ذوق اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں سے غزل میں ایک شکوہ سا پیدا ہو گیا، مگر یہ لوگ بھی اعلیٰ درجہ کا شعر اسی کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو کے محاورہ میں ادا ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شعر گوئی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دو شعر اچھا نکل آیا، باقی کم عمدہ اور جیسے تیسے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ یہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے معانی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے بہت کم بچتے ہیں۔ اس بات کی انتہا میں تمیز معلوم ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ انہی معمولی خیالات کو جو مدت سے مختلف شکلوں میں بندھتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اس لیے اردو روزمرہ کا سررشتہ اکثر ان کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ بایں ہمہ غزلیت کی شان ان کے تمام کلام میں پائی جاتی ہے اور صفائی و محاورہ اور بہت سے اشعار ان کے ایسے بھی نکل سکتے ہیں جیسے کہ صاف غزلیات ہیں۔ ذوق کی غزل میں گو زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی سے اوّل سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں بالعموم زبان کی صفائی، روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے علاوہ طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکپن ہے جو انہی کا حصہ ہے مگر نہایت تعجب ہے کہ لکھنؤ میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے۔ باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلی اور لکھنؤ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا، اس کے سوا شجاع الدولہ کے زمانہ سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے تمام نامور شعرا کا مجمع لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی، انشا وغیرہ آخر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے مگر متاخرین کی غزل میں ان کی طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ نے زمانہ موافق پایا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علم میں بھی ایک خاص حیثیت ہو گئی۔ اس وقت ضرور اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک ہونے اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا ثقات سے سنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر غالب آگیا۔ نظم میں جرأت اور ناسخ کے دیوان کا، نثر میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا مقابلہ کرنے سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بایں ہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا) زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کو بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہرحال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱ ۔ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اس کی ایک خاص زبان قرار پا گئی ہے

زور وہ اس قدر کانوں میں رچ گئی ہے کہ اگر دفعتاً اس میں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوبِ بیان داخل ہو جائیں تو غزل ایسی ہی مہمل ہو جائے جیسی کہ بعض شعراء کی غزل عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنے سے ہو گئی ہے حالانکہ غزل کو باعتبارِ مضمون کے وسعت دینا بظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ زبان اور طریقۂ بیان کو بھی وسعت دی جائے۔ پس ضرور ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقۂ بیان میں دفعتاً کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہو اور باوجود اس کے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہو سکیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعراء نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیے جاتے ہیں مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعراء کی کثرتِ استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہِ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انہی الفاظ میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ مقبولِ خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی بات کی عام شاعری اگر سر دست مقبول نہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور نئی باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہوں گے اس وقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہاں تک ممکن ہو عام پسند اور مطبوعِ طبائع بنانا ضرور ہے کیونکہ یہی ایسی صنف ہے جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اسی کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اس کو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی گزشتہ اور حال سے اعلیٰ خیالات بھی اوّل اوّل اسی زبان اور روزمرہ میں ادا کیے جاتے ہیں جس میں پرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ایسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جن میں شعرائے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ معلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں ان کو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر ملک کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں تو بھی جن الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اس کا گردش کرنا، زمین کا ساکن ہونا، پانی اور ہوا کا بسیط ہونا، عناصر کا چار میں منحصر ہونا، جامِ جم کا جہاں نما ہونا، ظلمات میں چشمۂ حیوان کا مخفی ہونا، سیمرغ اور دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علمِ انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو انہی غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں سے وہی اکسیر بہا دیے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔

بہرحال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اصنافِ سخن

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بطور کنایہ کے "خوف معلوم ہوا" کی جگہ "گھر یاد آیا" کہا گیا ہے کیوں کہ جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ اس میں صنعت ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس لیے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے یعنی اس میں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھ کر کہ یاد آتا ہے۔ مرزا غالب کا فارسی شعر ہے ؎

بحر مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اس شعر میں اپنی مشکلات اور سختیوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کبھی کیوں نہ ہو اگر اس کو صاف اور سیدھے طور پر بغیر کنایہ کے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی اور باوجود اس کے جس قدر ہیبت ناک صورت میں اس کو یہ تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ مرزا غالب کا اردو شعر ہے ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اس بات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے اور اس عنوان سے بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہرحال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز، استعارہ، کنایہ، تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تا کہ ہر ایک پھیکے مضمون کو آب و تاب سے ساتھ بیان کر سکے لیکن استعارہ وغیرہ میں اس بات کا خیال ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معما بن جائے گا۔ مثلاً ناسخ کہتے ہیں ؎

پگڑی چادر مہتاب شب میکش نے بجلوں پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

چادر مہتاب پگڑنے سے چاندنی کا لطف اٹھانا اور اس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ جن لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورہ بالا امر کو ملحوظ نہیں رکھا ان کا کلام ہمیشہ نامقبول اور متروک رہا ہے جیسے بدر چاچی کے قصائد جن میں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں آہو کے مادہ سے آفتاب مراد لی ہے کہیں اشک زلیخا سے کواکب، کہیں انگلی سے نیزہ عقرب کہیں رگ بنفشہ سے حروف کہیں آب خنک سے پیالہ، کہیں پنج دریا سے پانچ انگلیاں اور اسی طرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اردو میں شعراء نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کر کے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے۔ مثلاً جی اچٹنا۔ اس میں جی کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر، پتھر، گیند وغیرہ یا مثلاً جی بٹنا۔ اس میں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو منقسم و متفرق ہو سکے۔ آنکھ کھلنا، دل کملانا، غصہ بھڑکنا، کام چلنا اور اسی طرح ہزاروں محاورے استعارہ پر مبنی ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نیچرل طور پر بغیر تکلف و تصنع کے اہل زبان

کے سر سے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے مگر اردو شعرا نے تمثیل کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اس کا کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے اور ضرورت نے لوگوں کو اس کے استعمال پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آگیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کی جائیں۔

(ب) محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روزمرہ کے موافق ہو خواہ مخالف لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو (۱۹) بمنزلہ مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں۔ ان میں سے الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملا کر جب پانچ سات بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ جس ترکیب پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے وہ قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانچ سات۔ یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے آٹھ نو یا آٹھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اہل زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بانا غہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے روز بولنا ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اتارنا اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا، کھونٹی سے کپڑا اتارنا، کوٹھے پر سے پتنگ اتارنا، لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، دل سے اتارنا، دل میں اتارنا، ہاتھ اتارنا، پہنچا اتارنا، یہ سب محاورے کہلائیں گے کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے یا مثلاً کھانا اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا، افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا، ٹھوکر کھانا یہ سب محاورے کہلائیں گے۔

محاورہ کے جو معنے ہم نے اوّل بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنے پہلے معنے سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے (دوسرے ؟) معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اس کو دوسرے (پہلے) معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا اور فساد کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے اور نیز اس میں تین پانچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا یا میوہ کھانا یا پان سات یا دس بارہ وغیرہ پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا آئندہ ہم دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاق کریں گے۔

روزمرہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری رکھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہو گی اسی قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا مثلاً "کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا" یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے "کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا" یا مثلاً "آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا" یہاں "نہ ملا" کی جگہ "نہیں ملا" چاہیے یا "وہ خاوند کے مرنے سے زندہ درگور ہو گئی" یہاں "زندہ درگور ہو گئی" چاہیے یا ع

سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں

یہاں "ہو گئیں" کی جگہ "ہوئیں" چاہیے یا ع

"دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا"

یہاں کیا "ہو گیا" چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضروری نہیں بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن　　آج کل دامن دولت ہے ہمارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا باوجود اس کے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے ؎

ان کا خط دیکھتے ہیں جب صیاد
طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی "اڑ جاتے ہیں" کی جگہ "اڑا کرتے ہیں"۔ محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصورت عضو بدن انسان میں اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیے جیسے تناسب اعضائے بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ ان کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے شعر کو سن کر سر دھننے لگتے ہیں اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب انہی اسلوبوں میں وزن کی گھلاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیے صرف روزمرہ

نہ خراب حال کو ناصحا نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
(ذوق)

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
(آتش)

بس بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں
(میر)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
(شیفتہ)

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے — کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں
(داغ)

الغرض رد و بدل کی پابندی تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور مضامین کا اس سلیقے سے باندھا جانا شعر کا زیور ہے۔

(ج) صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے یا بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیے۔ صنعتیں جیسا کہ علم بلاغت میں مفصل مذکور ہے دو قسم کی قرار دی گئی ہیں ایک معنوی جیسے طباق، مشاکلہ، عکس، توریہ، حسن تعلیل، تجاہل عارفانہ، تعجب وغیرہ دوسری لفظی جیسے تجنیس، ردالعجز علی الصدر، منقوط غیر منقوط، رقطا، خیفا، مقطع، موصل، ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی ان کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد ان پر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہو جائے تو ایسے موقع کو بلا شبہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جیسے خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

بنیاز بلبل طبع گلستان ما رند — دراز دستی این کوتہ آستینان بین

اس شعر میں دراز اور کوتہ کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و آستین کے اعتبار سے مراعاة النظیر ہے مگر دونوں صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ معنی مقصود میں بجائے اس کے کہ خلل ہو اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے اور شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے جیسے میر تقی کہتے ہیں۔

یہ جو چشم پر آب ہیں دو نوں — ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اس کا قصد ہی نہیں کیا یہاں ایک کے معنی نہایت بے مثل الاجواب، پھٹا ہوا جیسے کہتے ہیں وہ ایک بدذات ہے یا وہ لوگ ایک شہرہ پشت ہیں۔ دونوں کے مقابلہ میں

ایک کے لفظ نے اگر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے ورنہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقت محض مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اصلی وجہ کی بلاغت پیدا نہیں کی بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ "ایک" کا اطلاق ایسی حسن اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آ سکتا ورنہ ایک شعر یا ایک مصرعہ میں ایک اور دو کا جمع کر دینا کہ جس کا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسنِ مطلع

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے۔ پس اگر اس قسم کی مناسبت لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ مسخرا پن ہو جاتا ہے۔ ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں:

مرغِ دل کو توڑ لے گی بلی ترے دروازہ کی   رخصت تو کو نہ سکا چوہا تمھاری ناک کا

چونکہ "بلی" کے ساتھ "چوہا" لانا واجبات سے تھا اس لیے جب اصلی چوہا نہ ملا تو ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو، مفید ہو، جزو بدن بننے کے لائق ہو، باس اور رنگ وغیرہ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو، مؤثر ہو، الفاظ اور معنا صاف پیرایہ میں ڈھلا ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو زہے نصیب ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہے) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پائی گئی کیونکہ اکثر متاخرین انہی مضامین کو دہراتے ہیں جو ان سے پہلے قدما باندھ گئے ہیں۔ پس تاوقتیکہ وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں انھیں (انہی) معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہو گئی ہے چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے خیال کر لیتے ہیں کہ ان کی مقبولیت کا سبب یہی لفظی مناسبت ہے اور بس۔ اب وہ بہ تکلف انہی صنعتوں کو اپنے کلام میں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کرتے ہیں اور جو اصل خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اس کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جس پر کوئی لباس برا نہیں معلوم ہوتا اتفاق سے بنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا پہن کر نکلے اور لوگ اس کی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اس کی زیبائش کا اصلی سبب حسن و جمال ہے نہ بنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا۔

صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو جیسا نقصان پہنچایا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک جداگانہ آرٹیکل لکھنے کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عجائب قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخر کار رفتہ رفتہ عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسی طرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع و بدائع کی پابندی

دلی کے شعراء میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعراء نے اس کا سخت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے اور مقابلۃً اہل دہلی لکھنؤ کے عام شعراء بھی رعایت لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں لیکن پھر بھی فارسی کے مقابلہ میں اُردو شاعری اس آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ بیہودہ لفظی صنعتیں جن میں معنی سے بالکل قطع نظر کر لی جاتی ہے اور محض ایک لفظی کا گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط، غیر منقوط، رقطا، خیفا، ذو قافیتین، ذو بحرین وغیرہ وغیرہ اُردو شاعری میں کم پایا ہے ہاں مگر حسن صنائع لفظی کے اُردو غزل میں ایک اور روگ پیدا ہو گیا ہے جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

(۵) سنگلاخ زمینیں میں لکھنؤ اور دلی کے شعراء متاخرین نے ہزارہا غزل لکھی ہے۔ میر، سودا، جرأت، درد اور اثر کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ابتدا مصحفی اور انشا کے وقت سے ہوئی ہے اور شاہ نصیر نے سب سے زیادہ اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذوق کو بھی ابتدائی شاعری میں اس کا بہت لپکا رہا ہے۔ مومن کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالب، ممنون، مرزا شیفتہ، درد وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے فن میں پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعر کے سر انجام دینے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا شعر کے لیے مناسب قافیہ کا پہنچانا۔ اسی لیے جب کسی کو سخت دقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیے یورپ کے شعراء نے آخرکار ایک بلینک ورس یعنی نظم غیر مقفی نکال لی ہے اور اب زیادہ تر وہاں اسی طرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے۔ ہمارے ہاں اس پر طرہ یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھلا اور لگا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو ایسا ضروری سمجھ لیا گیا ہے جیسا قافیہ کو۔ اگر تمام اردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گزار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابل گزر بنانا انھی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا مال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا گیا ہے ان میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم دگر کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً نشتر پر لپیٹنت آئینہ، انجیر پشت آئینہ، تدبیر پشت آئینہ، رجال کی مکھی، نعل کی مکھی، دمل اور عسس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آ سکتی جیسے فلک پر بجلی، زمین پہ باراں، سر پہ طرہ، بار گلے میں، نگاہ خدنگ، نگاہ کماں، غرض یہ کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور بامعنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعراء کے لیے قریب ناممکن کے ہو۔ ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بظاہر جاتی رہے گویا تیلی اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں امیر خسرو کی اصل میں کچھ تصرف ہی سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کھیر، چرخہ، ڈھول اور کتا ان چار چیزوں کا اس طرح پیوند ملایا ہے ۔

کیسر کیاری چمن سے پر خمر رہا چلا   آیا گیا کہ گیا ہی تو بھی ڈھول بجا

ایک شاعر گلگیر اور ایشتو آئینہ کو اس طرح پیوند دیتا ہے ؎

آ رکی پہنے ہوئے وہ گل جو لبو سے شمع کا

ہم انگو ٹھے کو کہیں گلگیر پشتو آئینہ نہ

ایک اور شاعر نے گل اور نگھی کو اس طرح گانٹھا ہے ؎

صنعت لعبت چین دیکھ ورا تیب اگر تو

دیکھنی گر ہے تجھے منظور ہو گل کی نگھی

اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کل سنگلاخ زمینوں کا اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو تین عمود سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کر دی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کر لی جا ہیے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے جس کے لیے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا۔ قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے۔ جتنے نامور شعرا گذرے ہیں انھوں نے یہی اصول محوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔

مولانا عبدالسلام ندوی

اُردو غزل گوئی کے چار دور ہیں اور چاروں کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔

قدما کے پہلے اور دوسرے دور کی زبان نہایت ثقیل اور مکروہ ہے اور ان میں لفظی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ شعرائے اُردو میں شاہ مبارک آبرو کے حال میں لکھا ہے :

"مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور پروا نہ کرنا بار یک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ مبین اور پسار کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے۔ نہ صرف انہی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے۔" (تاریخ شعرائے اُردو صفحہ ۱۰)

ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرے میں جو انجمن اُردو لکھنؤ کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا شاہ حاتم کے حالات میں لکھا ہے :

"زبانش از زبان ولی دکنی مناسبت دارد"

سودا صحیح زبان میں لکھنو متقی اپنے تذکرے میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

"و بعضے بسبب دریافت اغلاط صریح و تواردو مصاف در بعض اشعارش مجہل و سرقہ اش نیز نسبت میدہند"

تذکرہ مہر جہاں تاب میں ہے :

"در بیشتر اشعارش الفاظ نکیر منافیہ اندراج یافتہ و مسہل انگاری بعضے از کلمات را بجنبم صحت ملاحظہ نفرمودہ۔"

لیکن تہار کے تیسرے دور میں جب مشاعرہ کا عام رواج ہوا اور شعراء میں باہم ردوقدح ہونے لگی تو صحتِ الفاظ کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی اور اس قسم کی فصیحوں پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ چنانچہ میر حسن منشی بندرابن راقم کے اس مصرعے پر ؎

"کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

ان الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں:

"اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد چراکہ از او فتادن عین ناموزوں می شود۔ در ایں جا عین می افتد و ایں خطاست، درو انستہ فقیر چنیں بہتر سے شود ؎

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

شیخ معین الدین معینؔ کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

خوش ہم عریانی سے اتنے ہیں برنگ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

"خوش ہم عریانی ناموزوں است۔ چراکہ میم با راجباں چسپیدہ است کہ عین چوں چشم غزال از میاں رم کردہ است و ایں سخت عیب است۔"

بالخصوص سعادت خاں رنگینؔ نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے معاصرین کے کلام پر اس حیثیت سے سخت نکتہ چینیاں کیں چنانچہ تذکرۂ مہر جہاں تاب میں ہے:

"ہرچہ کلام ہم عہدش از اتیان بعض الفاظ رکیکہ ہندی و تنگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ قدماء جائز نمانستند و در شعر خود ما در گرفتند آں ہم از اشعار خود برانداخت و ازیں جاست کہ کسے از قدماء و ہم عہدانش نبود کہ در شعرش نباشتے بنیاد ردہ و اعتراض نفرمودہ و بملاحظۂ آں مباحث و دخلہائش پیداست کہ اعتراض بے جا نہ بود۔" (تذکرۂ مہر جہاں تاب "تذکرۂ رنگین")

اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانے میں پختہ تر جیسا مصلح زبان و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت مکمل طور پر کر دی اور ان کے بعد کے شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں البتہ وجدید کے بعض شعراء ان قیود کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ ان مکروہ، ثقیل اور غلط الفاظ کے ساتھ قدماء بعض مضامین بھی نہایت بے کیف اور مبتذل باندھتے ہیں مثلاً ؎

پڑ پڑ کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ	شاید کبھی وہ سرکا بیٹھے ہمارے پاس آ (آبرو)
دی ہے دریا او پر مجھے بچھی	لا اتارا ہے ہیرا سے کس گھاٹ (آبرو)
یار دوہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا	رام اس کا خدلستہ وہ نہیں رام خدا کا (احسن)

ولی، میر درد اور میر سوز کے کلام میں بے شبہ اس قسم کے الفاظ اور مضامین نہیں پائے جاتے لیکن سودا، میر اور قائم کا کلام اس داغ سے پاک نہیں ہے۔

غالباً اس زمانے میں ہجوگوئی کا جو عام رواج ہو گیا تھا اسی نے اس زمانے میں اس قسم کی فحش اور مبتذل زبان پیدا کر دی تھی یعنی

وجہ ہے کہ غزل میں بھی جہاں جہاں مجوبہ گوئی کا موقع آیا ہے وہیں اس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً واسوخت، غضب اور رقیب کو جہاں جہاں صلواتیں سنائی گئی ہیں اسی قسم کی زبان میں سنائی گئی ہیں لیکن شعرا کے تیسرے دور میں زبان کسی قدر فحش الفاظ سے پاک ہوئی اور متوسطین کے دور میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور آج تمام شعرا اسی زبان کے معاملہ میں بلکہ دورِ جدید کے شعرا بوسہ اور وصل وغیرہ کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے۔

غالباً انہی خصوصیات کا اثر یہ ہے کہ قدما کے کلام میں ناہمواری پائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک غزل میں ایک شعر نہایت بلند اور دوسرا نہایت پست ہوتا ہے۔ ایک شعر کی زبان نہایت شیریں، لطیف اور نرم ہوتی ہے اور دوسرے میں فحش اور بازاری پائی جاتی ہے۔ ایک شعر نہایت مہذب اور باوقار ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں ابتذال و رکاکت موجود ہوتی ہے۔ صرف خواجہ میر درد ایک ایسے بزرگ ہیں جن کا کلام اول سے آخر تک اس قدر ہموار ہے کہ اس میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میر حسن ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن ہمہ کلامش سراپا انتخاب"

ایک نامعلوم الاسم تذکرے کی عبارت، جو انجمن اردو لکھنؤ کی لائبریری میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ صاف ہے:

"دیوان ریختہ اش اگرچہ از ہزار بیت متجاوز نیست لیکن ہمہ یکدست واقع شدہ و احتیاج بہ انتخاب ندارد"

ان کے علاوہ اور جتنے قدیم شعرا ہیں سب کے کلام میں نشیب و فراز موجود ہے چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سودا کے حال میں لکھتے ہیں:

"قصائد را مانند قصائد متاخرین بہ پایہ تمامی رسانیدہ و گزین دل ربا این بود کہ ہر شعر دل پسند برآید و ہر بیت عاشقانہ شیرین، لیکن در کلامش ابیات رقص ابتذال واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در غزل"

میر کی نسبت بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ:

"پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند"

اگرچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ گلشن بےخار میں لکھتے ہیں:

"پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند"

تاہم جیسا کہ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے ان کو بھی اس سے انکار نہیں کہ ان کے کلام میں جابجا پستی پائی جاتی ہے لیکن قدما کے تیسرے دور میں سب سے پہلے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مصحفی نے اس طرف توجہ کی اور متوسطین میں ناسخ و آتش نے پست شعر کہنا بالکل موقوف کر دیا اور شعرائے دہلی کی فارسی ترکیبوں نے اس ہمواری میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ مولانا حالی اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ان کے بعد دلی میں مومن، غالب، مومن اور شیفتہ وغیرہ کے یہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں زیادہ دخل پایا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا، باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شترگربگی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے

[illegible] ہے جس سے شاعری کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں اور اظہارِ خیال کے لیے بندشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔
[illegible] سبب ہے ردیف کو بالکل نظر انداز کر کے صرف قافیہ کا التزام کر لینا چاہیے اور قدما نے ان کے [illegible] مطلع کو بہت کچھ پورا کیا ہے۔

٭

جس طرح صوفیہ کے نزدیک شریعت کے ظاہری اور باطنی دو رُخ ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور [illegible]
[illegible] دو حصوں میں منقسم ہے۔ خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خال و خط نمایاں کیے جاتے ہیں اس لیے اس سے صرف نظر [illegible]
[illegible] سادہ تاریخ نگاری اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان تمام اصناف میں شاعر صرف انھی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو [illegible]
[illegible] نظر آتی ہیں۔ خود اس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علیحدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل تمام تر شاعر [illegible]
[illegible] اندرونی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لیے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جا سکتا ہے اور [illegible]
[illegible] کے کلام کا اصلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا یعنی قصائد [illegible]
[illegible] خارجی حصے سے کام لیا ہے اور غزل کو تمام تر جذبات و کیفیات سے لبریز کر دیا۔
غزل کی یہی حقیقت ہے جس کو ولی نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں بیان کیا ہے:

ولی شعر میرا سراپا ہے درد — خط و خال کی بات ہے خال خال

اور ولی کے بعد میر، سودا، درد، سوز اور مصحفی وغیرہ نے اسی فن کی تقلید کی ہے۔

٭

قدما کے دور میں سب سے پہلے مصحفی، انشا اور جرأت نے اس طرز میں کسی قدر تغیر پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی
[illegible] کمال خد و خال کے ذکر سے بھی غزل کو آشنا کیا اس کے بعد متوسطین کے دور میں ناسخ، آتش اور ان کے تلامذہ نے اپنی تمام تر توجہ
[illegible] خارجی اوصاف کی طرف مبذول کر دی اور متاخرین اساتذۂ لکھنؤ کے زمانہ تک وہاں کے تمام شعرا زلف و گیسو کے پھندے میں الجھے
[illegible] ہے لیکن اساتذۂ دلی نے قدما کی روش کو بدستور قائم رکھا اس لیے ان کی غزلیں حدودِ غزل سرائی سے باہر ہونے نہ پائیں۔

٭

شعرائے لکھنؤ میں جلال نے بھی کم و بیش قدما ہی کے طرز کا تتبع کیا ہے۔

٭

اور شعرائے دورِ جدید کی گرم بازاری تو تمام تر اسی طرز کی بدولت ہے۔
(شعر الہند)

[illegible]پروفیسر حامد حسن قادری

غزل کے معنی ہیں عشق و جوانی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق و تصوف وغیرہ مختلف
[illegible] مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ اس کو مطلع کہتے ہیں۔ اگر ایک کے بعد دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ سب مطلع شروع میں ایک دوسرے کے بعد ہوتے ہیں۔ باقی اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے اس کو مقطع کہتے ہیں۔ غزل کے عمدہ شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہتے ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد کی تشبیب میں غزل بھی شامل تھی یعنی قصیدوں کی تمہید میں عاشقانہ مضامین لکھے جاتے تھے اور اس کو غزل و تغزل کہتے تھے لیکن یہ تمہید غزل مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس تشبیب کو غزل کے نام سے مستقل صنفِ شاعری بنا لیا۔ رفتہ رفتہ غزل عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہ رہی بلکہ مختلف و متضاد مضامین لکھے گئے۔ ایک شعر میں محبت، دوسرے میں نفرت، تیسرے میں وصل، چوتھے میں ہجر، پانچویں میں اخلاق، چھٹے میں تصوف، اس طرح ہر غزل تمام اقسام کے مضامین و خیالات کا مجموعہ ہو گئی اور یہ رنگا رنگی غزل کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔

(پہلا دور) جس وقت اُردو زبان بنی اور بول چال میں آنی شروع ہوئی اسی وقت سے فارسی شاعروں نے ایسی غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں جن میں آدھا مصرع فارسی آدھا اُردو یا ایک مصرع فارسی ایک اُردو ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو دہلوی (وفات [illegible]) کی بعض غزلیں اسی طرح کی موجود ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کی غزل کا ایک شعر یہ ہے:

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اس کے بعد اُردو ہی میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ کبیر داس (وفات [illegible]) مشہور درویش اور شاعر گذرے ہیں۔ ان کی غزل کا مطلع ہے:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

اس کے بعد اکبر و جہانگیر کے زمانے میں بھی بعض شعراء نے غزلیں لکھیں۔ اسی زمانے میں دکن کی سلطنت گولکنڈہ کا بادشاہ محمد قلی قطب شاہ (وفات ۱۶۱۱ء) بڑا زبردست اُردو شاعر تھا۔ اس کا کلیاتِ نظم جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، مرثیے سب کچھ ہیں، حیدر آباد کے سرکاری کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

قطب شہ نہ دے مجھ دیوانے کو پند — دیوانے کوں کچھ پند دیا جاتا نا

مجھ عشق کے گدا کوں اورنگِ شاہی دینا — سب عاشقاں کے انکھیں ہیں طفل جوں دبستاں

(دوسرا دور) قطب شاہ کے زمانے کے بعد غزل کا سب سے بڑا شاعر ولی اورنگ آبادی ہے۔ ولی کے کلام میں پہلے دکھنی الفاظ اور محاورے زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو یہاں کی زبان لکھنے لگے۔ شروع میں ولی نے بھاشا کی شاعری کا انداز بیان اور خیالات و جذبات اختیار کئے اور ایسے شعر بھی لکھے:

بروگی جو کہاتے ہیں انھیں گھر بار کیا کرنا — ہو جوگن جو گوئی پی کی اسے سنسار کیا کرنا

پھر دلی کا اثر قبول کیا اور ایہام گوئی کی ــ

مست گل نزل شبنم موتی　　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اس دور کے اور شاعر آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، آرزو وغیرہ ہیں ۔ اس زمانے میں ایہام گوئی اور رعایت لفظی کا بہت [illegible]ق و رواج تھا ۔ مثلاً یکرنگ کا شعر ہے ــ

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

(تیسرا دور) اس زمانے میں شاہ حاتم دہلوی (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) نے غزل کی زبان، الفاظ، محاورہ میں اصلاح کی [illegible] [ف]غاں دہلوی (۱۶۹۹ء تا ۱۷۷۲ء) نے ایہام گوئی کو ترک کیا اور سلاست و واقعیت، لطف و تاثیر کا خیال رکھا ۔ مثلاً ــ

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر کہیو تو　　　کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم　　　کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانجاں اپنا

(چوتھا دور) اس دور کے تین شاعر غزل گوئی میں سب سے مشہور ہیں ۔ سودا، درد، میر ۔ ان کے علاوہ میر حسن، یقین [illegible]ن کا رتبہ ہے ۔ اس زمانے میں بعض قدر خوبیاں اور دلکش زبان و بیان، سادگی، صفائی، لطف و اثر کے اعتبار سے پیدا ہوئیں [illegible] سے پہلے اور اس کے بعد نظیر نہیں ملتی ۔ مثلاً ــ

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں　　　یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کہے ہے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی　　　جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

(پانچواں دور) اس زمانے کے شاعر گزشتہ دو دوروں کے ساتھی ہیں لیکن ان سے کچھ چھوٹے یعنی مصحفی، میر اثر، [illegible] [ا]نشا، رنگین وغیرہ ۔ ان شاعروں کی غزل میں اکثر وہی خوبیاں ہیں جو پہلے تھیں، صرف میر تقی کا سوز و گداز، میر درد کا تصوف نہیں ہے ۔ اس کے [illegible] جرأت، انشا و رنگین نے ادنیٰ جذبات اور بازاری معاملات زبان کا اضافہ کر دیا ہے ۔ زبان پہلے سے کچھ زیادہ صاف [illegible] ہو گئی ہے نمونہ یہ ہے ــ

پھٹ چکا جب سے گریباں اپنا　　　ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر سے آ کے　　　ہم تو کیسے تھکے بیٹھے ہیں

دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دوانہ ہے ولیکن بات کرتا ہے ٹھکانے کی

(چھٹا دور) یہ زمانہ ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے ۔ زمانہ انقلاب ہے ۔ دہلی کے قدیم شاعروں کی سی سادگی اور شیرینی

نیاز فتحپوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ جس نے حبت کی ہے، سے تو یہ جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو۔" اب غور طلب امر یہ ہے کہ محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے؟

محبت یا عشق کی حقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و شدت اظہار کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم کسی کی زخمی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم کو ہر قدم پر کوئی چیز نظر آتی ہے اور بے اختیار ہمارے کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر دکھائی دیتے ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ندرت و تاثر پیدا کیا جائے اور اسی ندرت کے پیدا کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص انداز مقرر کئے گئے ہیں۔

یہ اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی سے سابقہ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن اس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، بھائی، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز اور بھی روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عشق کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن سے کچھ پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو فوراً معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے، عاشق نے کہا میں تم پر جان دیتا ہوں، معشوق نے کہا میری بلا سے "چھیڑئیے قصہ ختم" ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جزئیات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنس سے متعلق ہو سکتی ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا........
دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہری رنگ کی ہے لہٰذا اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

نہ کہ محض تصورات کا۔

(انتقادیات دوسرا حصہ)

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قائم کریں، لیکن ولی اور میر کے زمانے سے کر چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ زمانہ سے "حسن پر پوش" کا خاتمہ ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "بیان اپنا" ضرور بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی، بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لیے غزل کی زبان اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کر کے غزل گوئی کی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دیئے ہیں، اس لیے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "ناکافر" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دلبران مہوش" کی "کارگاہِ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لیے ویران کر گیا۔

(نگار۔ جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خان

گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنفِ سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ دنیا کی ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت اور طرزِ فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجریدی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی مثال اردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساسِ جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر۔ . . . . .

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی تو اسے صالح کی ترقی کا موجب ہوگا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور ان کے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں اُن کا مشورہ قابلِ قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت، اور جگر، آرزو، فانی اور اصغر کی زمزمہ سنجیوں سے

محروم رہتی جو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے بیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہدِ جدید کی زندگی کا رحجان کلام میں تسلسل کا متقاضی رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے بجائے نظم میں وحدتِ احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ غزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آ جائیں گی۔

غزل

ڈاکٹر سید عبداللہ

غزل اپنی تعمیر و ترکیب کے لحاظ سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے۔ الفاظ و معنی کا حسین و لطیف پیوند، جذبے کی سچائی اور کیفیت — خونِ جگر اور لطفِ نظر کا امتزاج ایک خاص قسم کی نغمگی اور موسیقیت۔ یہ سب ایک اعلیٰ غزل کی خصوصیات ہیں۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سی بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامل تناسب اور موزونیت غزل کی بنیادی صفت ہے اور اعتدال و توازن اس کی اساسی شرط۔

اچھی غزل کی بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ساخت کے اعتبار سے متناسب ہو۔ علمائے فن نے غزل کی ساخت میں تعداد اشعار کو معین اور محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور غزل کی طوالت کو عیب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا جسم ایک خاص صورت رکھتا ہے جس کے حسن کے لیے ہر دوسرے جسم کی طرح تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ غزل کے اشعار تعداد میں جب آٹھ نو سے بڑھ جاتے ہیں تو عموماً اس کے جسم میں ڈھیلا پن، بے ڈھنگا پن اور کھوکھلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غزل کا جسم اپنے تناسب کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور غزل اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ جاتی ہے۔

غزل میں مرکزِ ثقل سے مراد وہ مرکزی جذبہ ہے جس سے غزل کی تحریک ہوتی ہے، یا وہ خیال جو غزل کا سب سے نمایاں خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ مشاعرے کے رواج نے غزل کو میکانکی عمل بنا دیا ہے۔ اور اس کے لیے عموماً مصرعِ طرح کے سوا کوئی خارجی تحریک ضروری نہیں سمجھی جاتی، مگر اصل شاعری کسی بھی جذباتی تحریک کے بغیر لذت دار نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے سب بڑے غزل گوؤں کی غزل میں یہ نمایاں جذبہ یا مرکزی خیال (جو اس غزل کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے) صاف صاف نظر آ جاتا ہے۔ یہ مرکزی جذبہ ہر اچھی غزل میں ضرور ہوتا ہے۔ باقی لہریں غزل میں اس مرکزی جذبے کے زیرِ اثر نمودار ہوتی ہیں۔

اس خاص پہلو سے غزل میں تعداد اشعار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو غزل کے مرکزی جذبے کا اثر بکھر جاتا ہے۔ قوافی کے تقاضوں سے بعض اوقات متضاد اور بے آہنگ مضمون پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا کم از کم جذبے کے بالمقابل دوسری لہریں اس بے ہنگم طریق سے غزل میں جمع ہو جاتی ہیں کہ غزل کا مرکزی تحریک بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے غزل کی غزلیت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

(بحث و نظر)

کلیم الدین احمد

اردو شاعری میں ایک انقلاب رونما ہوا لیکن غزل کی اہمیت اور ہردلعزیزی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔ آج بھی غزلوں کی وہی فراوانی ہے جو عصر حاضر کے آغاز سے پہلے تھی۔ اس کی ایک وجہ تو صنف غزل کی آسانی ہے۔ غزل کے لیے نہ قوت عاسہ کی ضرورت ہے نہ ادراک و فکر رسا۔ تخیل اور قوت تعمیر کی بھی ضرورت نہیں کسی قسم کی ذاتی خوبی یا رجحانی مقصود نہیں۔ خیالات و جذبات موجود ہیں، الفاظ بندشیں ترکیبیں بھی موجود ہیں، بحور و اوزان بھی موجود ہیں۔ ذرا مشق کی اور غزل تیار ہو گئی۔ جب اس قدر سہل و آسان نسخہ ہے تو ہر شاعر بن سکتا ہے تو پھر کوئی کیوں [illegible] ایسے [illegible] وجہ یہی ہے کہ جب اعتراضات غزل پر کئے گئے وہ مضامین غزل سے وابستہ تھے کسی نے صنف غزل کی خامیوں کو آشکارا کیا اور یہ ممکن ہی کب تھا جب وہ شعوری طور پر اس کے نقائص سے آگاہ بھی نہ تھے۔ حالی و آزاد نے غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ غزل حسن و عشق کی [illegible] کے ساتھ ذرا [illegible] سے گئی۔ جس نے مذہبی و خصوصاً اخلاقی مضامین داخل غزل ہو گئے لیکن حالی اور آزاد کی کوششوں سے کوئی اہم تغیر پیدا نہ ہو سکا اور بعد شعرا اپنے پرانے راستے پر چلتے رہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ حالی اور آزاد کی تحریک کا اعادہ کیا جائے۔ شعرا کے ایک طبقہ نے از سر نو غزل کی حدود کو وسعت دینے کی کامیاب کوشش کی۔

یگانہ کہتے ہیں:

"ہمارے بعض شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ فرسودہ شاعری کی ترویج و تہذیب میں بدستور مصروف و منہمک ہیں۔ وہ شاعری اور شاعروں کو صرف تحفظ اور زبان کا ذریعہ سمجھ کر ان کے احیا کی کوشش میں فکر مند ہیں مگر اپنے کو روایات سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ وہی ان کی شاعری ہے وہی شاعری ہے اور وہی ردیف و قافیہ کی طرف رجحان ہے"

شاعری کی ہیئت اور اس کی اہمیت سے وہ آشنا نہیں۔ شاعری اور خاص شاعری کو وہ غزل کا مترادف سمجھتے ہیں محض ایک ذریعہ تفریح ہے اور وقتی تفریح کے علاوہ اگر اس سے کوئی فائدہ مقصود ہے تو وہ تحفظ زبان کا تحفظ۔ اس لیے وہ پرانے فرسودہ خیالات مضامین کو روزمرہ اور با محاورہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ یگانہ بھی حالی و آزاد کی طرح اصلیت کے فقدان پر زور دیتے ہیں اور تقلید اور نقالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ نقطہ نظر نیا نہیں حالی و آزاد کا ہے۔ حالی کی طرح یگانہ بھی اخلاقی معیار سے شعرائے متغزلین کو جانچتے ہیں۔ مضامین ہی نہیں زبان پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور شعراء کی تنگ نظری کا انکشاف کرتے ہیں:

ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی ساخت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ نئے معانی اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زبان کے لیے اس سے کچھ ہی کم مہلک ہے جتنا کہ ان حضرات کی غلطی روک تھام نہ کرنا۔

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری | زلفوں میں الجھیں ہے ہر گوشہ پہ عریاں ہو
اے رہروِ فرزانہ رستے میں اگر ہیں پہ | گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

پہلی غزل میں خیالات محض معمولی ہیں۔ ان کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات صرف معمولی ہی نہیں فرضی بھی ہیں۔ ان خیالات و جذبات نے شاعر کے دل میں ہیجان اور تخیل میں طوفان نہیں برپا کیا ہے اس لیے ان میں اصلیت مفقود ہے۔ اسی اصلیت کی کمی کی وجہ سے زبان اپنی سادگی کے باوجود بالکل پھیکی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے لیکن شعراء کا ایک معتد بہ حصہ ابھی تک اسی قسم کی شاعری کے دام میں پھنسا ہوا ہے جس کا نمونہ ان دو مصرعوں میں ملتا ہے:

(۱) "خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی"
(۲) "نری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی"

اسی پر سر دھنتا ہے اور ایسی غزلوں کی بنا پر اپنے کو شاعر کہلانے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس قسم کی غزلیں معیار شاعری پر پوری اتر نہیں سکتیں۔ اگر انھیں غزلیت کے معیار سے بھی جانچا جائے تو نہایت ہی بے جان ثابت ہوں گی۔ دوسری غزل بھی غزل ہے اور نظم بھی۔ اقبال پیغام گو ہونے میں لیکن یہاں ایک دوسرا عالم ہے۔ خیالات غزل کے رسمی خیالات سے یک سر مختلف ہیں۔ ہر شعر میں ایک پیغام عمل پنہاں اور راز زندگی مضمر ہے۔ خیالات بذات خود اہم و بلند پایہ ہیں لیکن ان کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت موجود ہے۔ یہ محض فرضی اور خیالی نہیں۔ تقلید و نقالی کا نتیجہ نہیں اس لیے ان میں گرمیٔ جذبات اور رنگینیٔ تخیل دونوں چیزیں موجود ہیں۔ خیالات کی بلندی نے الفاظ کو بھی رفیع و بلند پایہ بنا دیا ہے۔ ایک طرف یہ رنگ ہے

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
نری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

جس میں اگر کوئی حسن ہے بھی تو محض لفظی۔ مضمون عامیانہ اور طرز ادا بھی انفرادی نہیں اور دوسرا رنگ ہے ایسا ہے

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

جس سے ولولے بھڑک اٹھیں اور دل اولوالعزمی کی جولانگاہ بن جائے۔ سچ جوش نے ہر ہر لفظ میں ایک بے پناہ زور ڈال دیا ہے۔

پرانے رنگ کے علمبردار ایک دائرہ محدود سے نکلنا اور رنگ و اختیار کی مفر قیود سے باہر آنا کفرِ شاعری سمجھتے ہیں۔ ہما کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں اور اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں منتقل کرنا ان کا ایک مستقل مگر مہمل شغل ہے۔

معلوم ہی نہیں اکثر کہنہ مشق و فادر الکلام شعراء بھی اسی شغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ غزل سے سر مو بھی تجاوز کریں یا اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش پیدا ہو۔ یہ روز مرہ کی تدریج کے حامی ہیں۔ رعایت لفظی اور

پر وہ تہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ جیسا پیش پا افتادہ ہے اصلیت سے بہترا ہے اور بندش الفاظ میں چستی کے سوا اور کوئی حسن بھی نہیں۔ طرز یا انفرادی نہیں۔ ہر شخص ہر اس قسم کے اشعار با آسانی نظم کر سکتا ہے۔ جہاں شاعر کے ذہن میں "شانہ" کا قافیہ آتا ہے وہاں "زلف پریشاں" کا خیال بھی لازمی ہے۔ پھر ضد کی رعایت سے "زلف پریشاں ہیں شانہ ہوتا ہے" کا مضمون مرتب ہوتا ہے ایک مصرع اور پھر مصرعہ "وہاں زلف پریشاں" ابھی تک شانہ ہوتا ہے "نظم ہو گیا۔ پھر وہاں" "ابھی تک" کی رعایت مد نظر رکھتے ہوئے مصرع کی تخلیق میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ اسی قسم کا کوشاعری تصور کیا جاتا ہے۔ پہلے تین شعر دراصل خیالات سے نہیں لیکن وہ مبتذل بھی نہیں۔ خیالات کی بلندی کی وجہ سے الفاظ اور جذبے میں بھی بلندی نمایاں ہوگئی ہے ۔ ۔ ۔ اشعار میں شوکت اور متانت آگئی ہے۔

سمجھ والے سمجھ سکتے نہیں راز محبت کو
وہی کچھ با خبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے

رعایت لفظی یہاں بھی ہے۔ "سمجھ" "سمجھ والے" "با خبر" "دیوانہ" لیکن قاری کی توجہ دام الفاظ میں پھنس کر رہ نہیں جاتی۔ پر اس خیال سے بھی باخبر ہوتی ہے جس کا اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے۔ خیال کی اہمیت الفاظ پر غالب ہے۔ غور طلب امر یہ بھی ہے کہ ابھی تک ایک غزل میں شعرا ہر قسم اور ہر مرتبہ کے اشعار داخل کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ غزل میں مربوط و مسلسل اشعار نہ سہی مگر اتنا تو ممکن تھا کہ کم و بیش ایک ہی پایہ کے اشعار ایک غزل میں داخل کیے جاتے۔

۲۔ نوح ناروی

یہ بسمل ہو نہیں سکتا وہ قاتل ہو نہیں سکتا	کوئی قاتل ہے بننے سے قاتل ہو نہیں سکتا
جو پہنچیں گے تو ہم پہنچیں گے مرکر کوچۂ جاناں تک	کہ جیتے جی کوئی جنت میں داخل ہو نہیں سکتا
یہ کہہ کہہ کر کیا مجبور اسے آنکھیں لڑانے پر	نظر سے جس کی شرمائیں وہ قاتل ہو نہیں سکتا
سر مقتل وہ دیں کیسا ابرو ئے خمدار کو جنبش	کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

یہ نظر سے ہیں یہ چالیں ہیں یہ باتیں ہیں یہ گھاتیں ہیں
مرے دشمن کو تم سے عشق کامل ہو نہیں سکتا

استعجاب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں تہذیب و تعلیم یافتہ طبقے میں اسے شاعری سمجھا جاتا ہے ۔

سر مقتل وہ دیں کیسا ابرو ئے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

ایسے اشعار سے کسی تربیت یافتہ دماغ کو بے لطفی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لطیف احساسات کو ایک صدمہ پہنچتا ہے۔ طبیعت سرا سر منغض ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ ابھی تک اسی قسم کے اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے اشعار میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ داغ کے رنگ کا اتباع کیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں "کوچۂ جاناں" کو شاعر نے جنت قرار دیا ہے۔ یہی اس شعر کی جان ہے۔ اگر "کوچۂ جاناں" کو ایک محلے کے لیے "جنت" نہ تصور کیا جائے تو شعر بے معنی اور مبہم ہو جاتا ہے

تعلّی برطرف یہ شعرا رسم کی قید سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ہر شاعر ایک انفرادی اسلوب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اسی لیے ان کی غزلوں میں کم از کم ظاہری تکرار بے لطفی نہیں پیدا کرتی ان کے حوصلے بلند ہیں۔ یہ ذرات کو چھوڑ کر خورشید کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اسی ناکامیابی کی وجہ بھی عموماً وہی ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں میں بے لطفی پیدا کرتی ہے یعنی اصلیت کا فقدان۔ اس جیفے کے شعرا جدت طرازی اور نازک خیالی یا معنی آفرینی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ صداقت و اصلیت کا خیال بھی نہیں رہتا۔ لفظی حسن تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن تاثیر باقی نہیں رہتی ؎

تیری نمود ارتقا جلوہ گہ حیات کا	تیرا وجود معجزہ عالم کائنات کا
کھینچ دیں اصل و فرع میں صاف حدود امتیاز	ذہن و نظر کرے میا علم صفات و ذات کا
تیرگی وجود سے زندگیاں ہوئیں طلسم	عقدہ کیا ہو تو نے حل فلسفۂ حیات کا
کشمکش مآل سے روح کو کر دیا رہا	آخر بتا رہے تو مرحلۂ نجات کا
رہنے دے مجھ بے خودی خاطر پُر خروش کو	راز کھل نہ فاش ہو قید تعینات کا

الفاظ بلند آہنگ اور رفیع الفاظ کی کثرت ہے "ارتقا" "جلوہ گاہ حیات" "فلسفۂ حیات" "کشمکش مآل" "مرحلۂ نجات" "خاطر پُر خروش" "قید تعینات" "تیرگی وجود" زبان علمی ہے۔ جہلا اور عوام کی زبان سے بہتر بھی ہے۔ لفظی حیثیت سے ان اشعار کو تفوق اور امتیاز بھی حاصل ہے لیکن یہاں شاعری رفعتوں کی حامل نہیں۔ لفظی شوکت معنوی شوکت کے ہم دست ہے۔ خیالات عامیانہ و پیش پا افتادہ نہیں لیکن پھر بھی یہ اشعار نہیں اس لیے کہ خیالات محسوسات کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے ہیں۔ خیالات کی اہمیت و صداقت، الفاظ اور بندشوں کی رفعت و ندرت میں اصلیت نہ ہو اگر جذبات معدوم ہوں تو شعریت کے لیے کافی نہیں۔ اکثر اس طبقے کے شعرا زور کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ جو خیالات ان کے دماغ میں آتے ہیں انھیں پرکھتے نہیں، محض زور شور لفظی رعب و نکہت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس لیے غزلیں اکثر مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

جب دل نے مجھ کو شعلہ بداماں بنا دیا	میں نے ہر ایک خار کو بستاں بنا دیا
زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاع دل	ابرو کی جنبشوں کو رگِ جاں بنا دیا
جلووں کو دیں نظام دو عالم کی وسعتیں	شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا
غنچوں کی چٹکی کو عطا کی شگفتگی	شبنم کی بوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا
کج کر کلاہ فخر کہ تیرے شباب کو	میں نے حدیثِ عالم امکاں بنا دیا

جب یہ شعرا لفظی شوکت و ندرت کی قید سے آزاد ہو کر غزلیں لکھتے ہیں تو کچھ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ سادہ پیرایہ میں اور مختصر بحروں میں اکثر دلچسپ اشعار موزوں کر لیتے ہیں۔ غالب و مومن کا رنگ اور اثر تو نہیں آتا لیکن یہ اشعار سراسر بے مزا نہیں ہوتے اور کانوں پر گراں نہیں گزرتے ؎

نہیں بنتی دلِ تنہا فشاں سے	کسی کو بھیج دے یا رب کہیں سے
کوئی دیکھے مری وحشت سوالی	انھیں کو مانگتا ہوں میں انھیں سے

کسی نے حال کچھ اس طرح پوچھا ‏ دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے
یہ مایوسی کا تیرِ آخری ہے ‏ بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے

عنایت ہو جو سوزن دے بخیہ گر تو
مرا دامن کسی کی آستیں سے

"تنہا نشیں"، "وحشت سوالی"، "اندوہ گیں"، علمیت و ادبیت کی چاشنی حاوی ہے لیکن یہاں خیالات کی اہمیت الفاظ کی اہمیت سے کم نہیں۔ شاعر محض نئی بندشوں کے اختراع یا علمی الفاظ کی جستجو میں سرگرداں نہیں۔ معانی پر نظر ہے اور انھیں صفائی اور پختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات جدید نہ سہی ان کی ترجمانی دلکش پیرایہ میں کی گئی ہے۔

کوئی دیکھے مری وحشت سوالی
انھیں کو مانگتا ہوں میں انھیں سے

وحشت سوالی کا کتنا اچھا ثبوت دوسرے مصرع میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں بھی ایک اچھوتا پن ہے۔ "نگاہِ واپسیں" کو مایوسی کا "تیرِ آخری" قرار دینا پھر بچے رہنا کا ٹکڑا نہایت پر لطف ہے۔ یہ ہے بارنگِ تغزل لیکن اس رنگ میں کامیاب غزلیں کم ملتی ہیں۔

(اردو شاعری پر ایک نظر)

سید اعجاز حسین ایم۔اے

دورِ حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابلِ دید ہے۔ اس دور سے پہلے جو خرابیاں غزل میں آگئی تھیں نہ صرف وہ دور ہوئیں بلکہ بعض لحاظ سے وہ خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں جو شاید کسی ایک دور میں اردو نہیں پیدا کر سکی تھی۔ ایک ایک خصوصیت کو بالتفصیل بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ مختصراً موجودہ دور کی غزل گوئی میں حسبِ ذیل خصوصیات قابلِ ذکر و توجہ ہیں۔

دورِ حاضر میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ تاثر، ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیت کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی۔ تصنع اور لفظی بھرمار اور بے کار باتوں کے بجائے شعراء نے سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطیف و پرمعنی کنایات موجودہ اردو غزل کی امتیازی خصوصیات بنتے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو واقعات و امور روزانہ نظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے ان کو دوربیں نگاہوں نے غیر متناہی اور بے پایاں دیکھ کر شعرا کے کلام میں حیرت کا عنصر بہت بڑھا دیا ہے۔

تصوف نے اصولی اور رسمی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر اکثر مقامات پر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ مسائلِ تصوف کا بیان سینکڑوں نئے عنوانات سے شعرا کرنے لگے ہیں۔ اپنی شخصیت اور انفرادی لب و لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے۔ متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ملیں گی۔

ایک بڑی خصوصیت جو جدید اردو غزل میں نظر آتی ہے، وہ اس کی حقیقت و واقعہ نگاری ہے۔ مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گندے نالے سے بچتے ہوئے ہمارے شعرا نے جذبات و تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا۔ عموماً وہ ان ہی خیالات کو نظم کرنا چاہتے ہیں جن میں حقیقت و کیفیت ہو۔ نیز شوخی و بے کیف مبالغہ سے بڑی حد تک دورِ جدید نے محفوظ رکھا۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں۔ جو الفاظ و تراکیب کثرتِ استعمال سے پامال ہو چکی تھیں۔ ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے انداز سے کلام کو سنوارنے کی جد و جہد جاری ہے

زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر زور ہے۔ اس وجہ سے آج کل کبھی کبھی نامانوس ترکیبیں تو ضرور نظر آتی ہیں، لیکن خیالات کی بلندی اور مضامین کی نوعیت پہلے سے اب بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ نفسیاتی تحلیل و سبب اور اس کے بالواسطہ اثر سے غزل کی دنیا آراستہ کی جا رہی ہے۔ حسنِ تعلیل کی مثالیں زیادہ قاعدے کی اور قابلِ قبول آنے لگی ہیں۔ اس میدان میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فلسفۂ حیات و رموزِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خامیوں کا بحیثیتِ انسان بیان کر دینا غزل گو شاعر نے عین عاشق کیلئے مستحسن سمجھا ہے۔ حسرت موہانی کا شعر ہے ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وارداتِ قلب کے فطری پہلو کو شاعر نے اس لیے ضروری سمجھا کہ معیاری عشق کی تلقین میں حقیقت پس پشت ہو جاتی ہے اور واسطہ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جو واقعیت سے الگ ہوتے ہیں۔ عہدِ ماضی میں شعرا مثالیت پسندی سے متاثر ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں کا بھی شمار معائب میں کرنے لگے تھے۔ ہر عاشق کو مجنوں و فرہاد کے افسانوی عشق کی کسوٹی پر کسنا چاہتے تھے لیکن عہدِ جدید میں نفسیاتی اور حقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔

میر و سودا کے زمانے میں داخلی پہلو غزل کی جان سمجھا جاتا تھا مگر دورِ متوسط میں ایک ایسا بھی زمانہ گذرا ہے کہ جس میں خارجی پہلو کو زیادہ جگہ مل گئی تھی۔ غزل اب ظاہری خد و خال کو اوّل تو سطحی چیز سمجھ کر اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتی اور اگر دیتی بھی ہے تو محض تعریف کر کے چپ نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دیکھنے سے جو کیفیات دل پر گزرتی ہیں ان کو مزے لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے

ایک دوسری خصوصیت بھی آج کل کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اب سے پہلے بہت کم شعرا کا کلام ایسا ملے گا جو شروع سے آخر تک ہموار ہو۔ آج کل کے ممتاز شعرا اس کا زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ ہم تو یہ کہنے کو تیار نہیں کہ موجودہ غزلوں میں ناہمواری بالکل نہیں ہے مگر اس سے کافی تسکین ہو جاتی ہے کہ ایک بڑی حد تک لوگوں کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

یہ سب تو ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیز اثر کو نگاہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں۔ تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بڑھتی جا رہی ہے۔ سہلِ ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں۔ فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں سے کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہِ راست سے الگ پڑ جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حسن و عشق کے تصادم کو زیادہ دیکھا جا رہا ہے سینماؤں یا افسانوں میں یا درس گاہوں میں یا سرِ راہ سے گاہے ماہے دیکھنا بھی تفریح کی بنا پر مبنی ہوتا ہے۔ بہت کم سپردگی اور بیدلی کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بجز چند شعراء کے زیادہ تر لوگوں کی غزلوں میں جو عاشقانہ اشعار ملتے ہیں ان میں بھی انہماک و گرفتگی بہت کم ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو بہت قریب سے نہیں دیکھا گیا۔ عشق میں مٹ جانے کی صلاحیت بہت کم غزل گو شعرا میں نظر آتی ہے یا تو رسمی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا ان کا عشق سرسری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربات اور ان میں عمق کی کمی درد و شدت کو اشعار پر زیادہ نہیں اُبھرنے دیتی۔

ان باتوں کا جواب اس راز میں مضمر ہے کہ غزل اور عشق کا نظریہ ہو گیا وہ وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ غالب غزل میں نقید حیات اور دیگر مضامین کو کافی جگہ دینے کا خیال رہتا ہے۔ محض حسن و عشق کی داستان تک محدود رہنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عشق کو مثالی درجے پر رکھ کر نصب العین قرار دینا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ عشق کا روحانی پہلو جنسی خواہشات میں تبدیل ہو چلا ہے۔ یہ نیچ نظر لیا ہے کہ انہماک و سپردگی کو خود کار کر دیا ہے۔ بقول فراق ؏

بدلتی جا رہی ہیں بزمِ زمانہ کی روایتیں

نظموں کے دائرے کو وسیع ہوتے دیکھ کر موجودہ غزل گوئی نے بھی بعض بعض نظموں جذب کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ اشعار میں مضامین لانے کی خاطر کسی قدر تشنگی پیدا کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مضامین کو پوری طرح واضح کرنے میں ایک ایسا تسلسل پیدا ہو گیا کہ یہ غزلیں نہ نظم رہتی ہیں اور نہ غزل ہی کے صحیح مفہوم کو پورا کرتی ہیں۔

بلندیٔ تخیل کی کمی کہیے یا معاشی زندگی کی ابتری سے انتشار کا نتیجہ سمجھئے کہ موجودہ غزلوں میں ایسا مجموعہ بھی ہے جس میں غیر عاشقانہ اشعار کی بھرمار ہے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظم یا رباعی یا قطعہ میں سے خیال لیے گئے ہیں اور اپنی ساخت کی وجہ سے چند عاشقانہ اشعار کی آمیزش سے ان کے مجموعہ کو بھی غزل کہا جا رہا ہے۔

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کافی آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے جو کائنات عالم یا جذبات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے نیم شعوری احساسات کی لہروں کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی مسائل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اُردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہے۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اجرام فلکی اور خوشگوار یا ناخوشگوار مناظرِ قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ تخیلی و جذباتی رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات ہمارے نزدیک غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جن کا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔

(نئے ادبی رجحانات)

آل احمد سرور

ولی کے وقت سے لے کر غالب اور ان کے ہم عصر شعراء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں غزل نے تکمیلِ فن کے تمام مراحل طے کیے اور وہ ہماری شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد اور حالی

نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی مگر دراصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے۔ اس غزل کے خلاف تھے جو تنگ، محدود اور مصنوعی ہوگئی تھی۔ یہی اس معنی میں کہ استادی شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعری کی راہ میں کوئی مفید کام نہ کرتی تھی محدود اس معنی میں کہ معاملہ، روزمرہ، رعایت و بدائع، تصوف و فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کے لیے لازمی چیزیں بن گئی تھیں اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور ان کے دہلوی مقلد شاہ نصیر نے غزل کو بھی دماغی ورزش یا کمالِ فن کا ایک ذریعہ سمجھ لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شروع سے غزل یہی مصنوعی اور محدود تھی۔ غزل میں شروع ہی سے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بھی ہے اور مشاہدۂ حسن بھی مگر متاخرین کے دور میں صنعتی معیار زیادہ اہم ہوگیا تھا اور قدما والی قدریں ذرا دھندلی ہوگئی تھیں اس لیے مشاہدۂ گردوپیش جو غزل میں برابر ملتا ہے، اس زمانے میں اتنا نمایاں نہ رہا تھا۔ اُردو کے غزل گو شاعر کے متعلق یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز، اپنے خیالات کی دنیا الگ بنائے رہتا تھا۔ دراصل اس کے خیالات کی دنیا اتنی الگ تھلگ نہ تھی وہ ان تمام چیزوں سے پوری طرح اثر لیتا تھا جو سیاسی، معاشرتی یا اس زمانے کی ادبی زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ضرور تھا مگر اپنی شاعری میں ان زنجیروں کو اس طرح جھٹکے دیتا تھا کہ قید میں آزادی بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اس کے یہاں انتشار اور پراگندگی ضرور تھی مگر نہ اتنی کہ کوئی خاص مرکزی خیال یا تصور سرے سے ناپید ہو۔ حسن و عشق اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کے سوا کچھ اور چیزوں کا بھی وہ قائل تھا "چیزے دگر" کے لیے وہ غزل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا اور بادہ و ساغر اور قفس و آشیاں کے پردے میں صرف تصوف اور فلسفہ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بیان کر جاتا تھا۔ اردو شاعری میں یہ رمزیت (SYMBOLISM) اس قدر عام تھی کہ ایک سے ایک بڑے چھوٹے شاعر نے فائدہ اٹھایا۔ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنے شعرا کے یہاں سوائے محاورہ، روزمرہ، معاملہ بندی، فکر شعر، خمریات، پند و نصائح، صنعتِ مراعاۃ النظیر کے اور کچھ تلاش نہ کیا۔ حالی اور آزاد کے بعد وہ تلخی اور بھی زیادہ ہوگئی جو ہمارے شعرا محسوس تو کرتے تھے مگر عشق پروہ نشیں میں بہلانا چاہتے تھے مغرب کے اثر سے شاعر کے نصب العین میں آزادی ہوئی۔ مغربی ادب پر نگاہیں جمنے لگیں، سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ حکومت کی بساط بھی بدل گئی اور اب نظموں میں وہ باتیں صاف صاف بیان ہونے لگیں جن کے لیے غزل میں پردے تلاش کیے جاتے تھے۔ جدید غزل قدیم غزل سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ صرف زبان اور فن کے لحاظ سے اس میں قدیم غزل کے مقابلے میں تھوڑی سی بے راہ روی آگئی ہے اور اچھے اچھے شاعر خیال کے پیچھے لفظ کی صحت کو قربان کر دیتے ہیں یا کسی شاعرانہ جواز کے پردے میں پناہ لیتے ہیں مگر شاعر کی زندگی پہلے سے بدل گئی ہے۔ اس میں اجتماعی نقطۂ نظر آگیا ہے۔ وہ بیک وقت محبوب کی کم نگاہی اور سماج کی نا واقفی دونوں کو محسوس کرتا ہے۔ دنیا صرف مغرب ہی میں چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ مشرق میں بھی چھوٹی ہوگئی ہے۔ سیاسی حالات نے زیادہ تلخی اور شدت حاصل کر لی ہے۔ برسوں کی غلامی کا بوجھ بعض اوقات اتنا گراں معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کی مست نگاہی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ اس وجہ سے اس دور کی غزل میں ایک بے معنی سے جوش و گرمی کی اور ایک اندرونی نہ ناکامی و مایوسی کی پائی جاتی ہے۔ غزل اور نظم کے درمیان خلیج بھی کم ہوگئی ہے مگر پھر بھی اشارے اور کنایے غزل میں اور صاف صاف باتیں نظم میں بیان ہونے لگی ہیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوا ہے۔

غزل کے میدان میں جو تجربے اس زمانے میں کیے گئے ہیں ان کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تجربے غزل کے لیے بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی کوشش تو وہ ہے جو حالی کے وقت سے شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے غزل کی

زبان کو آسان، عام فہم اور بول چال سے قریب لانے کے لیے بہت سے اشخاص نے کوشش کی ہے۔ اس سادگی میں اور میر و درد کے زمانے کی سادگی میں باوجود تھوڑی سی قدر مشترک کے فرق بھی ہے چنانچہ آزاد، آرزو، اثر، حفیظ، اختر وغیرہ کے یہاں جو رجحان ہے وہ خود رو نہیں، ایک بہت بڑی ادبی تحریک کا نتیجہ ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہ سکا۔ غزل میں مسلسل مضمون نظم کرنے کا خیال نیا نہیں مگر شاید کسی شاعر نے اتنی پابندی اور استقلال سے اسے نباہنے کی کوشش کی ہو جتنی جوش نے کی ہے۔ مسلسل مضمون حسرت کے یہاں بہت ملتے ہیں اور میر و غالب کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں مگر جوش کا تتبع عام طور پر نہیں کیا گیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلسل غزل، غزل نہیں رہتی نظم بن جاتی ہے اور جوش کے ہاں رجز خوانی زیادہ ہے جو غزل کے لیے اتنی موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین کو وسیع کر کے اس میں ایک طرف حیاتی اور دوسری طرف آفاقی رنگ پیدا کرنا بھی لوگوں نے سیکھا ہے اگرچہ یہ روش ابھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کی تقلید نے لکھنؤ اور دہلی کو لفظی اور تعقید سے نجات دلائی اور عام طور پر فرسودہ روش سے پرہیز سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے شاعر فرسودہ زبان برتنے کے بجائے خود زبان ایجاد کرتے ہیں یعنی نئے الفاظ وضع استعمال کرتے ہیں ان میں ان کا جذبہ زیادہ شریک ہوتا ہے وہ ایسے خام نہیں کہ اپنی انفرادیت کھو چکے ہوں۔ اس دور کا تفلسف بھی غالب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہ خشک فلسفہ نظم کرنے اور علمیت بگھارنے کے شوقین رہے مگر اب اس کی وجہ سے غزل میں محض جذبہ کے بجائے فکر کا جزو بھی آ گیا ہے جو قدیم رنگ پر چلنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنی غزلوں میں نیا نکھار اور نئی شگفتگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غزلوں کا سرمایہ کسی طرح دوسرے دوروں سے کم اہم نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

(نئے اور پرانے چراغ)

احتشام حسین

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنف سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھی لرزاں ملتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف مضبوط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس دائرے کو توڑتے ہوئے معدوم ہونے ہیں اور اپنے حدود ہی کے اندر رہ کر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا گداز اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اثر ان کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اس کے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایام جاہلیت کی یادگار سمجھ کر اس دور تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، سننا نہ چاہتے ہوں، سن کر اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں مگر ہمارے ارادوں کا قلعہ توڑ کر کوئی میر، کوئی غالب، کوئی آتش، کوئی حسرت، کوئی جگر، کوئی فانی، کوئی فراق ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے، زندگی کی کوئی گہری حقیقت، غم، درد اور محبت کی کوئی پریشان کرنے والا خیال، ان سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! ان کی آواز پیچھا کرتی ہے اور اشعار دہرانے پڑتے

ہیں کیونکہ وہ بت حقیقی ہیں ان سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اب بھی انھیں پناہ دیتا ہے اور غالباً دیتا رہے گا۔ پھر غور کیجیے تو غزل صرف دل کی شاعری نہیں ہے اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس نئے تصور سے چاہے تغزل اور (LYRICISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔

(تنقیدی جائزے)

عبادت بریلوی[1]

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ارتقائی صلاحیتیں تو موجود ہیں لیکن ان ارتقائی صلاحیتوں کا احساس ذرا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری اصناف میں تو یہ کیفیت خود نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا عام انداز خارجیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ توضیح و تفصیل ان کے مزاج کا جزو بن جاتی ہے۔ بات کو براہ راست کہنا ان کا شعار ہوتا ہے لیکن غزل کا انداز اس سے ذرا مختلف ہے۔ غزل میں زندگی کے ہر خارجی پہلو کا اظہار داخلیت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بات اس میں اگرچہ عمومی اور آفاقی انداز میں کہی جاتی ہے لیکن توضیح و تفصیل کی جگہ اس میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان اشاروں اور کنایوں کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ یہی عناصر غزل کے اہم اجزا ہیں اور انھی کو غزل کی روایات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غزل اپنی ان روایات کو بہت عزیز رکھتی ہے اور ان کو چھوڑنے کا خیال بھی اسے گراں گزرتا ہے۔ اس کی ارتقائی کیفیت پر انھی روایات کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس کی پردہ دری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو غزل کے مزاج سے صحیح واقفیت رکھتا ہے۔

زندگی کی ہر تبدیلی اور تبدیلی کے زیر اثر ارتقائی کیفیت غزل میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خارجی طور پر زندگی میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے اس کے اثرات غزل میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ اس بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی بدل دیتی ہے۔ یہ تغیر غزل میں خارجی طور پر کم نمایاں ہوتا ہے لیکن در پردہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس کی دنیا بدلتی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غزل اپنی ظاہری ہیئت کو بہت کم بدلتی ہے لیکن اس میں پیش کیے ہوئے خیالات و نظریات باوجود اظہار و بیان کی یک رنگی کے اپنے اندر رنگا رنگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لیے زندگی کی ارتقائی کیفیت اس میں جگہ جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں اتنے متنوع موضوعات نظر نہ آتے اس میں خیالات کی اتنی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ اس میں سموئے ہوئے افکار میں اس درجہ بوقلمونی نہ ہوتی۔ غزل کی بڑائی اسی تنوع اور رنگا رنگی میں ہے۔ اسی کے سہارے اس میں وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے لیکن صرف اس عشق کی ترجمانی ہی میں اس کی بڑائی

---

[1] انھوں نے ایک کتاب بھی "غزل اور مطالعۂ غزل" کے نام سے لکھی ہے۔

نہیں ہے۔ اس کی بڑائی تو اس میں ہے کہ اس نے عشق کی متنوع اور مختلف کیفیات کی ترجمانی کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں عشق کے جو تصورات رہے ہیں ان سب کی تفصیل غزل میں موجود ہے نہ صرف یہ بلکہ ایک ہی دور کے مختلف تصوراتِ عشق کی زندگی سے بھرپور تصویریں جس طرح غزل میں ملتی ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ پھر زمانے کے انقلابوں سے جس طرح ان کیفیات میں تغیر ہوا ہے۔ غزل نے اس کی عکاسی بھی کی ہے اور غزل نے صرف اپنے آپ کو اسی حد تک محدود نہیں کیا ہے۔ وہ اس حصار سے باہر بھی نکلی ہے جب زندگی نے ماورائی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو اہمیت دی ہے تو اس نے بھی ان کو اپنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی ایک مستقل رجحان کی صورت میں نظر نہ آتی۔ تصوف اور اس کے مسائل کو غزل نے بڑی خوبی سے اپنایا اور تصوف نے اس کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی۔ زندگی کے نئے نئے مسائل کے لئے غزل کے دروازے کھول دیئے اور یوں ہر بات غزل کا موضوع بننے لگی۔ تصوف کے توسط ہی سے حیات و کائنات کے بے شمار مسائل کی ترجمانی کا رجحان اس میں عام ہوا اور اس طرح اس میں اپنے دامن کو وسیع کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ غزل میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی جو اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتی ہے اس میں اسی صورتِ حال کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔

ولی اور میر سے لے کر حسرت اور فراق تک اردو غزل اسی ارتقائی کیفیت کی داستان نظر آتی ہے اس میں ہماری تاریخ کا تجزیہ بھی موجود ہے۔ سماجی حالات کی بدلتی ہوئی کیفیات بھی موجود ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تصورات کی حقیقت بھی موجود ہے لیکن ان سب پر "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

"ماہ نو" فروری ۱۹۵۳ء

وقار عظیم

کیا غزل میں اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ ہر آن آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکے اور کیا اس کے مزاج میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے؟

اس سوال کا ایک بالکل غیر منطقی جواب تو یہ ہے کہ اردو غزل کی دو سو اڑھائی سو برس کی زندگی خود ایک ایسی شہادت ہے جس سے غزل کی ارتقائی صلاحیتوں کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ ولی سے لے کر حسرت اور جگر بلکہ حفیظ جوش، بارپوری اور فیض تک زمانہ کے ان گنت اونچ نیچ اور انقلاب کے ساتھ غزل کو جذب و سلوک کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنی پڑیں لیکن ہر منزل میں غزل نے اپنی انفرادیت اور امتیازی شان برقرار رکھی اور گردوپیش کی سیاسی، سماجی اور ذہنی فضا کو اپنے اندر سمو کر برابر آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی لیکن اس طرح کہ اپنی آن بان میں سر مو فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ زمانہ کچھ سے کچھ بنا لیکن غزل غزل ہی رہی۔

زمانہ کے ان انقلابات کے علاوہ ادبی زندگی میں بھی انقلاب آئے اور کبھی کبھی تو ان انقلابات کا مقصد ہی یہ تھا کہ غزل کے

راج کو ختم کر کے کسی اور کو اس کا تخت و تاج سونپ دیا جائے۔ غزل کو زندگی کی ہر اچھی قدر کا دشمن گردانا گیا اور ملک، وطن، قوم اور انسانیت سب ہی کی منافی ہے کہ کر غزل کے خلاف سخت سے سخت محاذ قائم کیے گئے۔ یہاں تک کہ غزل کے خلاف مہم لگانا ادبی اجتہاد اور انقلاب پسندی کی نشان ہو گیا لیکن غزل پر ان نعرہ بازیوں نے مطلق اثر نہ کیا۔ وہ ہر ایسے محاذ کو ریت کی دیوار سمجھ کر اس پر اور اس کے دیوانوں پر مسکرا دی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں استہزا بھی تھا اور تجربہ اعتماد بھی اور اس کا یہ استہزا اور یہ خود اعتمادی ہمارے اپنے زمانے میں اکثر اوقات حق بجانب ثابت ہوتی ہے کہ ادبی زندگی میں شاید ہی کبھی اور ملت اتنی بات ثابت ہوئی ہو۔ ہماری زندگی نے پچھلے پانچ چھ برس میں ایک ایسا انقلاب دیکھا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی لیکن اس [illegible] تخریب دور سے گذر کر بھی غزل نے اپنی انفرادیت کو برقرار اور قائم رکھا ہے —— غزل کی دنیا اب بھی اچھے غزل گویوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کے آسمان پر مسلسل وقفوں کے ساتھ نئے نئے ستارے روشن ہو کر فضا کو منور بنانے کے کام میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غزل اپنی دو صدی کی روایت کے تسلسل کے باوجود نئے زمانہ کی ضرورتوں اور نئے مذاق اور مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آ رہی ہے۔ اس میں زندگی کے دوام کی علامتیں زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت ایک طرف ہے ایسی شہادت جسے ہم نے غیر منطقی شہادت کہا تھا لیکن عدم منطقیت کے پیچھے ایک بہت بڑی منطق بھی ہے۔ وہ منطق غزل کی ان خصوصیتوں سے وابستہ ہے جو بہر حال زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد رہ کر اس کا جزوِ لازم ہیں۔ غزل میں فن اور ہیئت کے اعتبار سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو اسے ہر زمانہ کی چیز بناتی ہیں اور جن کی بنا پر اس میں ایسی لچک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات، ہر طرح کے ماحول اور ہر طرح کی فضا کو اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے اور اس کی اثر انگیزی کسی ایک خاص طبقہ کا مزاج اور رجحان رکھنے والوں کے لیے مخصوص یا کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہیں ہوتی۔

فن کے اعتبار سے سب سے پہلی چیز غزل کا یہ بیان کا ایجاز ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے غزل کے علاوہ نثر اور نظم کی ہر صنف محروم ہے۔ غزل کے ایک شعر میں زندگی کی بڑی سے بڑی حقیقت اور دقیق سے دقیق نزاکت کو انتہائی حسن، لطافت اور اثر کے ساتھ بیان کر دینے کی یہ قدرت اسے مقبولیت کا وہ شرف بخشتی ہے جو کسی اور صنف کو کسی زمانہ میں میسر نہیں آیا۔

ایجاز کی اس قابلِ رشک صفت کے علاوہ ایمائیت اور رمزیت دوسری خصوصیت ہے جسے غزل کی روایت نے اپنا جزوِ خاص بنایا ہے۔ غزل اس وقت تک غزل ہی نہیں بنتی جب تک وہ اس رمزیت اور ایمائیت کو اپنا نہ بنا لے۔ اس کا یہ رمزی اور ایمائی حسن اسے تصور آفرینی اور تاثر انگیزی کی دوسری قابلِ رشک خصوصیت بخشتا ہے اور شاعر اپنی بات کہنے کے لیے جو اشارے، کنایے، تشبیہیں، استعارے اور حسنِ بیان کے دوسرے وسیلے کام میں لاتا ہے۔ ان میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ہر دل کو ان میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی اور اپنی کسک محسوس ہوتی ہے۔ صوفی، فلسفی، رند، عاشق، مصلح اور سیاست داں سب ایک ہی اشارے سے اپنے اپنے دل کی بات پا لیتے ہیں۔ وہی شاعر جو فطرت کا ہمراز و پرستار بن کر یہ کہتا ہے کہ ؎

آشنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
جوشؔ

یا ؎

فطرت پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
جگر

جب عاشق، فلسفی، سیاست داں اور مفکر کا ترجمان بنتا ہے تو گل اور پھول کے اشاروں میں ان کے دل کی بات اس طرح ادا کرتا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
میر

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
اکبر

غزل اپنے اس ایمائی انداز میں جو غزل کی فطرت ہے، زندگی میں بہت سے خارجی اور سارے داخلی پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔ جذبہ اور احساس کی نزاکت، ذہن اور نفس کی ہر خلش اور الجھن، سیاسی معاشرتی زندگی کی ہر کیفیت جو انسان کے دل میں گداز اور تڑپ پیدا کرتی، جگر کو درد آشنا کرتی اور آنکھوں سے اشکِ خونیں کا خراج وصول کرتی ہے۔ غزل کا موضوع ہے۔ اس کا ایک ایک شعر زندگی کی ساری وسعتوں کا حامل بھی ہے اور اس بات پر پوری طرح قادر بھی کہ ان ساری وسعتوں کو ہر سننے والے کے دل کی گہرائیوں میں جذب کر دے۔

غزل کی یہی خصوصیتیں ہیں جو اسے ہر دیوانہ اور فرزانہ کے دل کی ترجمانی اور رازداری کا منصب عطا کرتی ہیں۔ ہر فرد کو اپنا رونا، غزل کی مرضت اور ہر ایک کا رمز شناس ہیں کہ رموز کا احترام اس کی فطرت ہے۔ صرف غزل کے شعر سن اور پڑھ کر ہی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کے دل کی بات کہی گئی ہے اور صرف غزل ہی کے شعر پڑھ اور سن کر اسے یہ معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے زخموں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے اور کوئی نامعلوم قوت اس کے دل اور جگر کے چاکوں کو رفو کر رہی ہے۔

اور بھی سب کچھ ہے جس نے غزل کو یہ "انتقائی صلاحیت" بخشی ہے کہ وہ زندگی کے ہر دور میں، اس کی ہر رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے، نہ پیچھے رہتی ہے نہ تھکتی ہے اب تک اس نے ہمیں جو کچھ دکھایا ہے۔ اس کی بنا پر یہ حکم لگانا کچھ عجب نہیں کہ اس کی یہی صفت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

(ماہِ نو)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل میں وہ عناصر ایسے ہیں جن سے اب تک غزل کا ساتھ دیا ہے اور جو بڑی حد تک غزل کو بحیثیت ایک صنفِ شاعری زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرے اس داخلیت سے براہِ راست متعلق ایک خاص قسم کی اشاریت جسے اب غزل کی رمزیت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالی کے عہد سے اردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھا اور اگرچہ حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھی لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دلِ زندہ کی کہانی جس دن ختم کی سب کے دلوں کی دھڑکنیں اسی دن بند ہو گئیں، عشق اور محبت کے سوتے سوکھ گئے، حسن و رعنائی ابدی نیند سے ہم کنار ہو گئے اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعر کا کام بیواؤں کی شادی کرانا، یتیم خانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کانفرنس کے آغاز یا انجام پر انا و منسہ کا فرض ادا کرنا رہ گیا ہے۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں لیکن ان پر شاعری کی تہمت کیوں رکھیے۔ بہرحال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گزر گیا لیکن اس میں بھی غزل کا شعلہ بالکل بجھا نظر نہیں آتا۔ لکھنؤ میں آخر آخر تک عزیز، آرزو اور صفی سے لے کر باقی برِ عظیم میں حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے غزل کو اپنے خون سے سینچا اور سنوارا۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا داخلیت اور رمزیت کو میں جانِ تغزل سمجھتا ہوں اور غزل کی تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اردو غزل کے عہدِ زریں یعنی میر و مرزا کے دور کا جائزہ لیجیے۔ اس عہد کے خاص سیاسی ذہنی اور معاشرتی حالات پیشِ نظر رکھیے۔ معاشرہ میں ایک بے چینی، ایک کرب، ایک اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سیاسی انقلاب، درباری سازشوں اور معاشی بدحالی نے ایک بحران پیدا کر دیا تھا۔ اس میں بے اطمینانی سب سے نمایاں عنصر ہے۔ امرا کے دربار آئے دن بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ دلی کے تخت پر نام نہاد بادشاہ کٹھ پتلیوں کی طرح چڑھتے اترتے۔ تجار اور پیشہ ور مفلس اور ناداری کا شکار تھے تو پھر شاعروں کو کون پوچھتا۔ ان کی قدردانی رئیسوں کی مجلسوں اور شاعروں کی محفلوں تک محدود تھی۔ یہ نظام درہم برہم ہوا تو یہ بھی بے سر و سامان ہو گئے۔ قدرتی طور پر یہ ایک شدید قسم کے داخلی ردِ عمل کا شکار ہوتے ہوں گے اور یہ شدت غزل کے ان بے شمار مضامین سے ناپی جا سکتی ہے جو میر کی کلیات میں موجود ہیں۔ تباہی و بربادی، غارت گری، قیامت، ہنگامۂ قیامت، خون، آگ، برق و باراں، طوفان، موج، گرداب کے سارے مضامین اسی داخلی کرب و بے چینی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو شاعروں کی رگ و پے میں سما رہی تھی۔

اور اس کے بعد غزل کا ایک اور دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناسخ اور آتش کے زمانے کی لکھنوی غزل جو اپنے انداز اور آہنگ میں میر کی غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان غزلوں کو بعض ناقدین نے تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ بعض کو شبہ ہے کہ انھیں غزل کہنا بھی چاہیے یا نہیں کیونکہ ان میں محبوب کی وصف نگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال ناسخ، آتش اور ان کے بے شمار شاگردوں نے اصلاحِ زبان کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کا پورا احترام کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں کہ شاعری اگر شدتِ جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے تو ان حضرات کی شاعری کسی قسم کے جذبے سے یکسر محروم ہے۔ اگر اس زوال کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو ذہن فوراً اس پُرتکلف معاشرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو لکھنویت کا دوسرا نام ہے اور جو غزل کے علاوہ بھی رفتار، گفتار، دستار اور کردار میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہاں تکلف، احتیاط، رکھ رکھاؤ بلکہ تصنع جذبات کی شدت پر قابو پا لیتے ہیں اور جذبات امڈتے بھی ہیں

[illegible] رستوں اور وسیلوں کو تلاش کرتے ہیں جو اس خاص معاشرے نے ان کے لیے متعین قرار دیے ہیں۔ پھر یہ دور بھی ختم ہوتا ہے۔ مومن و غالب، آتش و داغ کی غزلیں دیکھیے۔ غزل اپنے اصلی رجحان کی طرف رجعت کرتی ہے۔ میر کی [illegible] کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ دہلوی شاعروں کا تو ذکر ہی کیا۔ میر کی روایت دلی کی روایت تھی۔ لکھنؤ میں عزیز اور ثاقب میر کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل پھر اپنے اصلی رنگ پر آ گئی۔ حسرت، اصغر، فانی اور جگر اس نشاۃ ثانیہ میں غزل کے استاد و زمام [illegible] لیکن اس نشاۃ الثانیہ کا شباب ۱۹۴۷ء سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اس سال جو سیاسی انقلاب ہوا اس نے معاشرہ کو بھی ایک نیا دستور اور ایک نیا انداز فکر بخشا۔ پاکستان و ہندوستان کو بڑی امیدوں اور بڑی جد و جہد سے آزادی نصیب ہوئی — وہ آزادی جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، بہت سی آرزوئیں تھیں جن کی شادابی اس آزادی پر [illegible] لیکن [illegible] پوری نہیں ہوئیں، بہت سی امیدیں ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر آبادی کا نقل مکان، ایسے سانحات ہیں جن سے شدید [illegible] ردعمل پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ عورتوں کی عصمت دری، بچوں کا ہولناک قتل، بوڑھوں کی بے کسی [illegible] کی موت، بھرے گھروں کا اجڑنا اور لہلہاتے کھیتوں کا چھوٹنا ایسے سانحات ہیں جو آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے [illegible] کو گزرے [illegible] مدت گزری ہے کہ سطح آب پر اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ شدت اور ہیجان جو جذبات میں پیدا ہوا تھا، باقی ہے اور اسی نے غزل کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غزل کا دوسرا پہلو اس کی رمزیت ہے۔ اس کا ایک سبب جملہ فنون لطیفہ کی لطافت پسندی یا استعارہ پسندی ہے۔ ہلکے ہلکے نقوش، دور سے آنے والی مدہم اور مبہم صدائیں ہمیشہ زیادہ کشش رکھتی ہیں۔ شاعری میں بے پردہ حیائی لطافت ہے اور جذبات جب انتہائی شدید اور ذاتی قسم کے ہوں تو اس پردہ داری کی اور بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں [illegible] بیان بیوی کے [illegible] اور ایک عورت کا عشق سماج کی نظر میں نہایت قبیح فعل ہو، لیکن جہاں دھڑکنے والے دل اور [illegible] عشق و عاشقی کا اظہار پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس پردہ داری کی مجبوری اتنی بڑھی ہے کہ بعض عاشقوں نے تو عورتوں سے عشق کرنے کے بجائے امردوں کو اپنا محبوب بنایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزل گو شعرا نے امرد پرستی محض [illegible] کی ہو لیکن اس کا بنیادی سبب [illegible] ہو سکتا ہے کہ جنسی تسکین کے صحت مند ذرائع مسدود ہونے کے باعث جنسی جذبے نے یہ بے راہ روی اختیار کی ہو۔

اس مسئلے سے ہٹ کر غزل کی اشاریت اور رمزیت دیکھیے۔ میر کا زمانہ سیاسی [illegible] انتشار کا تھا لیکن [illegible] کا بھی تھا۔ شخصی آزادی کا تصور یا تحریر و تقریر کی آزادی کے حقوق کے نعرے اس وقت تک بلند نہیں ہوئے تھے۔ پاسبان [illegible] محتسب [illegible] ہر وقت نگراں رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں ہمیشہ کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی ہے [illegible] قفس، صیاد، صبا، دام، نگہت، حلقۂ زنجیر، زندان یوسف اور اسی قسم کے مضامین آتے ہیں۔

اسی زمانے میں دلی پامال ہوئی اور نادری غارت گری نے دلی کا رہا سہا سہاگ لٹوا دیا۔ [illegible] کی ویرانی پر ہزاروں شاعروں نے نوحہ کیا ہے۔ اس نوحے میں چمن، خزاں، صرصر اور اسی قسم کے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ پھر دلی کی تباہی کے بعد ارباب علم و فضل لکھنؤ اور دوسرے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ وطن چھوٹتا ہے، نیا وطن قفس معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] کے پھیر دکر [illegible] جمع ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ سننے والا سنتا ہے اور اس کا دم گھٹتا ہے [illegible] مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتا اور

کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بھی رمزیت ہی اس کا سہارا بنتی ہے۔

اور آج ہم پھر اسی قسم کے حالات اور واقعات سے گزر رہے ہیں۔ سیاسی انقلاب کے بعد حالات اور واقعات ابھی مکمل پر نہیں آئے۔ فضا میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ یقین اور گمان میں کشمکش ہے، پرانی قدروں اور نئے تقاضوں میں تصادم ہے۔ نئے نئے عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تصور تشکیل پا رہا ہے۔ بعض لوگ بہت مایوس ہیں اور بعض ابھی تک بہتری کی امید میں زندہ ہیں۔ اس تمام صورتِ حالات سے جو جذباتی ردِ عمل کیا ہے وہ پھر غزل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آج جب میں ایسی غزلیں پڑھتا ہوں جو بے ساختہ ہو کر کہی گئی ہیں تو مجھے پہلے سے زیادہ غزل کی ہمہ گیری، اس کی وسعت اور ابدیت محسوس کرتا ہوں۔

"ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۲ء

سید باقر حسین

پرانی اور فرسودہ غزل کا دور ختم ہو چکا۔ اب کنگھی چوٹی، معاملہ بندی اور سستی جذباتیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسی غزل میں کسی ارتقاء کا امکان نہیں پیدا ہوتا۔

فرسودہ غزل گوئی کے بعد نظموں کا دور آیا۔ ہزاروں نظمیں کہی گئیں اور خوب خوب کہی گئیں۔ نظموں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کیسے خیال آسکتا تھا کہ غزل دوبارہ زندہ ہوگی لیکن ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ غزل ایک عشق و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح شعر و ادب میں بھی عمل اور ردِ عمل کا اصول کار فرما ہے۔ لوگ جب ایک چیز سے سیر ہو جاتے ہیں تو دوسری چیز کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نظموں کا دور پرانی غزل گوئی کے خلاف ردِ عمل تھا اور اب جدید غزل نظموں کے سیلاب کے خلاف ردِ عمل ہے۔ بہت لوگ ہیں جو غزل اور نظم کی خوبیوں کو پرکھنے کے بعد کوئی متوازن رائے قائم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل اور نظم محض صوری حیثیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے موضوع، ان کے کیف و کم اور ان کی اثر آفرینی میں اختلاف موجود ہے۔ اپنے اپنے مقام پر دونوں ضروری ہیں۔ بعض خیالات کے اظہار کے لیے نظم کا سانچہ ٹھیک ہے اور بعض کے لیے غزل کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں کی جدا جدا نوعیتوں کو ملحوظ رکھیں۔ اگر ہمارا یہ رویّہ ہو تو ہم نہ غزل سے سیر ہوں گے اور نہ نظم سے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی مقبولیت کا جدید دور کہاں تک باقی رہنے والا ہے اور آیا اس صنفِ کلام میں مزید ترقی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم غزل کی خصوصیتوں کا بغور جائزہ لیں تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ غزل کہاں تک بقا اور ارتقا کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک غزل کی خصوصیتیں چار ہیں:-

۱۔ تغزل
۲۔ صوت و آہنگ
۳۔ ایمائیت اور رمزیت
۴۔ اختصار اور جامعیت

تغزل کی صحیح تعریف تو میں جانتا نہیں البتہ میرے نزدیک غزل کی مخصوص زبان اور لب و لہجہ کو تغزل کہتے ہیں الفاظ اور ترکیبوں کا صحیح، خوبصورت، سبک اور مانوس ہونا تغزل میں شامل ہے۔ غزل کی یہ خصوصیت جذباتی شاعری کی جان ہے اور غزل تو ہے ہی جذباتی شاعری۔ یہ نہیں کہ غزل میں ذہنی آسودگی کا سامان نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غزل کا مضمون خواہ کچھ ہو اس کا تعلق دماغ کی بجائے دل سے ہوتی ہے۔ عام انسانی نفس میں جذبات کا تناسب ذہن کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج رہے گا اس وقت تک اسے تغزل کی ضرورت رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں جذبات ہوں گے وہاں تغزل بھی ہوگا۔ خواہ وہ ہماری غزل کی صورت میں ہو یا انگریزی کی سانیٹ کی شکل میں۔ اس لحاظ سے تغزل غزل کے ارتقا کا ضامن ہے۔

غزل کے صوت و آہنگ کا دارومدار اس کے وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مترنم الفاظ کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کم و بیش ہر صنف سخن میں ہوتی ہیں لیکن غزل اور دیگر اصناف سخن کے صوت و آہنگ میں فرق یہ ہے کہ غزل میں مترنم الفاظ کے استعمال کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے بر خلاف بیانیہ نظموں کے کہ جن میں رزم و بزم کی مختلف صورتیں زیادہ متنوع الفاظ کے استعمال کی متقاضی ہوتی ہیں۔ غزل کی اس خصوصیت سے بھی اس کی ارتقائی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ صوت و آہنگ کے مناسب استعمال سے جذبات کے تاروں کا خفیف سے خفیف ارتعاش بھی غزل کے اشعار میں "ریکارڈ" کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے جذبات کا تنوع اور ان کا کیف و کم ایسے ساز کا محتاج ہے جس کے پردوں پر ہر لَے کی تخلیق ہو سکے۔ ایسا ساز غزل کے سوا کسی اور صنف کلام میں نہیں مل سکتا۔ جب تک جذبات کی نزاکت کا احترام ہے، اس وقت تک غزل کی ضرورت بھی باقی رہے گی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جذبات کی سادگی کم ہوتی جا رہی ہے اور ان میں پیچیدگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ غزل کے صوت و آہنگ کی خصوصیت ان تغیرات کا ساتھ بخوبی دے سکتی ہے لہٰذا اس کے ارتقا کی ایک صورت یوں بھی نظر آتی ہے۔

غزل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی ایمائیت اور رمزیت ہے۔ یہ خصوصیت چند مخصوص علامات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ علامات وہی ہیں جو سطح بین لوگوں کے نزدیک غزل کی فرسودگی کا باعث ہیں یعنی گل و بلبل، قفس و آشیانہ وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علامتوں کے لفظی معنی لے لینا انتہا درجے کی بد مذاقی ہے۔ جدید غزل میں ان علامتوں کو نئے نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ علامت کو اگر محض علامت سمجھا جائے تو غزل کے وہ اشعار جن میں ایمائیت اور رمزیت ہے بے اندازہ پرمعنی ہو جائیں۔ ایسے اشعار کو فن کی مناسبت سے بے شمار نئے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ برمحل استعمال پر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ غزل کے اشعار کی یہ خصوصیت انہیں موجودہ سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی کے لیے نہایت موزوں اور کارآمد بنا دیتی ہے۔ ذیل کے شعر میں سے نو بہار اور [illegible] بہار کا ذکر لیکن دیکھیے کہ علامات کے استعمال نے اسے سیاسی شعور کا کس قدر کامیاب نمونہ بنا دیا ہے۔

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے — ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل

غزل کے ارتقا کے لیے اس کی محض یہ خصوصیت کافی ہے۔ غزل کی چوتھی خصوصیت اس کے اشعار کا اختصار اور

جامعیت ہے۔ غزل کے اشعار میں تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہانی کا نتیجہ ہوتا ہے کہانی نہیں ہوتی۔ تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے خود تجربہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کا ماحصل ہوتا ہے تاریخ نہیں ہوتی۔ آہ ہوتی ہے داستانِ غم نہیں ہوتی۔ غزل کے شعر میں قوموں کے عروج و زوال کی داستان صرف ایک مصرعے میں بیان کی جاتی ہے ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

انگریزی میں اگرچہ غزل نہیں ہوتی لیکن بعض اشعار میں تغزل ضرور ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH TELL OF SADDEST THOUGHT

یعنی ہے — ہمارے وہی نغمے ہیں سب سے شیریں — ہے جن میں بیاں سوزشِ اہلِ دل کا

غزل کی یہ خصوصیت بھی اس امر کی شاہد ہے کہ اس میں ارتقا کی بے شمار صلاحیتیں موجود ہیں۔

انسانی تجربوں اور تصورات کے بیان میں آفاقیت، تجرید اور ضرب المثلی کیفیت پیدا کرنا صرف غزل کی تکنیک ہی میں ممکن ہے میرے خیال میں اس تکنیک کی ضرورت ہمیشہ رہے گی بلکہ موجودہ زمانے کی عدیم الفرصتی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ تکنیک دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اختیار کر لی جائے۔ اگر ہماری غزلوں کے کامیاب تجربے غیر زبانوں میں ہونے لگیں تو عجب نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی ہونے لگے۔

(ماہِ نو، فروری ۱۹۵۳ء)

فیض احمد فیض

تو اور نزار آتشِ تسنیم کا گل — ہیں اور رہا اندیشہ ہائے دور و دراز

یوں تو اس شعر میں بھی لفظی رعایتیں موجود ہیں جنھیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان لفظی رعایتوں پر نہیں ہے۔ اس کا انحصار اس دھندلی سی جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل کر پیدا کرتے ہیں۔ اسی فضا میں تصورات کے کئی گوشے کبھی پڑھتے پڑھتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے کئی نئے رنگ کئی نقشے کئی زاویے دیر سے دھیرے دھیرے سامنے آتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی چنچل رنگینی اور شگفتگی اور دوسری طرف معانی کی وسیع اشاریت۔ یوں تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا اختصار اور جامعیت اس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ ہر چند متعدد ہستیوں سے حسرت موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین، اپنا اپنا طرزِ اظہار ہے لیکن اس بوقلمونی کے باوجود جذبہ اعظم یہ تیرہ و سرِ فنائیت ان سب کے کلام کا خاصہ ہے اور اسی خاصیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لیا ہے۔

(سرآغاز 'نیم کا گل')

سردار جعفری

بعض ترقی پسندوں نے غزل کے غیر جمہوری، تاریک اندیش، فراری، کھوکھلے اور سوقیانہ مضامین کی مخالفت کے بجائے غزل کی صنف ہی کو غیر جمہوری اور بے کار قرار دے دیا۔ اس رجحان کی امامت شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے کی جو

خود حالی کی طرح بڑی اچھی غزلیں لکھ چکے تھے اور غزل کی بہترین روایات کو اپنی شاعری میں سمو چکے تھے۔ حضرت جگر مراد آبادی نے جب
۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں اپنی ایک غزل میں ترقی پسندوں کے خلوص اور نیت پر حملہ کیا اور انھیں قوم و وطن کا بُت پرست قرار دیا اور
اس کے بعد مرزا یگانہ چنگیزی نے غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ترقی پسند ادیبوں اور ادب
کے لیے انتہائی غیر ادبی زبان استعمال کی تو غزل کی مخالفت کے رجحان نے اور زور پکڑا لیکن اس سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی
طور سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں تھی۔ غزل موضوعِ بحث رہی اور نیا
ادب اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل
پر بحث بھی ہوتی رہی اور ترقی پسند غزل گوئی بھی جاری تھی اور یہ واضح ہے کہ اس زمانے میں بہترین غزلیں صرف جگر اور حسرت نے
نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں نے بھی کہی ہیں جن میں فراق گورکھپوری، مجاز، فیض، جذبی، [illegible] وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی
یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی مخالفت سب سے پہلے حالی نے شروع کی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ حالی کا نظریہ کہاں تک صحیح یا غلط
تھا، ترقی پسند ادب کے معترضین حالی کے لیے تاویلیں تلاش کرتے ہیں اور ترقی پسندوں پر غلط الزامات لگاتے ہیں ......
ترقی پسند تحریک نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اب انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور
سماجی احساسات آ رہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں
کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے اور دوسری طرف نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے جو روزمرہ زندگی سے حاصل کی گئی۔ اس کوشش
میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، جذبی، حفیظ ہوشیارپوری اور مجروح سلطانپوری ہی نہیں جگر مراد آبادی بھی شریک ہیں۔

(ترقی پسند ادب)

---

(۲)

شمس الدین ولی

"از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

(نکات الشعرا)

"شب فکر سامنے داشت و دیوان دلچسپ رنگینے طرح نمودہ۔"

(گلشن گفتار)

"کمان پر زور سخن را بہ نیروئے شہرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہ ہدف معنی رسیدہ۔" (تذکرہ گردیزی)

"تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنائے ریختہ را چنان مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزود۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"در ریختہ قصے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آں وقت از راہِ [illegible] شعر ریختہ موزوں می نمودند۔"

(مخزن نکات)

"شاعر والا اقتدار و سخن سنج شیریں گفتار است۔ رتبۂ سخن [illegible] باوج کمال رسیدہ" (چمنستان شعرا)

"سر شعرائے دکھن مشہور و ممتاز است اول کسے است کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدون گشتہ۔" (گلزار ابراہیم)

"قطع نظر از زبان دکنی شورش مرتبۂ اعلیٰ شاعری بخشش بدرجۂ علیائے سخنوری است۔" (مجموعۂ نغز)

"ان کی انشا پردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانہ نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔" (آب حیات)

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبول عام حاصل ہو جانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔" (گل رعنا)

میر سراج الدین سراج دکنی

"......سخن او خالی از مزا نیست۔" (نکات الشعرا)

"......طبع روشنش شمع بزم سخن۔" (تذکرہ گردیزی)

"......روشن طبع معلوم می شود۔" (تذکرہ شعرائے اردو)

"......انچہ از سلیقۂ شعرش معلوم می شود۔ بسیار بہ رستی حرف می زند۔" (مخزن نکات)

"......ما از سخنش بوئے عشق و محبت استشمام می نمائیم۔" (مجموعۂ نغز)

"با مجموعۂ غزلے کہ شعرے از آں ایراد کردہ می شود از شہرت تمام دارد۔" (گلشن بے خار)

"ولی کے بعد دکن میں اس پائے کا کوئی شاعر نہیں ہوا۔"

(گلِ رعنا)

میاں نجم الدین شاہ مبارک آبرو

"...... شاعرِ نادرہ گوئے ریختہ می گوید کہ طرح شعر درست عرضِ مستغنی در وقتِ خود بود ......" (نکات الشعرا)

"...... اشعارش در تمام ممالک محروسہ مشہور و معروف خصوص در دار الخلافہ شاہجہان آباد مستثنائے وقت است۔"

(گلشنِ گفتار)

"...... خدا کہ معنی تلاشی را بر طاقِ بلند گزاشتہ و انفتاح مملکت سخن رایت شاہی افراختہ ......"

(تذکرۂ گردیزی)

"شاعرِ خوش گو در وقتِ خود بود۔"

(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"...... بالجملہ شعر ریختہ بوضع خود بسیار مربوط می گفت ......"

(مخزنِ نکات)

"...... ترکیب میں بیشتر اشعار انھوں نے ایہام کے کہے ہیں یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں کہ جن کے دو معنی ہیں اگرچہ با معنی یا لا یعنی ......" (گلشنِ ہند)

"...... شعر را بطوریکہ در آں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی گفتہ ......" (تذکرۂ ہندی)

"...... در طرزِ گفتار حسبِ رواج آں وقت بیش تر بہ ایہام گوئی صرفِ ہمت می نمود ......" (مجموعۂ نغز)

"...... از زبان آوران ناظم طبقۂ پیشین است بہ صنعتِ ایہام مائل بود ......" (گلشنِ بے خار)

"...... بیشتر صنعتِ ایہام میں شعر کہتے تھے۔"

(طبقاتِ شعرا)

"...... اپنے زمانہ میں مسلّم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے اور صاحب ایجاد نظم اُردو کے شمار ہوتے تھے۔"

(آبِ حیات)

"طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی۔ اس زمانے کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام ان کے کلام میں الجھا ہوا ہے مگر محاورے کی چاشنی نے اس کو بامزا کر دیا ہے۔" (گلِ رعنا)

ظہور الدین شاہ حاتم

"...... مرد بیست جاہل متمکن و مقطع و منبع و دنیا شناس عنا ندارد و ریاضت نمی شود کہ این رنگ کہن بسبب شاعری است کہ بجز من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں است۔ خوب است مارا با اینہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد ...... با من ہم آشنائے بیگانہ است۔" (نکات الشعرا)

"...... مرد صاحبِ ہمت و طبیعتِ عالی دارد و بخل در دادنِ شعر ہرگز نہ کردہ و در این امر کہ فی الحقیقت سخن در بشناسد و درست گوئی از حاتم بردہ صرفہ ندارد ......"

(گلشنِ گفتار)

"...... طبع صیدِ نقش نقدِ قلب سخن را نقاد۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"...... کلیاتش ضخیم است و ابیات دیوانش قریب چہار ہزار بیت از نظر گذشتہ شعر خوب جستہ جستہ می بر آید۔"

(مخزنِ نکات)

"...... صاحبِ کمال و پسندیدۂ افعال عالی فطرت و بلند ہمت معاصر میاں آبرو، دو دیوان ترتیب دادہ یکے بزبانِ قدیم بطور ایہام و دوم بہ زبانِ حال ادا نیہ شہرۂ اشعارش بسیار است اکثر غزل ہائے او را نغمہ سرایانِ ہندی می خوانند۔"

(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"...... شاعر خوش بیان تھا۔ صاحبِ دیوان
تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خرچہ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور
ناظرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع سخن طرزِ ناظرین اور طرزِ ایہام"
(گلشنِ ہند)

"...... نغمہ سنجان حال ملیح و شریف اور
استاد مسلم الثبوت می دانند" (تذکرہ ہندی)

"...... شاعر ستودہ بالکین از طبقۂ رہ یعنی....."
(مجموعۂ نغز)

"...... اوائل حال فکرش مقصور و بہ تتبع قدما
مانند ولی و غیرآں بود، چوں طرزِ متاخرین طرازِ جیب و داماں شہرت
گشت، دستے نیز دست بداماں ایشاں زدہ بناے دیوانِ ثانی
بریں طریقہ نہاد" (گلشنِ بے خار)

"...... ان سے ایک دیوان بہ طرزِ ولی اور دوسرا
بطرز سودا موسوم بہ دیوان زادہ یادگار ہے......"
(سخن شعراء)

"مضمون ان کے صاف عاشقانہ عارفانہ ہیں شعر
آپس کی باتیں اور زبان شستہ و رفتہ ہے۔" (آبِ حیات)

"شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا۔ مشقِ سخن
کہتے کہتے استاد بن گئے۔" (گلِ رعنا)

اشرف علی خاں فغاں

"بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا، شعرِ ریختہ را بہ خوبی
می گوید" (نکات الشعراء)

"وضع ظریفانہ دارد۔ بمقتضائے مرابطت و محاباتی
باریاب محفل گرم می جوشد و سرِ پشم اختلاط می نماید"
(تذکرۂ گردیزی)

"خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود با ہرکس خوش طبعی
داشت، شاعر مربوط بطرز خود لطائف و ظرائف او مشہور است"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"سلیقۂ سخن سنجی درست دارد" (مخزن نکات)

"نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے"
(گلشنِ ہند)

"شعر را بہ صفائی تمام می گوید" (تذکرہ ہندی)

"شورش پختگی تمام دارد" (مجموعۂ نغز)

"اگرچہ فغاں کی زبان اسی زمانے کی زبان ہے مگر پھر بھی
کے اعتبار سے نہایت بااصل اور برجستہ ہے اور الفاظ کی
بندش ان کی مشقِ سخن پر گواہی دیتی ہے" (آبِ حیات)

"فغاں شعر و سخن ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور
لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے" (گلِ رعنا)

میر تقی میر

"فقیر میر اشعارش خوردہ و چشمۂ آب دارد حقا کہ در
تلاشِ معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را برمنے کار آوردہ"
(تذکرۂ گردیزی)

"از استادان صاحب قدرت است طرزش
ما با طرز شفائی" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان ان سے ان کے
ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی
ماہر ہے۔ میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت
خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ
ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ اقسامِ نظم میں یہ
صدر نشینِ بارگاہِ سخن دانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نگار رکھتا ہے لیکن
حق تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"استادیٔ ریختہ بر وے مسلّم است۔ ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را درین فن مستثنیٰ می دانند و الحق کہ چنیں است۔"

(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے است بے نظیر و سخن سنجے است خوش تقریر ...... میر علیم شیریں بیانی، دبیر قلم و عذب البیانی طرز گفتارش بے بدل اند از اشعارش ضرب المثل۔"

(مجموعۂ نغز)

"ما سیناور غزل سرائی و مثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید۔ پست و بلند کہ در کلامش یعنی رطب و یابس کہ در ابیاتش بنگری، نظر نکنی و از نظرش بیفگنی کہ گفتہ اند۔ فرد

شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست

در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست!

(گلشن بے خار)

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔"

(آب حیات)

"میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔"

(گل رعنا)

مرزا محمد رفیع سودا

"مرد سورا مزاج و کم سخن ...... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است، ہر شعرش طرف لطف بسند رسند، در تحسین بندی الفاظش گل معنی و مستند رسند۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ و پیش گو رعالیش طبع عالی ترسندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔"

(نکات الشعراء)

"حقا کہ رتبۂ شعرش عالی است و سخن دردمندانہ اش عالی۔ امروز رسیدہ ہی گفت و گو سے سبقت از اقران و امثال خود می رباید و سادہ معنی و رنگین خیالی می ورزد۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"در زندگی سخن و بستۂ ذات اوست۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو)

"در ریختہ زہمت کاہ معنی بر روئے وے کشادہ است کہ در مصرع کلک از رش شہرت را آمادۂ اشعار رنگین و قصاید متین دارد۔"

(مخزن نکات)

"نظم ریختہ کہ طبع معنی آفریں پر اس کے گھمنڈ اور ناز۔"

(گلشن ہند)

"در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ اگر در مثال بندی اشعار غزل صائب قتش گویم بجا ست و اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدۂ خاقانی گویم روا۔ در نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست۔"

(تذکرۂ ہندی)

"شعر خوبی شعارش کیفیتے دارد کہ سامع نکتہ پرداز صاحب فراست مانند طبع کلام صحبت انتظامش حلاوتے مادر کہ ذائقہ طبع سخن سنج صاحب گفتار شاید۔"

(مجموعۂ نغز)

"بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرف نیست۔ بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل۔"

(گلشن بے خار)

"ان کا ریختہ وقت کی زبان سے قطع نظر کر کے باعتبار جوہر کلام سراپا مرصع ہے۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور دلپسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اردو میں نہیں آئی تھیں۔ زمینیں

سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل، مگر جس پہلو سے انہیں
بٹھا دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے
تو معلوم ہو۔"
(آبِ حیات)

"طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی۔ کثرتِ مشق نے
اس میں جلا دے دی تھی۔ استادی کی زندگی ہی میں ان کی استادی
کو خاص و عام نے مان لیا تھا اور ان کی غزلیں گھر گھر ہر ایک
کی زبان پر چڑھ گئیں۔"
(گلِ رعنا)

خواجہ میر درد

"از شعرائے ممتاز زمانہ است و در سخن گوئی یگانہ
بے اغراق طبع بلندش رسا است و فکرِ دل پسندش والا۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلامِ حافظ سراپا
انتخاب۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"ابیاتِ دیوانش قریب ہفت صد شعر از نظر گذشتہ
جگر لب لباب و عالی انتخاب است۔" (مخزنِ نکات)

"اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا
درد و اثر ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"شعر بلندش از بس شہرت تام مشہور ہر دیار۔"
(تذکرۂ ہندی)

"دیوانے مختصر بر مثابہ چشمۂ آبِ حیات۔ ریختہ
از طبعِ وقاد ایشاں ریختہ۔ در بحرِ سخن بدرجۂ اعلیٰ فصاحت و مرتبۂ اقصیٰ
بلاغت است و با ایں ہمہ شاعری کہ ایں مرتبہ آں جمیع پر سار رگیتی
است۔"
(مجموعۂ نغز)

"فکرش صحیح و نطقش فصیح گفتارش از رکاکت ما خلا
پاک و در رجب گل ہائے خیالش گل ہائے چمن ہم از خس و خاشاک
دیوانش از نظر گذشت۔ از اشعار پر کم خالی است و اکثر ابیات
با علو معانی و سمو مضامین دلکش و عالی۔" (گلشنِ بے خار)

"خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر، نو شعر کی
ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں
جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے
تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان
آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا اردو میں آج تک
کسی سے نہیں ہوا۔"
(آبِ حیات)

"قصیدے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ اس واسطے
کہ جس مرتبے کے وہ آدمی تھے اس کو ہجو سے کیا نسبت۔ ان کا
دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوانِ حافظ کے سراپا انتخاب ہے،
تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و مرزا
کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔" (گلِ رعنا)

مظہر جانِ جاناں

"دیوانِ مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مولف آمدہ است
از سلیم و کلیم پائے کم ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبہ است
لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز می شود۔"
(نکات الشعراء)

"اشعار فارسی و ہندی او از بلادِ ہندوستان تا دکن
زبان زدِ عالم اظہر من الشمس است۔" (گلشنِ گفتار)

"شعر فارسی اش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش
نہایت عذوبت۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"میرزا جامعِ فقر و فضیلت و سخن گستری است۔"
(چمنستانِ شعرا)

"مشہور سخنوروں میں ولی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت
خوش بیان اور انداز گفتگو میں نادرہ زبان تھے۔"
(گلشنِ ہند)

"در عہد یا ایہام گویاں اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست۔"
(تذکرۂ مصحفی)

"مخفی کلام وکلامِ دررتوصیفش پایانے ندارد۔"
(مجموعۂ نغز)

"در فکر سخن فارسی بسیاری کرد ہر چند اہلِ سخن را در زبانِ ایشاں حرف است اما عاقا بعض خیالات بغایت پسندیدہ و مطلوب و مقبول دارد۔ وقتی ابیات ریختہ ہم می گفت۔"
(گلشنِ بے خار)

"زبان کی اصلاح اور انداز سخن اور طرز کے ایجاد نے انھیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا اور میر کو۔"
(آبِ حیات)

"شعر و سخن سے ان کو خداداد مناسبت تھی۔ اُردو میں پورا دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں۔ جو سودا اور میر کی زبان ہے وہی ان کی ہے۔"
(گلِ رعنا)

سید محمد میر سوز

"در عہدِ خود از جملہ اہلِ ہند ممتاز۔"
(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"سید عالی نسب اور فنِ سخنوری میں استاد وانہوں نے ابتدا کے بادشاہ اور صورتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔"
(گلشنِ ہند)

"بطرزِ خود استاد است۔" (تذکرۂ ہند)

"در ریختہ گوئی طرزِ خاص وارد تتبع طرزِ گفتارش اگرچہ اکثرے از مشتاقان ایں فن گرائیدہ اما کمتر کسے سخن بہ اندازِ وے رسانیدہ۔"
(مجموعۂ نغز)

"کلامش از جادۂ مستقیم برکران۔" (گلشنِ بے خار)

"میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے تو حقیقت میں غزل کی جان ہے۔ چنانچہ غزلیں خوب ہی کہتے تھے۔ ان کی انشا پردازی کا چمن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے۔ اس خوش نمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کھڑا لہلہا رہا ہے اور سبز سبز پتیوں سے اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔ جو اہلِ نظر کہ خداداد ذوق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایک شخص خداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔"
(آبِ حیات)

شیخ قیام الدین قائم

"شعرش پسندیدہ است وفکرش سنجیدہ۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"...... طرزش بطرزِ طالب آملی می ماند۔"
(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"در نظم ریختہ میں استادِ مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا یہ اسلوب نہیں ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"در ریختگی کلام وخوشی مدارج غزل مدد و قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ روش بدروشِ استادرا نیرود بلکہ در بعض مقام غلبہ میجوید۔"
(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے بود فصیح زبان، شیریں بیان، فصاحت آئین، بلاغت آگین، صاحب گفتار ہستوار، مالکِ اشعارِ آب دار، بلبلِ خوش نوا، عندلیبِ بوستاں۔"
(مجموعۂ نغز)

"شاعریست خوش گفتار و بہ پایہ موزونیت عالی و گرانمایہ۔"

(گلشن بے خار)

"ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔"

(گل رعنا)

انعام اللہ یقین

"زائد الفکر شعر فہمی معنی ندارد و شاید از ہمیں راہ مردمان گمان ناموزونیت در حق او داشتہ باشند چون بسیار اتفاق دارند کہ شعر او خالی از نقص نیست۔"

(نکات الشعراء)

"شاعر متین است۔" (گلشن گفتار)

"بسیار خیالش بر صید معنی بلند پرواز است و چاشنی اندیشہ اش بر طلب قافیہ سخن پر فشانی ممتاز بے اعراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ۔"

(تذکرہ گردیزی)

"....... اشعارش بسیار نمکین و موثر اند سخن او خالی از دردمندی نیست۔" (تذکرہ شعرائے اردو)

"شاعر صاحب طرز یگانہ و در وحید دہر است۔ بر اخلاق حمیدہ انصاف دارد و مصرع از زبان ہائے سحر طرازش برایں ہمہ لطف و خوبی می تراود کہ مہر در استماع دل عشاق قطرات خون شدہ از دیدہ فرو می چکد۔" (مخزن نکات)

"بالحاصل یقین یکتائے عصر و یگانہ زمانہ است۔"

(چمنستان شعراء)

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسید۔"

(تذکرہ ہندی)

"در فن نظم نکاتی مطلوب با دوست کلامش بی نمک است حلاوت دل خواہ دارد۔" (گلشن بے خار)

"۲۵ برس کے سن میں یقین کا کام تمام ہو گیا اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔"

(گل رعنا)

میر محمدی بیدار

"مصرعہا ریختہ درست موزوں میکند۔"

(نکات الشعراء)

"طبع دردمند داشت۔" (تذکرہ شعرائے اردو)

"نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا اور زبان دان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔" (گلشن ہند)

"زبانش بسیار شستہ و رفتہ۔"

(تذکرہ ہندی)

"در شعرش بسیار با کیفیت و پختگی و بہ نہایت حلاوت و دل بستگی است بندش الفاظ و استخوان بندی آں بدرجۂ اعلیٰ دارد و با ایں ہمہ نزاکت معانی بوجدانی نازک خیالاں خیلے مے سازد۔"

(مجموعۂ نغز)

"مدتہا بر سر مشق سخن بود و مہارتے شایاں بدست آوردہ۔"

(گلشن بے خار)

"میر و میرزا کے ہم عصر تھے جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنی طرز کلام کو علیحدہ کر لیا۔ ان کے اشعار دل آویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔"

(گل رعنا)

میر عبدالحی تاباں

"خوش فکر و خوب صورت، خوش خلق، پاکیزہ سیرت"

"مشوق عاشق مزاج تا حال در روزتہ شعرا ہیچ شاعر خوش فکر از کمن
بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود۔ زبان رنگینش پاکیزہ تر از
برگ گل گلستان سخن و نازک دماغ بلبل سمند رنگینی فکرش با
فلک پیما بہار طاق انسل بانسل است" (نکات الشعراء)

"جوانے بود خوب صورت و خوش بیت شمع محفل
جانہا و چراغ بزم دلہا" (تذکرۂ گردیزی)

"شاعر با مزہ و رنگین طبع بود" (تذکرہ شعرائے اردو)

"جوانے بود در نہایت حسن و جمال و صحبت یاراں
با وجود دیلی منشی مجنوں را آداب صحبت آموختے و ناکل انجمن آرائی
شمع وار مزاج ہر جگر سوختے۔ اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ داشت"

(مخزن نکات)

"مصاحبت ہمیشہ دل نازک خیالاں را صید می نمود"

(چمنستان شعرا)

"دیوان ریختہ اش مشہور است"

(تذکرۂ ہندی)

"بالجملہ اشعار آبدارش بیشتر بر زبان خاص و عام
جاری است و خالی از کیفیت رعنائی و عاری از چاشنی دل ربائی
نیست" (مجموعۂ نغز)

"ان کے اصل حال سے زبان ان کی نہایت صاف
و شستہ و شگفتہ ہے" (آب حیات)

سید محمد میر اثر

"مردے بود است موقر و صاحب سخنے است موثر
عالم و فاضل و رتبۂ قدرش بغایت بلند گوہر صدرش [illegible]

(تذکرہ شعرائے اردو)

"شعر ہندی و فارسی کم از برادر بزرگ نمی گوید"

(تذکرۂ ہندی)

"دیوان قلیل الحجم دارد ملاحظہ شد بعض خیالات ایشاں
بخصوص نے غایت دردمندانہ و دل پذیر و مطبوع واقع شدہ"

(گلشن بے خار)

"تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے
وہی ان کا بھی ہے" (گل رعنا)

رنگین

"خیالش بسیار خوش فکر بہ ہر چند چنداں بہرہ از
علم ندارد اما ذکاوت طبعش بہ صاحب علمان غالب چوں مزاجش
منتقیانہ افتادہ اکثر قطعات خوب خوب و غزل و [illegible]
بہ سلک نظم کشیدہ" (تذکرۂ ہندی)

"چند دیوان با اصناف سخن نظم کردہ و آں را بجلد
فراہم آوردہ نورتن نام کردہ چوں دو دیوان دیگر مبنی بر ہزل و ریختی
وغیرہ است کہ ایراد آں با ایں نفیر و نمی سازد بنا بر آں از دیوان
ریختہ و بختہ بہ ہفت نام ایں ابیات گزیدہ شد"

(گلشن بے خار)

"رنگینی ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ ہر رنگ میں
انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں" (گل رعنا)

مصحفی

"قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب، کلامش پختہ شاعرانہ"

(تذکرۂ شعرائے اردو)

"بندش نظم میں اس کے ایک صفائی و شیرینی ہے
اور معنی بندی میں اس کے بلندی و رنگینی" (گلشن ہند)

"ہر صنف متداولہ نظم و نثر نظر سے خوب دارد و
بہ دو زبان سخن سازی بر روئے کار می آرد"

(مجموعۂ نغز)

"ہر چند بتقاضائے شیوۂ بسیار گویان اکثر کلامش
بر کم پایہ و از معانی خالی است اما اکثر بے اشعار او در نہایت
رتبت عالی و مرتبت عالی است۔" (گلشن بے خار)

"ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت
نہیں کی۔ ان کے کلام میں کہیں میر کا انداز ہے، کہیں سودا کا انداز
کہیں سعدی کی سادگی، اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور راستی اپنے
پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے
بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔" (گل رعنا)

میر غلام حسن حسن

"افسانہ علم سے تو بجھتی معلوم ہیں۔ قصیدے کہ معانی
ہے، یہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے۔"
(گلشن ہند)

"چوں از اوائل عمر طبعش موزوں بود اکثر خود مشغول
بایں شغل خطیر میداشت و شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا کہ
در آں ایام ایشان از مستعدان زمان معدن دیار بعضی گزرانید
بعد از آں کہ ... مرزا رفیع شدہ زبان ریختہ چنانکہ بو [illegible] برآں
دریں دیار رواج یافت۔ بحکم قوت ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم شاہ
مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میر گذاشتہ
کلام خود در ترتیب پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ
در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد
ید بیضا نمودہ الحق کہ کار کار او است۔ قطع نظر از بلاغت شاعری
زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"
(تذکرۂ ہندی)

"طرز گفتارش بہ شاعر فصاحت افزود محمد میر سوز
مرحوم ماناست مختصر کلام شاعر فصیح زبان مذہب البیان است
دیوانے حاوی اقسام سخن دارد۔" (مجموعۂ نغز)

"سالم فطرت سلیم طبعت است و در اصناف سخن
فی الجملہ قدرتے داشت ... و قطع نظر از یا مزہ ہائے شاعری
بہ محاورہ پختہ بلکہ داد بلاغت دادہ۔" (گلشن بے خار)

"ان کے اشعار غزل کے اصول پر گلاب کے
پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ
میں ڈوبی ہوتی ہے۔ میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔"
(آب حیات)

"غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں
تو کمال ہے زمانہ تھے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔"
(گل رعنا)

شیخ قلندر بخش جرأت

"کلامش نمکین و بیانش شیرین و دیوانۂ فن شعر است
گر گاہے بے فکری مانند بسیار [illegible] ہند و گداز است۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"شاعر شیریں کلام ہے۔" (گلشن ہند)

"در شعر خود تلاش معانی بیگانہ بسیار می کند عیاں تمام
از کلامش شاد و مزاجش بطرف مسلسل گوئی و غزل و ریختی گفتن بیشتر
مائل است۔"
(تذکرۂ ہندی)

"بسبب بیر مشقی حسب رواج آں دیار آں چناں
اشعار آبدار از طبع گہر بارش تراوش میکند کہ مقدور فصحائے آنجا
نیست۔"
(مجموعۂ نغز)

"در سخن بعضا جنے کہ میان عاشق و معشوق می گزرد گوئی
طبعے رسا داشت۔" (گلشن بے خار)

"ان کی طرز انہی کی ایجاد ہے اور آج تک انہی
کے لیے خاص ہے۔ جیسی اس وقت مقبول خلائق تھی آج تک
ویسی ہی چلی آتی ہے خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور

خاوری لی جان ہے۔ سقط حسن و عشق کے معاملات ہیں۔۔۔ امر
بائی زعشق کے خیالات گویا اس میں شراب دو آتشہ کا سرور کا
کرتے ہیں۔" (آب حیات)

"دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہے۔"
(گل رعنا)

انشاء اللہ خاں انشا

"در مشق است اکثر طرز او بطرز میر سوز مے ماند۔"
(تذکرہ شعرائے اردو)

"دیوان ان کا زبان ریختہ میں مشہور ہے اور کلام ان کا
[illegible] اور خوش اسلوبی سے معمور۔" (گلشن ہند)

"از ابتدائے عمر بحکم موزونی طبع شعر در ہر سہ زبان
[illegible] و زور طبیعت [illegible] اما میلان طبع اش بطرف ریختہ بیشتر است"
(تذکرہ [illegible])

"میر موصوف شاعرے است زبردست و سخن سنج
ست قوی بانفہ" (مجموعہ نغز)

"ہیچ صنف را بطریقہ ساختہ شاعرانہ نگفتہ اما در
شوخی طبع و جودت ذہن او مخفی نیست۔" (گلشن بے خار)

"غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان
پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی
خوشنمائی تراشیں، دیکھنے کے قابل ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ
ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں اشعار با اصول ہو گئے
وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی
وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہ تھی
سبب یہ ہے کہ وہ بھی آخر ایک ذخیرہ وافر مضامین و الفاظ
کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا
کر لیتا تھا۔" (آب حیات)

"میرا تو یہ خیال ہے کہ سید انشا جیسا ذہین و ذکی
اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو سعادت علی خاں کے مزاج
میں دخور ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا اور اس کا دیوان
لطائف و ظرائف سے مالا مال ہونے کی بجائے ملک کے
سامنے آج ایک نیا نمونہ پیش کرتا۔" (گل رعنا)

نظیر اکبر آبادی

"در شاعرے است مرد بے مشق کہ با فضل [illegible]
قرآن حفظ [illegible]" (مجموعہ نغز)

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاریست
و نظر بآں ابیات او در شعرا نشاید شمرد۔" (گلشن بے خار)

نصیر

"فقیر [illegible] در شاہجہان آباد بود اکثر در مشاعرہ
می آمد۔ در بیان عالم نو مشقی در طبعش روانی و تیزی دریافت میشود
و حالا گویند کہ قوت شاعری بسیار پیدا کردہ۔"
(تذکرہ ہندی)

"در روانی طبعش شکے نیست۔"
(ریاض الفصحا)

"کلامش بے مغز معلوم می شود۔" (مجموعہ نغز)

"زمین ہائے سنگلاخ طرح میکند۔"
(گلشن بے خار)

"زبان شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب میں سودا کی بان
تھی اور گرمی و لذت اس میں خداداد تھی۔ انھیں اپنی تشبیہوں
اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعوے بجا تھا کی زمینیں
نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی
تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے تشبیہ

اور استعارہ کر لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے جسے
اکثر زبردست انشاپرداز ناپسند کرکے کم استعدادی کا نتیجہ
نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ یا استعارہ شاعرانہ نہیں بلکہ
ہے لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کلام سریع الفہم
کیونکر ہوتا اور ہم ایسی سنگلاخ زمینوں میں سرگرم شعر کیوں سنتے
پھر وہ ہزاروں شاعروں میں خاص و عام کے منہ سے واہ وا
کیونکر لیتے۔"

(آبِ حیات)

"کلام میں شکوہِ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور
استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جن
میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں، زبان سید انشاء و جرأت
کی ہے۔ کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہیں مگر اتنے نہیں ہیں
کہ ناسخ و آتش کے دامن ان کو جگہ دی جا سکے۔"

(گلِ رعنا)

میر نظام الدین ممنونؔ

"جوانے است شیریں سخن و واقف اکثر ضوابط
فن سلیس گفتار فصیح بیان بکار... کرد... محبت بیان و ریمکاب
شعر پایۂ سریر خاقانی انتظام بقدر شناسی و دیدہ وری صفت
ملک سحبانی خطاب مستطاب فخر الشعراء از حضور بحرام داشت و
مراتب بلیغ مشکل پسند بادشاہی بدیہہ ہمراہ و سرانجامی یافت۔"

(مجموعۂ نغز)

"در عرصۂ قلیل قوت شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا
کرد و کلام خود بر تبۂ کلام بدر رسانید۔" (تذکرۂ ہندی)

"طرز گفتارش خیلی دلچسپ و دلنشین است و طاقت
کلامش نہایت عذب و شیریں و بستن مضامین بیگانہ صفت
و فکر صحیح صائب از ملاحظہ استادانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن
دارد۔"

(گلشنِ بے خار)

"زبان ان کی صاف اور شیریں ہے۔ اس پر جابجا
محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے،
پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس ڈھنگ
سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا
ہو جاتی ہے۔"

(گلِ رعنا)

اسد اللہ خاں غالبؔ

"پایہ اش از فحول استادان کم نیست غزلش چوں غزل
نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دلپذیر مضامین شعری
را کما حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف ربطے پی می برد۔"

(گلشنِ بے خار)

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے۔ اس سے
ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ
رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں
پہنچ سکتے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و
معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ
خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا
شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس
سے طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے
جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر
صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔"

(آبِ حیات)

"مرزا صاحب نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے انوکھے
اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعرا نے چھوا تک نہیں یا
وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے
ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون
ان کا نیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام

ورمتنل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سے
جہاں تک ہوسکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے
ہیں مثلاً سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، کف حباب کو
شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال
سے، استخواں کو خشت سے، بدن کو قالبِ خشت سے اور اسی
قسم کی بہت سی تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں۔ ان
میں ایک خصوصیت ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت
سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر
دیتے ہیں۔ سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے
بڑھ کر ہیں مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں تو متانت ان کے ہاں سے
رخصت ہو جاتی ہے۔"

"ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے اشعار
میں ایک خاص چیز ہے جو (مومن کے سوا) اوروں کے ہاں بہت
کم دیکھی جاتی ہے۔ ان کا کلام ایسا پہلودار ہوتا ہے کہ بادی النظر
میں ان سے کچھ اور معنی معلوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد
دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان
کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔" (گل رعنا)

مومن

"زمزمۂ نغز بقوت شاعری ایشاں کم کسی سر خواندہ
در جنس سخن آں چناں مکانتی و دانی دارد کہ کسے را در یک صنف آں ہم
میسر نیامدہ و باوجود تخالف اسالیب بہرہ [illegible] چنداں پسندیدگی
نصیب او گشتہ کہ پارسیان ازاں نو دمی انگارند و ہندیاں خود از شعر
ایں نسبت بہ نازشہا کہ دارند۔" (گلشن بے خار)

"غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور
مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی
اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے
سے ادا کیے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز
جرأت سے ملتا ہے اور اس پر خود بھی نازاں تھے۔ اشعار
مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں ہیں کہ اردو کی
سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی بات میں چند صفت خاص
ہیں جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک
شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجب
لطف لطیف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں۔"
(آب حیات)

"مومن خاں سخن فہم [illegible] بیان ہیں
نزاکت و لطافت پیدا کرتے ہیں [illegible] ان کی ذہانت اور جودت طبع
کا [illegible] ہے۔ قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا
انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو زمانہ حالی
جیسا نقاد نہیں ملا ورنہ ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں
کرتا۔" (گل رعنا)

ذوق

"ذوق سخنی کہ او راست دیگرے را دیدہ نشد
و معہذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویاں است در کلامش
کم [illegible] در جمیع اصناف سخن قدرت تام دارد بالجملہ [illegible] مسلم و
مقرر است۔" (گلشن بے خار)

"عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی
کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر حقیقت
میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف تھا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز
تھا، شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ ان کا ڈھنگ
وہی تھا اس لیے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا اس کے علاوہ مرزا
کی طرز کو جلسے کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے
واہ واہ کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے چنانچہ

وہی شکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہ ہیں، اسی کساں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف ایک بزرگ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوف اور معاملات اور رندانہ خیالات کی طرف مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد سلطنت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جرأت اور سید انشا اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ ان کی غزلیں انہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گل ہائے رنگا رنگ کا ہو گئی تھی۔ وہ بیں شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے اور بیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے مناسب خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو بیکار رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اسی میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور انہی اصول کے لحاظ سے میر، مرزا اور مصحفی، سید انشا، جرأت بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا انہی کے شاگرد ہیں۔"

(آبِ حیات)

بہادر شاہ ظفر

"شعرے کہ از طبع دُربار جناب ایشاں می تراود لولوئے باشد لالائے بخشے کہ از فکر صائب حضرت شان سر برآورد درسے باشد بکسر معاد مربہا ہے۔"

(مجموعۂ نغز)

"با ایں فن بسیار مالوف است۔"

(گلشنِ بے خار)

"تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے اساتذہ کی کاوش مسلّم مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پہ پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے۔"

(گل رعنا)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

"در مراتب نظم و نثر ادائے خاص وارد و بہ ہر دو زبان ریختہ و پارسی سحر سے می طرازد۔" (طورِ کلیم)

"اس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی۔"

(گل رعنا)

ناسخ

"از سن بست سالگی بمقتضائے موزونیٔ طبع فکر شعر ہندی میکند و در تلاش ہائے معنی تازہ می نماید۔"

(ریاض الفصحا)

"والحق بہ عالی پایہ بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنیٔ بیہرا بے مثل و مثال از اقسام سخنوری بہ غزل سرائی مائل و غیر از غزلیات [illegible] صنفے آخر از دیدہ نشد۔"

(گلشنِ بے خار)

"غزلوں میں شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صفت ہیں

ترکیب دے کر ایسی رنگینی اور مینا کاری فرماتے کہ بعض موقع پر جملہ رنگ آمیزی کی حد میں جا پڑتے اور اُردو میں وہ اس صاحب طرز زبان کے۔ انھیں ناسخ لکھنا بجا ہے کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا۔"

(آبِ حیات)

"ناسخ کی قوتِ تخیل نہایت زبردست ہے، ایک چیز کو وہ سو سو طرح دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ ان کو ایک عالم نظر آتا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کر کے تمثیل اور مبالغہ سے اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس قوت کے استعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔"

"کہیں پر مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارا بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب الماخذ نہیں ہوتے، کہیں پر کسی چیز سے تشبیہ دے کر اس کے تمام لوازم اور اوصاف اس میں ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی۔"

"یہ ان کا اندازِ بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اس نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کر کے چھوڑا۔ یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے اس کو چمنستانِ خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔"

(گلِ رعنا)

آتش

"اگر عمرش وفا کردہ و چند سال بر ہمیں وتیرہ رفت و قلم بخش را مانعے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد۔"

(ریاض الفصحا)

"جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اُردو کا بستر العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں۔ ان کے کلام نے پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔"

(آبِ حیات)

"زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پردازی میں ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے لیکن سوز و گداز میں یہ ان سے آگے ہیں۔"

(گلِ رعنا)

شہیدی

"طبع خوشے دارد و در عروض دستگاہے معقول و در حساب مکاتی مقبول۔"

(گلشنِ بے خار)

"شعر و سخن میں ایسی قدرت کامل بہم پہنچائی تھی کہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو ایک طرح میں چھ غزلہ، ہفت غزلہ لکھتے تھے اور کوئی غزل پچیس و پینتیس شعر سے کم نہ ہوتی۔"

(گلِ رعنا)

مرزا قربان علی سالک

"چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے اور مرزا غالب کے شاگردوں میں سب سے بہتر نظر آنے لگے۔"

(گلِ رعنا)

میر مہدی مجروح

"مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں جن میں محاوروں کی چاشنی

زیادہ پائی جاتی ہے مگر اساتذہ کے کلام میں جدت و تازگی نہیں
ہے۔ انہی مصرعوں کو جنھیں متوسط طبقہ کے شعراء نے اپنی
مخصوص زبان و طریقۂ بیان میں ادا کیا ہے، علمی کلام میں لائے
ہیں مگر بعض جگہ نزاکت بیان کی دلفریبی نہ ہو نہیں سکی معمولی بات حیثیت
کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ کلام میں پختگی کے لوازم
اچھی طرح پائے جاتے ہیں۔" (گلِ رعنا)

میر حسین تسکین

"صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند۔"
(گلشنِ بے خار)

"استاد کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ
کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ
ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں
کے ساتھ اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے
کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے
کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔" (گلِ رعنا)

نواب مرزا خاں داغ

"شوخی کہ در کلام اوست، بندہ ندانم کہ امروز دیگرے
را دادہ باشند و زمانے کہ او را بخشیدہ اند، زمانہ ہیچ کس را ہمیشہ
نیست بنیش ازیں ستائش گفتار او چہ توان گفت، خیر الکلام
ما قلّ و دلّ۔"
(طور کلیم)

"زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور
بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے۔
حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات،
گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو شوکر

عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزے لیتے ہیں۔"
(گلِ رعنا)

منشی امیر احمد امیر

"اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن میں استاد
مسلم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو
شعر و انشاء کے لیے موزوں تھی۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن
میں طبع آزمائی کی ہے، اس پر کلام کا زور مضمون کی متانت سے
ہر جگہ دست و گریبان ہے۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے
لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جڑے جاتے ہیں، خیالات نازک
اور مضامین بلند اس طرح باندھتے تھے کہ اس باریک نقاشی پر
فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے
جو داغ میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے۔
کلام میں جوانی کی امنگیں بڑھتی گئیں۔" (گلِ رعنا)

خواجہ الطاف حسین حالی

"اردو کا دیوان انھوں نے مرتب کیا ہے اور
اردو شاعری پر سواد و سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس میں شامل
کر دیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے اور اردو زبان میں اپنی کیفیت
کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے مولانا کے مذاقِ شاعری
کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔" (گلِ رعنا)

حکیم ضامن علی جلال

"کثرتِ مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہو گیا۔" (گلِ رعنا)

شیخ امیر اللہ تسلیم

"عام جوہر ان کے کلام کا پختگی کلام، رنگینیِ کلام،

نشی الفاظ اور دلپذیر مضامین ہے جس سے سب سے نمایاں کی شان اس میں کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔" (گل رعنا)

سید اکبر حسین اکبر

"وطن سے کہ خانہ نشین ہونے کے بعد ان کی شاعری نکلی اور زمانے کے میلان عام اور جدید طرز معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر پڑا ہوا تھا، اس کو ظرافت کے پردے میں ظاہر کرنے کی راہ انھوں نے ڈھونڈ نکالی۔ اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہے اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اس سبب مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے۔ یہ خیالات اس زور اور اس خوبی کے ساتھ معاصرین سے کسی کے ہاں نہیں ملتے۔"

(گل رعنا)

شاد عظیم آبادی

غزل جدید کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے دہلوی طرز تخیل کو لکھنوی زبان کے ساتھ اس خوبصورتی کے ساتھ ملایا ہے کہ غزل قدیم و غزل جدید کے درمیان میں نہایت دلکش و موثر غزل نکل آتی ہے۔ ان کی فکر میں جودت، تخیل میں وسعت، بیان میں لطافت ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کی طرز شاد کا آئینہ ہے۔ اس کو نقل کرنا کافی ہے:

"شاد کی شاعری حسن و عشق کے خمار اور سوز و ساز انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاکیزہ حسن و عشق، رندی و رندی کی دلکشی روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے۔ چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں۔ بیان میں وہی رقت ہے۔ میر ہی کے اوزان و بحریں ہیں۔ وہی انداز کلام ہے۔ وہی فقیرانہ صدا ہے اس لیے شاد کو اس دور کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔"

اس پر اس قدر اضافہ کی ضرورت ہے کہ شاد اپنی ضعیف العمری کے اثر سے اور السنۂ قدیم کی مہارت و عادت کے سبب سے عربی کے بعض الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کر سکتے ہیں جس طرح ڈاکٹر مذہب یا محاورہ دہلوی اپنے زمانہ شاعری میں بے تکلف عربی بولتے تھے، ہمارے خاندان سخن نے ناسخ، ذوق، امیر وغیرہ کے "فالق الاصباح" "متقعان" "مطلایہ" "مجرالیہود" "عین الحیات" جیسے الفاظ کو لطافت غزل کے منافی قرار دیا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا کلام بھی اس انداز سے خالی نہیں۔" (تاریخ و تنقید) ادبیات اردو

ریاض خیر آبادی

ریاض کے لسان العصر ہونے میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ وہ یقیناً اپنے زمانہ کی آواز تھے اور ایسی آواز جس کے آگے ہر آواز کچھ بیٹھ سی گئی۔ وہ زبان پر وہی قدرت رکھتے تھے جو ایک کھلاڑی یا بازی گر اپنے ناخنوں پر رکھتا ہے ان کی شاعری ایسی فقرہ بازی ہے جو کسی وقت کسی صحبت میں نیچ نہیں ہوتی۔ بعض نقادوں نے شاعری کو فاضل قوت کا مظاہرہ بتایا ہے۔ کم سے کم ریاض کی شاعری یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ شاعر بلوغ کے بے چین دور سے گزر رہا ہے اور اس
کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ قوت اور توانائی کی فراوانی کا
بڑھتا ہوا احساس اس کو طرح طرح کی دلچسپ حرکتیں کرنے پر
مجبور کر رہا ہے جن پر سنجیدہ سے سنجیدہ اور بوڑھے سے بوڑھے
آدمی کو تھوڑی دیر کے لیے ایسا مزا آتا ہے کہ وہ اپنی ساری بزرگی
اور سنجیدگی بھول جاتا ہے جیسے بچوں کے بعض کھیل ہوتے
ہیں مثلاً پتنگ بازی کہ سن رسیدہ سے سن رسیدہ اور مشغول سے
مشغول ہستیاں بھی ایک مرتبہ نظر اٹھا کر تھوڑی دیر کے لیے محو ہو
جاتی ہیں۔ اگرچہ معاً یہ بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ بچوں کا
کھیل ہے، زیادہ وقت نہ دو ورنہ کام کا حرج ہو جائے گا۔"
(تنقیدی حاشیے)

آرزو لکھنوی

"آرزو ان شعرا میں سے ہیں جو چلتے بنتے لکھنؤ
کی آخری بہار یعنی جلال کی گرمی اور پختگی سے لیکن اس سے علاوہ
نے انداز بیان کی سادگی بھی پیدا کی۔ یہاں تک کہ آج اردو کے
ممتاز شعرا میں آرزو کا نام دو حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔
ایک خیال کی سادگی اور نرمی کی وجہ سے دوسرے زبان کی
عام فہم شیرینی کی وجہ سے غزل کی زبان کو بول چال کی زبان کے
قریب لا کر شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ شاعر کی بولی دنیا والوں
کی بولی سے الگ نہیں ہوتی اور نہ وہ قدیم حدوں کی قید میں
ہمیشہ اسیر رہتی ہے۔" (نئے اور پرانے چراغ)

اقبال

"اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوش بیان اور
رمزیت ہے جس کی مثال حافظ اور غالب کو چھوڑ کر دوسروں
کے ہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے نظم الفاظ میں بلا کی ایک
قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی
ذہن کو مسحور کر دیتا ہے۔

اس کی تمام غزلوں میں غنائی عنصر کا بہترین اظہار ہوا
ہے۔ وہ ایسی بحریں اور زمین منتخب کرتا ہے جو غزل کے لیے
خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں۔ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب
وزن منتخب کرنے سے شاعر اپنے کلام میں بے پایاں دلفریبی
اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی شراب و نغمہ،
بادہ و خمار اور رسم فروش، زلف و خال اور رخسار و دنداں کا بھی
پیرایۂ بیان موجود ہے لیکن وہ ان کے ذریعے رمز و کنایہ کی ایسی
دنیا تخلیق کر دیتا ہے کہ جذبہ و وجدان جھومنے لگتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے
میں ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس ایک شعر پر بہت سے شعرا کے دیوانوں
کو قرباں کیا جا سکتا ہے۔

بعض اردو غزلیں سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی
ہیں ان کا ایک ایک لفظ جذبات و کیفیات کی آواز بازگشت
ہے۔ لوازم عشق کی کیفیات کو وہ کس لطف اور بے تکلفی کے
ساتھ بیان کرتا ہے ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی — بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(روحِ اقبال)

کے خوشی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں
پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دیگا
اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر
وجود میں آئیں گے اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے
خوش [illegible] اردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال ایسا
شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی
اردو دان دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم
و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔
اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب
کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی
روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی
جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے
اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے
ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

(دیباچہ بانگ درا)

حسرت موہانی

حسرت اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت حاصل
کر چکے ہیں۔ انھوں نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے
لکھنؤ کی زبان کے باوجود رنگ دہلی کو قائم رکھا ہے۔
مومن، جرأت، نسیم، تسلیم سب کا نام روشن کیا ہے۔ ان کا
حسن و عشق ان کے ہجر و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں مگر انھوں
نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان سے
بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے گھریلو فضا کے حسن کو دیکھا
ہے اور اس دنیا کی عورت میں حور آسمان کا تقدس اور جمال
دکھایا ہے۔ ان کے حسن کی طرح ان کا کلام بھی سدا بہار ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

اصغر گونڈوی

جناب اصغر فطرتاً شدید الاحساس، بلند نظر اور
صاحب وجد و حال ہیں اس لیے ان کا ایک ایک شعر منبع جمال
شکوہ الفاظ، حسن ترکیب، جوش بیان، ندرت ادا کا ایک
دلفریب طلسم ہے۔ اسرار و معارف ان کی شاعری کا ہیولیٰ
وجد و حال اس کی روح، ندرت ادا اس کی صورت اور رنگینی بیان
اس کا [illegible]۔ بطور مثال شعر ذیل ملاحظہ طلب ہے۔

خرمن گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے سیر گلستاں تنگیٔ داماں کوئی

حقیقت یہ ہے کہ غالب، مومن نے اساتذۂ ایران کے
تتبع [illegible] اردو شاعری میں جو زور سے
باب اضافہ کیے تھے [illegible] اولیں تھے۔ جناب اصغر
حکیم مومن خان کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں اور غالب کے شیدائی
ہیں اور خوش قسمتی سے بادہ عرفان کے ذوق آشنا بھی ہیں
اس لیے ان کی شاعری میں، حکیم مومن خان کی نزاکت اسلوب
اور شگفتگی ترکیب اور غالب کا زور بیان اور نکتہ آفرینی شیر و شکر
ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں جس میں تصوف و عرفان
نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے، ان کی شاعری پر نقش ثانی
ہے اس لیے نقش اول کی خامیوں سے پاک ہے [illegible]
حیثیت سے اگر ان کو ایک طرز خاص کا موجد کہا جائے گا
تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ (تبصرہ نشاط روح)

احباب میری کوتاہ قلمی سے بے خبر نہیں ہیں
خصوصاً تقریظ کے معاملے میں۔ لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے
ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک تقاضا ان
سطور کی نگارش کا باعث ہوا۔ یہ تقاضا اگر صاحب کلام کا
ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا مگر خود کلام کا تقاضا ہے

اور اس کے لیے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

اُردو شاعری کی موجودہ صف طویل نہیں ہے اور اگر معیار بندی پوری طرح قائم رکھی جائے تو معدودے چند اصحاب ذوق سے شمار آگے نہیں بڑھتا۔ انہی اصحاب ذوق میں مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ "نشاطِ روح" اور دوسرا حصہ "سرودِ زندگی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہوا تھا مجھے بھیجا تھا۔ اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی ہے اس لیے قدرتی طور پر ذہن کسی غیر معمولی دلچسپی کے لیے مستعد نہ تھا۔ میں نے بے دلی سے مجموعہ اٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کر کے رکھ دوں لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے میں چونک اٹھا اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، میری تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی، میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہل فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں بدگمانی کی شکایت ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ؎

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

بہائے درد و الم دردِ غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لیے

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

(تقریظ: سرودِ زندگی)

فانی بدایونی

"فانی کے یہاں فلسفہ طرازی، غم، تغزل، لطفِ زبان سبھی کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس دور میں غالب کی پیروی میں اگر کوئی صحیح معنی میں کامیاب ہوا ہے تو وہ فانی اور اقبال ہیں۔ اقبال نے نظم میں غالب کی رفعتِ تخیل اور بلاغتِ اسلوب، اور فانی نے غالب ہی کے میدان میں غالب کی تقلید کی۔ فانی کی زندگی ان سے عبارت ہے۔ یہ لوگ یہ کہہ کر فانی کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں سوائے رونے اور بسورنے کے کچھ نہیں، وہ سطحی تنقید کرتے ہیں۔ فانی نے زندگی اور موت دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے انھوں نے موت سے اس کی ہیبت اور پُراسرار کیفیت چھین لی ہے اور اسے زندگی کی طرح گوارا بنا دیا ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

جگر مرادآبادی

"جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعرا میں سے ہیں، ان کو لوگ مانیں یا نہ مانیں اُن کے کلام پر سبھی سر دھنتے ہیں۔ جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک ان میں حسرت کم اور دعوتِ کلام و مومن زیادہ ہے۔ بجائے والہانہ انداز کے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جگر نے اُردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے عطا کی، حسرت کے یہاں شگفتگی و شادابی ہے، جگر کے یہاں تندی و تیزی، جگر اس

... کے تمام شعراء سے زیادہ سپردگی ... اور سرمستی
نظر آتی ہے ... (نئے اور پرانے چراغ)

جوش ملیح آبادی

"جوش ان شعراء میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں
پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے بعد جن غزل گو نظم کا
... اور کائناتی لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں
کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جگر سے زیادہ بلند آہنگی
اور مردانگی پائی جاتی ہے۔ جگر کے یہاں رنگینی اور رعنائی زیادہ ہے
جوش کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے اکثر یاد
کیا جاتا ہے۔ نظموں میں انھوں نے بہت سے انقلابی نغمے
نظم کیے ہیں مگر نظموں میں ان کی انانیت یکساں موجود ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

فراق گورکھپوری

"ہمارے تمام شعراء میں فراق گورکھپوری سب سے
زیادہ مغربی ادب سے واقف اور مغربی سانچوں سے آشنا
ہیں مگر اس سے ان کی مشرقیت میں زیادہ تغیرات کی ایک
مسلسل کوشش ملتی ہے اور یوں بھی انھیں اردو کا نقاد شاعر
کہا جاتا ہے۔ فراق کے یہاں نفسیاتی تجربے بھی ہے جذبات
بھی۔ ان کی الھڑی اکھڑی سی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی
ہے۔ ... قوت شفا کی طرف وہ خود اشارہ کرتے ہیں۔ ابھی
وہ نیم خوابیدہ سی ہے شاید وقت اسے بیدار کر دے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

اثر لکھنوی

"اثر اس وقت جس مقام پر ہیں وہ کافی بلند ہے۔
لکھنؤ کی شاعری پر ... کی گئی ہے یا خشک ... ہیں یا سر فلسفہ
غالب کی تقلید بھی انھیں تفلسف کی طرف لے گئی ...
تمام لکھنوی شعراء میں اگر کہیں بھی رنگینی اور شادابی ملتی ہے تو عشق
... زیادہ تر اثر کے یہاں۔ ان کے یہاں فرد کی
پختگی ہے اور جدید رنگ کی راہ بھی ... اور بے خود
نہیں ہوئے ان کی لطافت اور رنگین چاشنی بھی ... جاتی ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

یاس یگانہ

"لکھنؤ اسکول سے رد عمل کے طور پر ان کے
یہاں یکسانگی کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے مگر اسے غزل عشق
نہیں کہہ سکتے۔ ان کے یہاں وہ مردانگی ہے جو جوش میں ہے
نہ وہ رعنائی جو حسرت میں ہے نہ وہ نفاست جو اصغر کے یہاں ہے
نہ وہ مستی جو جگر کے یہاں ہے۔ نہ وہ ندرت جو اقبال میں ہے
غزلوں سے زیادہ ... رباعیوں میں اور قطعات میں کامیاب
ہوتے ہیں جہاں کوئی ایک خاص بات۔ اخلاص اشارہ ہی کافی
ہوتا ہے۔ ان کے یہاں قوت ایجاد کی کمی نہیں۔ انھیں کوئی کسی
کا مقلد نہیں کہہ سکتا مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے
کہ انھوں نے پیغمبری کو ... سمجھ لیا ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

حفیظ جالندھری

"حفیظ کے یہاں آرزو اور اختر کی طرح گیتوں
کا سریلا پن پایا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سادگی تو وہ تھی جو میر و درد
نے برتی دوسری وہ جو حالی اور عظمت اللہ خاں کے اثر سے
آئی۔ اس میں موسیقی کا زیادہ لحاظ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ
بول چال کی زبان بھی لمبی بحریں نمایاں ہیں۔ حفیظ سے پہلے پہلے

گیتوں کے ذریعہ سے شہرت پائی مگر ان کی غزلوں میں بھی گیتوں کی سادگی اور شیرینی موجود ہے:

(نئے اور پرانے چراغ)

سیماب اکبر آبادی

"سیماب اچھے شاعروں میں سے ہیں وہ ان لوگوں میں نہیں جو کوئی ذاتی آرٹ کوئی نیا جذبہ کوئی نیا احساس رکھتے ہیں مگر وہ خوش گو اور خوش فکر ضرور ہیں۔ ان کے یہاں خوشنما ترکیبیں بھی ہیں اور لطیف اور نرم جذبات بھی۔ مگر باوجود استاد ہونے کے کبھی وہ اقبال کبھی جوش اور بعض وقت جگر کے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ سیماب کے کلام سے اس دور کے تمام رجحانات معلوم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور ہر جذبہ کی ترجمانی کی ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

کتابیات

مصنف	کتاب
میر - محمد تقی	نکات الشعراء
حمید الدین خواجہ اورنگ آبادی	گلشن گفتار
فتح علی حسینی گردیزی	تذکرۂ گردیزی
قائم - قیام الدین چاندپوری	مخزن نکات
شفیق - لچھمی نراین	چمنستان شعراء
حسن - میر غلام حسن	تذکرۂ شعرائے اردو
علی ابراہیم خاں -	گلزار ابراہیم
مصحفی - غلام ہمدانی	تذکرۂ ہندی - ریاض الفصحاء
لطف - مرزا علی	گلشن ہند
شیفتہ - نواب مصطفےٰ خاں	گلشن بے خار
نساخ - عبدالغفور خاں	سخن شعراء
آزاد - مولوی محمد حسین	آب حیات
عبدالحی - مولوی حکیم	گل رعنا
حالی - خواجہ الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری
نیاز فتحپوری - نیاز محمد خاں	انتقادیات (حصہ دوم)
عبدالسلام ندوی	شعر الہند
حامد حسن قادری	تاریخ و تنقید
	طور کلیم

مصنف	کتاب
مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر سید	نگار لکھنؤ (انتقاد نمبر ۱۹۴۶ء)
کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	غزل (طبع اول)۔ روح اقبال
اعجاز حسین، سید	نئے ادبی رجحانات
سرور - آل احمد	نئے اور پرانے چراغ (طبع دوم)
احتشام حسین	تنقیدی جائزے
عبداللہ - ڈاکٹر سید محمد	بحث و نظر
عبادت بریلوی - ڈاکٹر	"ماہ نو" کراچی، فروری ۱۹۵۳ء
وقار عظیم، سید	"ماہ نو" کراچی، فروری ۱۹۵۳ء
ابو اللیث صدیقی - ڈاکٹر	"ماہ نو" کراچی، جنوری ۱۹۵۳ء
باقر حسین - سید	"ماہ نو" کراچی، فروری ۱۹۵۳ء
فیض - فیض احمد	سرآغاز "نجم کا کل"
سردار جعفری - علی	ترقی پسند ادب
عبدالقادر، سر	دیباچہ "بانگ درا"
مجنوں گورکھپوری	تنقیدی حاشیے
سہیل - اقبال احمد	تبصرہ "نشاط روح"
آزاد - ابو الکلام	تقریظ "سرود زندگی"

انیس و ادبیات

لمتہ بہ شمسہ

اُردو غزل کا مستقبل

حفیظ جالندھری: اچھا تو آپ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ غزل کیا ہے؟

چراغ حسن حسرت: غزل کا آغاز در اصل قصیدہ کی تشبیب سے ہوا۔

صوفی تبسم: شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک غزل قصیدہ ہی کی ایک قسم ہے۔

حامد علی خاں: اس سلسلے میں ہمیں دو خصوصیات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ایک فارم اور دوسری موضوع۔ غزل کا موضوع ایسے انسانی جذبات ہیں، جو داخلی طور پر ایک فرد کے ہیں۔ لیکن ان میں ایک آفاقیت ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سب سے بڑا موضوع محبت ہے۔

ابو اللیث صدیقی: یہ موضوع تو نظم کا بھی ہو سکتا ہے۔

حامد علی خاں: غزل کے تمام اشعار کا موضوع ایک نہیں ہوتا۔ ہر شعر میں مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر میں نفرت ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے شعر میں انتہائی اُلفت۔

حفیظ جالندھری: نفرت بھی تو محبت ہی کا ایک پہلو ہے۔

حامد علی خاں: لیکن اگر غزل میں نہین بنانے کا طریقہ بنایا جائے تو وہ غزل نہیں ہو سکتی۔

حفیظ جالندھری: اس کا ایک اپنا مزاج ہے۔

حامد علیخاں: بلکہ یہ کہئے کہ ایک فرد اپنے تجربہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ سب کا تجربہ معلوم ہو تو وہ غزل ہے۔

صوفی تبسم: صرف محبت کا تجربہ!

حامد علیخاں: یہ ضروری نہیں، مثلاً اقبالؔ کے ہاں عورت اور محبت کا ذکر کم ہے۔

حفیظ جالندھری: اگر آپ اس بحث میں اقبالؔ کی غزل کو لائیں گے تو ہم اپنی عقیدت کی وجہ سے اس سے الگ ہو جائیں گے۔

صوفی تبسم: ہمیں کسی ترتیب سے چلنا چاہیے۔

ظہیر کاشمیری: یہ فروعی باتیں ہیں۔ ہم تو بنیادی عناصر کا تجزیہ کرنے چلے ہیں جو اسے دوسری اصنافِ سخن سے علیحدہ کرتے ہیں۔

حامد علیخاں: میں یہ کہوں گا کہ نظم میں ربط اور توضیح ضروری ہے۔ برخلاف اس کے غزل میں تسلسل نہیں ہوتا۔ غزل میں خیال کے اس عمل کو نہیں پیش کرتے جو CONCENTRATED ہے۔ اس کے مقابلہ میں نظم میں زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ کلیم الدین احمد نے شاید اس لئے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے خیال میں غزل میں عمومیت زیادہ ہے۔

ظہیر کاشمیری: غزل کے ایک شعر میں مضمون ادا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن نظم میں منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ اور فکر کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

صوفی تبسم: غزل کی پہلی خوبی اس کا ایجاز اور اختصار ہے۔

چراغ حسن حسرت: تبسم صاحب نے درست فرمایا۔ ایجاز، اختصار اور رمز و کنایہ غزل کی خصوصیات ہیں۔

حفیظ جالندھری: شاعر جو ڑھا ہو کر رباعی کہتا ہے، اس لئے کہ دو مصرعوں میں خیال کو ادا نہیں کر سکتا تو چار مصرعے

کہتا ہے۔

احسان دانش: ۔یعنی اُسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ پھر بھی صرف ایک ہی مصرعے میں کہتا ہے اور باقی تین مصرعے اسے تمہیداً یا رسماً لکھنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ اکثر نظمیں غزل کے ایک شعر کو پھیلا کر کہی گئی ہیں۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غزل میں موڈ کی ہم آہنگی فارم میں ہوتی ہے لیکن اشعار میں نہیں۔ ہر شعر بذاتِ خود خیال کی اکائی ہوتا ہے۔

سبط حسن: ۔ غزل کی صنف پر گفتگو کرتے وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں غزل کی جامع تعریف بیان کرنی چاہیے۔ اگر اس پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے تو زیادہ بہتر ہو۔ غزل کی ایک مسلسل ارتقائی تاریخ ہے اور ہر دور میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ فارم کے علاوہ تجربے بھی نئے ایجاد ہوئے ہیں۔

حامد علیخاں: ۔فارم سے مراد ظاہری ہیئت ہے۔ مطلع، اشعار اور مقطع —— یہ فارم ہے۔

سبط حسن: ۔ میری مراد اس سے نہیں۔ غزل فارسی زبان سے آئی ہے۔ ہندی میں گیت اس سے پہلے موجود ہے، جیسے آپ غزل کا مزاج کہتے ہیں۔ غزل عورتوں سے بات چیت کرنے کو کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ غزل میں ابتدا میں محبت کے جذبات بیان ہوتے ہوں۔ اور بعد میں تصوف اور فلسفہ کے مسائل شامل ہوتے ہوں۔ اقبال تک آتے آتے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ علامتیں، اشارات اور شکل کے علاوہ معانی بھی بدل گئے ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ یہ فارم نہیں۔ بلکہ اس کی ظاہری ہیئت فارم ہے۔

حفیظ جالندھری: ۔ ہم نے فارسی سے فارم لی ہے۔ عربی میں غزل نہیں تھی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ یہ درست ہے کہ عربی میں غزل نہیں ہے۔ لیکن قصائد میں تشبیب تو ہے۔

حفیظ جالندھری: ۔ میری مراد یہ ہے کہ مضمون کو ادا کرنے کا یہ طریقہ یعنی پورے مضمون کو ایک اکائی میں بیان کرنے کا طریقہ کسی دوسری زبان میں نہیں تھا۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غالباً حفیظ صاحب غزل سے مراد [illegible] لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے بات اور سمت کو چلی گئی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ ہم غلط راستہ پر جا پہنچے۔ غزل فارسی سے آئی ہے۔ اور اقبال تک پہنچنے میں اس نے بڑی لمبی مسافت طے کی ہے۔ سعدی غزل کا استاد ہے۔ سعدی کے ہاں موڈ کا تسلسل ہے۔ حافظ تک آتا گیا اور موڈ کا تسلسل کم ہوتا گیا! حافظ کے ہاں بھی موڈ کا تسلسل ہے۔ بعد میں ہر شعر الگ الگ ہونے لگا۔

ظہیر کاشمیری: ۔ فارم کے لحاظ سے غزل دیگر اصناف سخن سے علیحدہ ہے۔ جہاں تک خیالات کو ہونے کا تعلق ہے، زمانہ کے عروج و زوال کے ساتھ اپنے اندر مختلف خیالات کو سموتی رہی ہے۔

احسان دانش: ۔ یہ بات تو سارے لٹریچر پر حاوی ہو سکتی ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ لیکن قصیدہ مر گیا ہے اور غزل زندہ ہے۔

احسان دانش: ۔ یہ بالکل درست ہے، یہی ایک صنف سخن ہے جس میں ہم ایک شعر کے اختصار میں وسیع خیالات کو بند کرتے ہیں۔ اور یہی اس صنف کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ ہے۔

ابواللیث صدیقی: ۔ ہمیں بحث کو محدود کرنا چاہیے۔ موجودہ غزل کی فارم وہ ہے جو فارسی سے آئی۔ ہمارے یہاں اردو میں امیر خسرو کی ریختہ فارسی کی بہ نسبت ہندی سے زیادہ قریب ہے اور اس کی پوری فضا خسرو کی ہندی شاعری سے متاثر معلوم ہوتی ہے رفتہ رفتہ غزل نے اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ ترقی

کی منزلیں طے کیں۔ وہ نظم کی ایک ایسی شکل ہے جس کے
اشعار میں کوئی ہم آہنگی ضروری نہیں اس کا موضوع محض
محبت نہیں۔ محبت قصیدہ اور نظم کا موضوع بھی ہو سکتی ہے
بلکہ اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت
شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان کرتا
ہے کہ وہ غم دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ مطلب
نہیں کہ غزل گو شاعر خارجی حالات سے متاثر نہیں ہوتا۔ اثر
وہ انہی سے لیتا ہے۔ لیکن اس کا انداز بیان اور اظہار کلیتہً
ان احساسات کے تابع ہوتا ہے جو اس تاثر کے بعد اس کے
اپنے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ کیفیت ہے جسے
رمزیت یا اشاریت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ——
اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت
شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان
کرتا ہے کہ وہ غم دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری:- اس سے مجھے اختلاف ہے۔ شاعر کا
(ATTITUDE) عملی طور پر داخلی نہیں ہوتا۔ خارجی بھی ہو
سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ فارم کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ
اس میں خیال کے عمل کو کسی (SUBJECTIVE) انداز
میں ظاہر کیا جائے۔

ابواللیث صدیقی:- فارم کا یہ تقاضا ہرگز نہیں۔ لکھنؤ کی ساری
غزلیہ شاعری داخلیت سے عاری ہے۔ آپ کو ایسی بہت
سی غزلیں ملیں گی جن میں داخلیت قطعاً نہیں۔ لیکن ان میں
تغزل کی کمی ہے۔

چراغ حسن حسرت:- اگر یہ بحث اسی طرح جاری رہی تو
غزل کے مستقبل کا فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ ہمیں اب جلد از جلد
تشبیب سے گریز کرنی چاہئے۔

(قہقہہ)

حفیظ جالندھری:- اب تک جو کچھ بحث ہوئی اس سے گویا ہم
اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے۔ وہ
(UNIVERSAL) ہوتا ہے۔ وہ اپنے محسوسات اور
تجربے کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والا یہ کہنے پر مجبور
ہو جاتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اور فارم اس
کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی رو سے ہر شعر ایک
علیحدہ اکائی ہوتا ہے اور مختلف موڈوں کی نمائندگی کرتا ہے
ہر شعر میں ایک خاص تاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی بات
باقی نہیں رہتی۔ اگر رہ جائے تو اسے تشنہ بند کہتے ہیں۔

صوفی تبسم:- غزل کی سب سے بڑی خصوصیت فارم نہ کہئے بلکہ
اس کی ایمائیت اور رمزیت اس کی سب سے بڑی جان ہے
جسے ابواللیث صاحب نے شدید داخلیت سے تعبیر
کیا ہے۔ یہ ایمائی قوت جس شعر میں زیادہ سے زیادہ گہری
گئی ہو گی وہ شعر تغزل کی جان ہے۔

چراغ حسن حسرت:- سہ بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
سر سبو بکشادند و در فرو بستند
(نظیری)

صوفی تبسم:- جذبے کا پھیلاؤ نظم ہے خواہ محبت کا ہو یا کوئی
اور۔ یہی جذبہ سمٹ کر یا بقول ظہیر صاحب کنسنٹریٹ ہو کر
غزل کے شعر میں آجاتا ہے تو وہ غزل ہے۔ تغزل ایک
اسلوب بیان ہے۔ دوسری بات جو سبط حسن نے کہی غزل
اور تغزل میں ہر دور میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

ابواللیث صدیقی:- یہاں ایک بات رہ گئی ہے جس کی طرف
ابتدائی بحث میں سبط حسن صاحب نے اشارہ کیا تھا کہ
غزل کی عام تعریف جو کی گئی ہے، عورت سے ہم کلام ہونا
تو اس سے ایک مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ شاعر فی الحقیقت
اپنے آپ سے زیادہ ہم کلام ہوتا ہے۔

احسان دانش: ۔ لوگ اس صنف کو غلطی سے صرف حسن و عشق کے معاملات بیان کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کی صحیح وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس احتیاط سے عورتوں کے ساتھ بات چیت کی جاتی ہے کہ انداز بیاں میں اختصار ہو، شیرینی ہو، لوچ ہو، سلاست ہو، جامعیت ہو، وہی احتیاط غزل کا مزاج ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ اس بحث سے اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک غزل کی فارم کا تعلق ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ جہاں تک خیال کا تعلق ہے، یہ کلیہ نہیں بن سکتا کہ داخلی تصورات ہی غزل کے مزاج کا حصہ ہیں۔ دکنی اشعار بیک وقت داخلی اور خارجی حقیقتوں کی زندہ مثالیں ہیں۔

صوفی تبسم: ۔ مثالیں بھی تو دیجیے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ کرتا نہ کچھ اگر جام دیتا بہار ہنسنے تو دو جس میں
غوروں سے ٹپکے گا نکہتِ مستی ہوا کی شکی شراب پیدا

کوئی بھی خیال ہو جب تک شاعر اسے اپنی ذات کا حصہ نہیں بناتا اس وقت تک کسی اچھی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر اچھا غزل گو جب تک غم دوراں کو اپنی ذات کا حصہ بنا کر اور خارجی حقیقتوں کو اپنا کر پیش نہیں کرے گا۔ اس وقت تک کوئی بامعنی شعر نہیں کہہ سکتا۔

ابو اللیث صدیقی: ۔ یہ تو وہی داخلیت ہوئی۔

(خاموشی)

ابو اللیث صدیقی: ۔ بحث فارم سے شروع ہو کر موضوع تک آگئی۔ میرے خیال میں اب یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ قلی قطب شاہ سے لے کر فیض تک غزل کے مختلف ادوار کا تجزیہ ہو جائے۔

سبط حسن: ۔ مجھے ہمیں تو اس کا مستقبل پیش کرنا ہے۔

ابو اللیث صدیقی: ۔ جی ہاں میں اسی سلسلہ کی تمہید کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے دور میں امیر خسرو اور قلی قطب شاہ تک ریختہ کا دور رہا ہے۔ یعنی نصف ہندی اور نصف فارسی ملا کر شعر کہنا۔ یہ روایت ولی دکنی تک چلی گئی ہے۔ ولی سے فارسی کی شدت میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن نے مناسب اُردو میں شروع کئے ..... لکھنوی شعراء کے زمانے سے بھی پہلے کے دور میں ایہام اور صنائع و بدائع کا دور ہے۔ اس دور کا موضوع محبت تھی۔ دلی تک کم و بیش یہی حال رہا۔ دوسرا اہم موضوع تصوف اور اس سے متعلق مسائل تھے اور تیسرا موضوع ذاتی غم تھا۔ جسے غم جاناں کہا گیا ہے۔ اور جو درحقیقت غم دوراں تھا۔ یہ تین بڑے موضوعات ہیں۔ جو غزل کے ہر دور میں نمایاں رہے ہیں اور اب اس کا معیار داخلیت ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ بہر حال غزل ہر دور میں مختلف خیالات کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اور غم جاناں کو غم دوراں بنا کر پیش کرنا اس کا حقیقی مقصد قرار پایا ہے۔ جس میں رمزیت اور اشاریت اور ایہام کے عنصر سے مزید کشش اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب تک جمالیاتی ذوق رکھنے والے اس رمزیت اور اشاریت سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ غزل کبھی نہیں مر سکتی۔

ابو اللیث صدیقی: ۔ ظہیر صاحب نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان میں مجھے ایہام سے اختلاف ہے غزل میں ایہام کا صرف ایک ہی دور آیا ہے۔

صوفی تبسم: ۔ ایہام کو ظہیر صاحب غالباً ایمائیت کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔

حامد علیخاں: خوب، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آئے زلف اور معنی بلغ لئے جائیں۔ (قہقہہ)

(خاموشی)

صوفی تبسم: ۔ بہرحال جو جاذبیت غزل میں ہے اور جس کی بنا پر
اس کے مقبول ہونے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے اس
سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچ، بچار کا مادہ بڑھ رہا ہے سائنس
کا دور، فکر طرازی زندگی کی پیچیدگیوں کا بڑھنا تعلیم کی عمومیت
اور وقت کی تنگی میں ایجاز و اختصار پسندی کا بڑھتا ہوا
احساس یہ سب چیزیں غزل کے حق میں بہت سازگار ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر جس نے نظمیں کہیں زیادہ
اور غزلیں کہیں کم کہیں ہیں۔ ان کی نظموں میں اتنا زیادہ کام
نہیں جتنا کہ غزلوں میں ہے

احسان دانش: ۔ غزل زمانے کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس لئے
اس میں ایک آفاقیت اور پائیداری ہوتی ہے۔ نظم کسی خاص
ہنگامے یا تحریک کی بنیاد پر کہی جاتی ہے۔ اس لئے اس
کی عمر مختصر ہوتی ہے

حامد علیخاں: ۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ایمائیت ہے
جس میں آدمی لطیف اشاروں اور کنایوں میں وہ سب کچھ
کہہ سکتا ہے جو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کہنے میں
قابل گرفت ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک سیاسی آدمی بھی
اس مفہوم کو کہ آج ہمارے اقتدار کی باگ ڈور
مخالفوں کے ہاتھ میں ہے آج اپنی قسمت رقیب کے
ہاتھ میں ہے۔ کہے گا۔ اور یہ قابل گرفت نہ ہوگا۔

صوفی تبسم: ۔ الغرض محدود الفاظ، اشارات، اختصار، محذوفات
غزل کی جان اور حسن ہیں۔ اور آنے والا پیچیدہ دور اس
کے لئے موزوں ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے مولوی
شرر مرحوم کی ایک نظم "شب غم" پڑھی تھی جو ایک رسالے
کی شکل میں تھی، حسرت صاحب نے ضرور دیکھی ہوگی۔ اس
وقت میرے اندر ادبی شعور بالکل بیدار نہ تھا۔ اس کے
بعد میں نے غالب کا ایک شعر پڑھا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اگرچہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور تعلیم کے بالکل
ابتدائی دور میں تھا لیکن میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ
تمام طویل نظم جب غزل کے ایک شعر میں کہی جا سکتی
ہے تو ایک نظم کی کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس
طرح سوچنے کا رجحان بڑھتا رہے گا۔

سبط حسن: ۔ لیکن غزل کی افادیت کے راستے میں بعض دشواریاں
بھی ہیں۔ غزل بڑے خیال کو اور تفصیلی تاثر کو پیش کرنے سے
عاجز ہے۔ چنانچہ ادب کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ
جب بھی شاعر بڑے خیال کو ایک دو مصرعوں میں قید
نہیں کر سکا تو مثنوی یا قصیدہ کا سہارا لیتا ہے۔ بڑے
خیالات کے لئے غزل کی فارم شاید کبھی ساتھ نہیں
دے سکی۔

صوفی تبسم: ۔ گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تجربہ وسیع ہو،
وہاں غزل موزوں نہ ہوگی۔ میرے خیال میں کسی تجربے کا
وسیع ہونا اس کی دلیل نہیں کہ اس کے بیان کے لئے
جگہ اور پیمانہ بھی وسیع ہو۔ طویل تجربے چھوٹے پیمانے میں
ادا ہو سکتے ہیں ۔۔۔ حافظ کا شعر

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے

اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ظہیر کاشمیری: ۔ سبط حسن کے دلائل تو ٹھیک ہیں لیکن زبردست
نہیں۔ پھیلے ہوئے خیالات کو منطقی تسلسل کے ساتھ
پیش کرنے کے لئے نظم ہے۔ لیکن اشاراتی انداز میں بات
کہنے کے لئے غزل بہتر ہے اگر لوگوں کو فراغ نصیب
ہو تو نظم کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اور اگر معاشرہ
بحران میں ہو تو غزل بہترین فارم ہو سکتی ہے۔

حفیظ جالندھری: [illegible] بحث آگئی ہے۔ یہ تو ہر [illegible]
[illegible] ہو۔ [illegible] ایک گرا [illegible]
[illegible] عملی تحاویز اور منصوبی خیالات
[illegible] کارگر نہیں ہو سکتی۔ وہاں آپ کو
[illegible] ہوگا۔

چراغ حسن حسرت: [illegible] درست ہے کہ غزل کی زبان و اسلوب
[illegible] سکتے۔ شمع و پروانہ، فلک، گل و بلبل،
[illegible] وغیرہ اشارات سے عوام کے ذہن کو
[illegible] متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ ان کے
کا معیار بدل گیا ہے لیکن ان میں تفصیلات کے اظہار
کی تاب نہیں۔

سبط حسن: میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک نفری صنف ہے۔
مقصدی اور تعلیمی اغراض کے لئے شعراء کو ہمیشہ غزل کو
ترک کرنا پڑا ہے۔ جب کوئی بڑا فلسفۂ حیات یا سلسلۂ خیالات
پیش کرنا ہو تو نظم کہی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی فکری مسئلہ در پیش
ہو، وہاں آپ ایک نظم پڑھیں اور ایک غزل لیکن غزل
سے ذہنی انقلاب ہرگز پیدا نہ ہوگا۔

ابو اللیث صدیقی: مادیت کے معیار سے غزل اور نظم
کی بابت آپ کے خیالات صحیح ہیں۔ نظیر تک غزل کے
شباب کا دور رہا ہے۔ لیکن فکری مسائل کے لئے اس
زمانے میں بھی شاعروں کو شہر آشوب لکھنا پڑے۔

حفیظ جالندھری: ماؤ، بہنو، بیٹیو، غزل میں نہیں
کہا جا سکتا تھا۔

چراغ حسن حسرت: حالی کی غزل "تذکرۂ دہلی مرحوم اے
دوست نہ چھیڑ" داغ کے شہر آشوب سے زیادہ
مؤثر ہے۔

ظہیر کاشمیری: اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ غزل میں

نقائص نہیں۔ البتہ اگر تفصیلی دلائل کے ساتھ کوئی چیز بیان کی
جائے تو اس کے لئے کوئی اور فارم اختیار کرنی ہوگی۔

حفیظ جالندھری: میرا خیال ہے کہ جہاں زندگی اتنی گھٹ
جائے کہ کچھ کہنے کی پابندی ہو وہاں غزل زیادہ کامیاب
رہے گی۔ کیونکہ وہاں کنایہ سے کام لینا پڑے گا۔

سبط حسن: ہاں یہ صحیح ہے۔

چراغ حسن حسرت: تاتاریوں کے عہد میں غزل زیادہ
چلی ہے۔

صوفی تبسم: یہاں دو تین غزل گو شاعر موجود ہیں وہ اپنے
تجربات بتا سکیں گے کہ کون سا موڈ ایسا ہوتا ہے جب وہ غزل
کہتے ہیں اور کون سا ایسا جب وہ نظم کہتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی: سبط حسن کی بات دہرانی پڑے گی فکری
بحث کے پھیلاؤ کے لئے نظم اور کنایہ کیلئے غزل۔

حفیظ جالندھری: مجھے جب غزل کہنی ہوتی ہے تو میں ہر ہر
شعر کو ایک لمبی نظم یا گیت کی فارم میں سوچتا ہوں اور
اسے دو مصرعوں میں کہتا ہوں۔

ظہیر کاشمیری: مجرد خیال کوئی چیز نہیں۔ خیال جب آتا ہے
تو اپنے ساتھ سب کچھ لاتا ہے۔ بعض خیالات اس طرح
آتے ہیں کہ ان کا اظہار غزل میں لازمی ہوتا ہے اور بعض
خیالوں کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ غزل میں نہیں سماتا اور نظم
کی فارم اختیار کرنی پڑتی ہے۔ خیال کا عمل ذہن میں فارم
اپنے ساتھ لاتا ہے۔

سبط حسن: یہ تو طے ہوا۔ اب ایک دشواری مصنوعی پابندیوں
کی ہے۔ جس سے غزل کے مستقبل کا براہ راست تعلق
ہے مثلاً قوافی، ردیف وغیرہ۔ یہ پابندیاں فضا کو مصنوعی
بنا دیتی ہیں۔ کیوں کہ سارا خیال قافیہ کے تابع ہوتا ہے۔

ظہیر کاشمیری: قافیہ اور ردیف کوئی ایسی چیز نہیں جو اظہار

حفیظ جالندھری:۔ بہرحال غزل کامیاب ہے گی [illegible] کہ یہ عوام الناس تک خیالات پہنچانے کے لئے نہیں۔

ظہیر کاشمیری:۔ جب تک شاعر غم عشق کو غم دوراں نہ بنائے گا اس وقت تک غزل زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب وہ اسے غم دوراں بنا کر کہے گا تو غزل ضرور زندہ رہے گی۔

حامد علیخاں:۔ جب تک ہی کو ہم یہیں تحلیل کر کے نہ بیٹھ کیا جائے۔ ورنہ اس وقت تک غزل کا کوئی مستقبل نہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چراغ حسن حسرت:۔ ہر کامیاب شاعر ہر دور میں یہی کرتا رہا ہے۔ تدنا ر کی غزلوں کا جائزہ لیجئے جا بجا فقیہ شہر، واعظ، جاگیردار نظام کی مخالفت کی گئی ہے جس سے اس دور کی روایتی قیود و حدود کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا ہے اس لحاظ سے حافظ سب سے بڑا باغی شاعر ہے جو ایک بناؤ اور رچاؤ کے ساتھ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

محمد طفیل:۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ آج سے سترہ اٹھارہ سال پیشتر غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

حفیظ جالندھری:۔ بعض اشتراکی شعراء نے مخالفت کی تھی۔

[illegible] اشتراکی نہیں [illegible] ادبی تحریکات ہیں۔ جن میں مغربی علوم کی [illegible] کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ مغربی ادب کی تقلید میں ہمارے شعراء اس صنف سخن کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر بیٹھے تھے۔

احسان دانش:۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے خاص خاص تحریکیں تھیں۔ جن کو چلانے کے لئے عوام تک APPROACH ضروری تھی اور اس کے لئے نظم کی فارم ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ آج ہمارے سامنے مسائل ہیں۔ تحریکیں نہیں۔ تحریکیں ختم ہو چکیں۔ اس لئے نظمیں بھی ختم ہو چکیں۔ اب کوئی خاص رجحان پیش نظر نہیں۔ اب تو موجودہ ماحول کی اصلاح اور اس کے عیوب و محاسن پر اشارات کافی اثر رکھتے ہیں۔ اور غزل ان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے غزل پھر زندہ ہو گئی ہے اور یہ اسی لئے بھی زندہ رہے گی کہ اس میں زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔

محمد طفیل:۔ چند دن پہلے اردو غزل کے مستقبل پر چند ایک دوستوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ اب چونکہ بعض احباب یہاں پھر جمع ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر تھوڑی سی اور باتیں ہو جائیں۔

وقار عظیم:۔ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اگر غزل کی موجودہ زمانے تک کی ترقی پر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ بہت سی روایتی خامیاں

ترک کر دیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: [illegible] اس نے کسی حد تک نئی چیزوں کو قبول
بھی تو کیا [illegible]

[illegible] ہے کہ غزل ہر دور میں اپنے
[illegible] کے [illegible] قدر مطابقت دے
[illegible] کی خاص قدروں [illegible]
[illegible] لیکن [illegible] حیثیت
[illegible] سے واسطے سے

[illegible] اہم ہیں۔ جو اس دور میں بھی او
[illegible] اس کے اندر ملتی ہیں کہ اس نے
[illegible] کو برقرار رکھتے ہوئے ہو
[illegible] انداز کی ترجمانی کی ہے۔
[illegible] غزل کو ہر دور میں زمانے سے متاثر
[illegible] ہے اس دور میں اور اس سے پہلے بھی۔
[illegible] اس کلام میں آپ کو بیشتر خارجی انداز کی
[illegible] بھی مل جائیں گی مثلاً

[illegible] کہ در دور قمری بینم

[illegible] علما، صوفی اور واعظ کی قسم کی چیزیں معاشرہ
پر حاوی تھیں۔ اس کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے
وہ ان لوگوں سے گریز کر رہا ہے۔ اس لئے وہ حقیقتاً
ترقی پسند شاعر تھا۔ وہ روایت کی مخالفت کرتا ہے۔
مذہب کی مخالفت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بادشاہوں پر بھی
چوٹ کر جاتا ہے۔ صوفیوں اور مولویوں کو تو معاف
ہی نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی: بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس
زمانے میں داخلی انداز کی شاعری ہوتی تھی اور اس دور
کے شعراء نے تغیرات زمانہ اور ماحول کا کوئی اثر نہیں لیا۔
لیکن بعض مثالیں واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حالات
سے متاثر ہو کر اور اپنے تاثرات کو غم زمانہ بنا کر شاعری کرتے
تھے اور یہی غزل کا صحیح مزاج ہے۔

عبدالمجید سالک: جی ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً یہی شعر

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

تھا اس دور کے سیاسی حالات کا نہایت واضح تاثر
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی
UNSETTLED تھی اور سیاسی تغیرات کا اس
پر اثر ہو رہا تھا۔

عبادت بریلوی: شاعر غزل میں ان خیالات کا اظہار کرتا
ہے جو خارجی حالات کے رد عمل کے نتیجے میں پیدا
ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی ہو بہو ترجمانی
کرے۔ غزل کا عام انداز رمزیت اور ایمائیت سے
مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ رمزیت اور ایمائیت اس
بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ غزل کے اشعار میں بڑی
نہیں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر اس تمدن اور ماحول کی عکاسی
ہوتی ہے۔ غالب کی پوری شاعری اس کی مثال ہے
ان کا یہ شعر بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

کہنے کو یہ ایک انفرادی تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں
ایک پوری تہذیب کی آواز شکست کی گونج سنائی
دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی: غزل گوئی کا کمال یہ ہے کہ شاعر واقعات و
سانحات کو اشارات اور آفاقی انداز میں پیش کرتا ہے اس لئے
پر میر تقی میر و دیگر شعراء تو قیود [illegible] کہ وہ اس قسم کی شاعری
کر سکتا ہے۔

سکے پیمانے پر اثر انداز ہوں۔ سارا قافیہ خیال کے تابع ہوتا
ہے۔ شاعر جب خیال کے زور پر شعر کہتا ہے تو قافیہ اور
ردیف کا تصنع معلوم بھی نہیں ہوتا۔

حفیظ جالندھری:۔ بہر حال غزل کامیاب ہے گی بشرطیکہ
کہ یہ عوام الناس تک خیالات پہنچانے کے لئے نہیں۔

ظاہر کاشمیری:۔ جب تک شاعر غم عشق کو غم دوراں نہ بنائے
گا اس وقت تک غزل زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب وہ اسے
غم دوراں بنا کر کہے گا تو غزل ضرور زندہ رہے گی۔

حامد علیخاں:۔ جب تک ہم کو ہم اپنی تحلیل کر کے نہ پیش
کیا جائے، واقعی اس وقت تک غزل کا کوئی مستقبل نہیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چراغ حسن حسرت:۔ ہر کامیاب شاعر ہر دور میں یہی کرتا رہا
ہے۔ قدما کی غزلوں کا جائزہ لیجئے جا بجا فقیہ شہر، واعظ،
جاگیردار تمام کی مخالفت کی گئی ہے جس سے اس دور کی
روایتی قیود و حدود کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا ہے
اس لحاظ سے حافظ سب سے بڑا باغی شاعر ہے جو ایک
بناؤ اور رچاؤ کے ساتھ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

محمد طفیل:۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ آج سے سترہ اٹھارہ سال بیشتر
غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

حفیظ جالندھری:۔ بعض انتہائی شعراء نے مخالفت کی تھی۔

ظہیر کاشمیری:۔ بالکل غلط۔ مخالفت حالی، عندلیب اور کلیم
نے بھی کی ہے اور ان میں سے کوئی بھی اشتراکی نہیں۔ اس
کی تہ میں بعض سماجی محرکات ہیں۔ جن میں مغربی علوم کی نمائش
کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ مغربی ادب کی تقلید میں
ہمارے شعراء اس صنف سخن کی اہمیت ہی کو نظر انداز
کر بیٹھے تھے۔

احسان دانش:۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس
وقت ہمارے سامنے خاص خاص تحریکیں تھیں۔ جن
کو چلانے کے لئے عوام تک APPROACH ضروری
تھی اور اس کے لئے نظم کی فارم ہی موزوں ہو سکتی
تھی۔ آج ہمارے سامنے مسائل ہیں۔ تحریکیں نہیں۔
تحریکیں ختم ہو چکیں۔ اس لئے نظمیں بھی ختم ہو چکیں
اب کوئی خاص رجحان پیش نظر نہیں۔ اب تو موجودہ
ماحول کی اصلاح اور اس کے عیوب و محاسن پر
اشارات کافی اثر رکھتے ہیں۔ اور غزل ان کی متحمل
ہو سکتی ہے۔ اس لئے غزل پھر زندہ ہو گئی ہے اور
یہ اس لئے بھی زندہ رہے گی کہ اس میں زمانہ
کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔ اس
لحاظ سے اس کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔

محمد طفیل:۔ چند دن پہلے اردو غزل کے مستقبل پر چند ایک
دوستوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ اب چونکہ بعض احباب
یہاں پھر جمع ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس
موضوع پر تھوڑی سی اور باتیں ہو جائیں۔

وقار عظیم:۔ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے
ہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے
بھی یا نہیں۔ لیکن اگر غزل کی موجودہ زمانے تک کی ترقی پر
نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ بہت سی روایتی خامیاں

رنگ کر دیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ اور اس نے کسی حد تک نئی چیزوں کو قبول بھی تو کیا ہے۔

عبد المجید سالک:۔ یہ صحیح ہے کہ غزل ہر دور میں اپنے آپ کو دوسری اقدار کے ساتھ جس قدر مطابقت دے سکتی تھی اس نے دی۔ اس کی فارم تو دو ان مسلمات اور روایات میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن معنوی حیثیت سے وہ اپنا ناتی تضاد اور ابہام کے دائرے سے نکل چکی ہے۔

وقار عظیم:۔ غزل میں دو باتیں اہم ہیں۔ جو اس دور میں بھی اور اس سے پہلے بھی ہمیں اس کے اندر ملتی ہیں کہ اس نے ... ہے مزاج کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے ... زمانے کے مخصوص انداز کی ترجمانی کی ہے۔

عبد المجید سالک:۔ غزل گو ہر دور میں زمانے سے متاثر ہوتا رہا ہے اس دور میں اور اس سے پہلے بھی۔ مثلاً حافظ کے کلام میں آپ کو بیشتر خارجی انداز کی ... وہ غزلیں بھی مل جائیں گی مثلاً

... چو نیست کہ در دور قمری بینم

... میں ملا، صوفی اور واعظ کی قسم کی چیزیں ... ان ... اس کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے ... اور سے گریز کر رہا ہے۔ اس لئے وہ حقیقتاً ... شاعر تھا۔ وہ روایت کی مخالفت کرتا ہے ... مخالفت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بادشاہوں پر بھی چوٹ کر جاتا ہے۔ صوفیوں اور مولویوں کو تو معاف نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی:۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس زمانے میں داخلی انداز کی شاعری ہوتی تھی اور اس دور کے شعراء نے تغیرات زمانہ اور ماحول کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن بعض مثالیں واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے تاثرات کو غم زمانہ بنا کر شاعری کرتے تھے اور یہی غزل کا صحیح مزاج ہے۔

عبد المجید سالک:۔ جی ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً یہی شعر۔

این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

قطعاً اس دور کے سیاسی حالات کا نہایت واضح تاثر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی UNSETTLED تھی اور سیاسی تغیرات کا اس پر اثر ہو رہا تھا۔

عبادت بریلوی:۔ شاعر غزل میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جو خارجی حالات کے رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی ہو بہو ترجمانی کرے۔ غزل کا عام انداز رمزیت اور ایمائیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ رمزیت اور ایمائیت اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ غزل کے اشعار میں بڑی ... نہیں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر اس تمدن اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ غالب کی پوری شاعری اس کی مثال ہے ان کا یہ شعر بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں سب فروزاں ہو گئیں

کہنے کو یہ ایک انفرادی تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک پوری تہذیب کی آواز شکست کی گونج سنائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ غزل گوئی کا کمال یہ ہے کہ شاعر واقعات و سانحات کو اشارات اور آفاقی انداز میں پیش کرتا ہے اس طرح پر میر تقی میر کا ایک شعر اس توقع پر پیش کرتا ہوں کہ وہ اس قسم کی شاعری کر سکتا ہے

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

عبادت بریلوی:- میر تو غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تو اپنے زمانے کے حالات سے اس حد تک اثرات قبول کئے ہیں کہ غزل کا انداز تک بدل دیا ہے۔ اس زمانے کی تباہی کو سامنے رکھ کر انھوں نے نئے اشارے تک وضع کئے ہیں۔ ان کا یہ شعر

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل کی ویرانی کو نگر کے لٹنے سے تعبیر کرنا حالات کے براہ راست تاثر کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم:- تو غزل کی ایمائیت اصل چیز ہے اور ایک بڑے اور گہرے تاثر کو چند لفظوں میں بیان کر دینا ہی غزل کی خوبی ہے۔

خواجہ درد اپنے گوشہ میں بیٹھے کہتے ہیں۔

کوہکن کو نہ چھیڑ اسے پرویز
اس کے تیشے کی بھی زبان ہے تیز

عبادت بریلوی:- اور اصغر کا شعر بھی تو اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا

تو بہر حال غزل ایک روایت کا تسلسل ہے اور ایک تہذیب اور معاشرت کا تسلسل ہے۔ اور اپنی اسی خصوصیت کے ساتھ وہ آج تک زندہ ہے یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزل اب ختم ہو جائے گی جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ آزاد نظم کے عروج کے زمانے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی رفتار ارتقا مدھم ہو گئی ہے لیکن پچھلے چند سال سے غزل کی مقبولیت پھر بڑھتی جا رہی ہے اور اب یہ احساس پھر ہونے لگا ہے کہ غزل بڑی اہم صنفِ سخن ہے اور ہمارے مزاجوں سے مطابقت رکھتی ہے۔

وقار عظیم:- اس عارضی خلل یا تعطل کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی علامتیں اس کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ لیکن پھر وہ ساتھ دینے لگتی ہیں۔

عبدالمجید سالک:- اور بعض بعض شعراء کی علامتیں اتنی پختہ اور ٹھوس ہوتی ہیں کہ ہم فوراً ان کے کلام سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

ان کے اشارات اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ان کا کلام ہے۔ میں میراجی اور آزاد نظم والوں سے کہا کرتا ہوں کہ جہاں تمہیں شاہ عالمی دروازہ کہنا ہوتا ہے، وہاں تم دو ٹانگیں کہا کرتے ہو۔

(قہقہہ)

عبادت بریلوی:- موجودہ دور کی غزل میں بعض نئے اشارے (SYMBOLS) بھی پیدا کئے گئے ہیں اور پرانے اشارات کو نئے معنوں میں بھی برتا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی جو غزلیں بال جبریل میں شامل ہیں وہ اس رجحان کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس تجربے کے باوجود غزل کو غزل باقی رکھا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلیں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ ان غزلوں سے یہ حقیقت ذہن نشین ہوتی ہے کہ غزل محدود نہیں ہے

وقار عظیم:- یہ غزلیہ اشارات اور رمزیت کی مقبولیت ہی کا اثر ہے کہ اقبال کو بھی بعض اوقات مجبور ہونا پڑا

ہے کہ وہ تغزل کا رنگ نظم میں بھی اختیار کریں۔

عبدالمجید سالک:- حالی اور اقبال میں یہی فرق ہے۔ حالی خشک اور ناصحانہ انداز میں نظمیں کہتے ہیں اور اقبال ان میں تغزل کا رنگ لاتے ہیں۔

عبادت بریلوی:- اقبال کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ در حقیقت اسی مزاج نے ان کی نظموں میں تغزل کو پیدا کیا ہے "ذوق و شوق"، "مسجد قرطبہ"، "شمع اور شاعر"، "خضر راہ" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ یہ سب نئی معنویت کی حامل ہیں لیکن ان میں تغزل ہے۔

عبدالمجید سالک:- یہ ٹھیک ہے کہ اشارات و رموز تو پرانی ہیں۔ لیکن انھوں نے ان کو نئے معنی میں لیا ہے۔

وقار عظیم:- یہ خصوصیت تو ہر کامیاب شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ مثلاً اکبر کے ہاں

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
ستم کی کامیابی پہ مبارک باد دیتا ہوں
یہ ان کی بدگمانی ہے کہ فریادی سمجھتے ہیں

حبیب اشعر:- جن لوگوں نے جان بوجھ کر سیاسی شعر نہیں کہے ان کے کلام میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں۔ جو لوگ خالص غزل گو ہیں اور غزل کو صرف بازناں سخن گفتن سمجھتے ہیں۔ ان کے کلام سے بھی ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے اور تشبیہات کے پردے اٹھا کر دیکھیں تو ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

وقار عظیم:- تجربہ نکلا کہ قدیم اور جدید غزل گو شعراء غزل کے ذریعے اپنے زمانے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لئے آج بھی غزل ہی کو مقبولیت حاصل ہے۔

احمد ندیم قاسمی:- الغرض غزل کا مستقبل روشن ہے اور جیسا کہ وقار صاحب نے ابتداء میں فرمایا تھا کہ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے نظم کو عروج ہوا۔ جس کی وجہ مغربی شاعری کا اثر تھا۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی کو برا مانا گیا۔ مثلاً کلیم کی کتاب، جوش کی نظمیں، یہ سب چیزیں لوگوں کے سامنے ہیں اور موجود REVIVAL کو دیکھ کر بھی لوگ بھٹکتے ہیں۔

عبادت بریلوی:- مشاعرہ باز شاعروں نے بھی غزل کو خراب کیا ہے۔ پڑھنے کا ڈرامائی انداز اور داد دینے کا روایتی طریقہ ان سب چیزوں نے غزل کی روح ختم کر دی۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بہت سے اشعار مشاعروں میں بہت پرلطف معلوم ہوتے ہیں لیکن مشاعرے سے اٹھتے تو ان میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ غزل کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی

عبدالمجید سالک:- اقبال کہتے تھے۔ I HATE THE MUSHAIRAS THESE ARE CALCULA- TED TO VULGRISE LITERATURE.

عبدالمجید سالک:- میں نے اپنی پہلی غزل لاہور میں ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ جہاں اقبال بھی موجود تھے اس کا قافیہ تھا۔ تاروں میں ستاروں میں۔ میں نے شعر پڑھا۔

ہر کس کا نام لے کر جان دی بیمار الفت نے
یہ کس ظالم کا چرچا رہ گیا تیمارداروں میں

لوگوں نے بڑی داد دی لیکن ڈاکٹر اقبال خاموش رہے۔ اس طرح پوری غزل میں انھوں نے صرف دو شعروں کی داد دی لیکن ہم لوگوں کی داد پر نہ گئے۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی داد کو معیار رکھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ پست اشعار سے

ہماری طبیعت ہٹ گئی۔

حبیب اشعر:۔ ادب کی تاریخ میں ایسے شاعروں کا ذکر تو برابر ملتا ہے لیکن شاعروں کے لئے یہ مشاعرے معیار کبھی بھی نہیں رہے۔

عبادت بریلوی:۔ مشاعرے شعر کی معنویت کے کبھی معیار نہیں رہے۔ مشاعروں میں داد حاصل کرنے والے شعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ زندہ بھی رہے۔ بالکل یہی معیار خود غزل کا ہے۔ ایک اچھی صنف ادب کی حیثیت سے وہ ضرور زندہ رہے گی۔

عبدالمجید سالک:۔ ایک بات جو ندیم صاحب نے غزل کے متعلق اس سے پہلے کہی تھی کہ غزل کو بعض تحریکات نے دبایا تو میں یہاں کہوں گا کہ ادب کو کبھی کسی تحریک سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادب ہر ادب اور ہر صنف خود اپنے زور پر زندہ رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادب تجربوں کے تسلسل کا نام ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل نے ابتدا سے اب تک اپنے مزاج کو کافی بدل لیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ اس کی وہ ناہم آہنگی ختم ہو رہی ہے جو پہلے کسی دور میں یہ خیال تھی کہ ایک شعر زمین کا ہے اور ایک آسمان کا ایک میں زار نالی ہے اور دوسرے میں خوشی اور انبساط۔ آج کل غزل میں موڈ کے تسلسل کی رعایت کی جاتی ہے اور آئندہ کی غزل شاید اسی قسم کی چیز ہو۔

عبادت بریلوی:۔ اس قسم کی غزلیں قدما کے ہاں بھی کافی ملتی ہیں۔ مثلاً میر و غالب کی بہت سی غزلوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

حبیب اشعر:۔ بعض پرانے شعراء تو مسلسل غزلیں ہی کہتے تھے۔ مثلاً سودا۔ جرأت اور قطعہ بند بھی اسی کی ایک شکل ہے۔

عبادت بریلوی:۔ لیکن پرانے زمانے میں شعراء کو موڈ کی ہم آہنگی کا احساس بہت کم تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور بڑھتا گیا۔ موڈ کی ہم آہنگی اور تسلسل کا یہ احساس بڑھتا گیا ہے۔ اسی لئے جدید دور کی غزلیں پرانی غزلوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہیں۔

وقار عظیم:۔ مثلاً اس دور میں اگر فیض اور ناصر کاظمی کی غزلوں میں یہ خصوصیت کافی نمایاں ہو گئی ہے۔ فیض کی غزل۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

اور ناصر کاظمی کی غزل ؎

ہم نے دیکھے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کا ہر شعر اگرچہ الگ ہے لیکن ملا کر پڑھنے والوں میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی:۔ جوش کی نظم نما غزلیں بھی اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔

وقار عظیم:۔ مومن کی غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور حسرت کی غزل "آغاز محبت کا زمانہ یاد ہے" کسی ایک واقعہ کی ترجمان معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اسے مسلسل غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ لیکن مسلسل غزل موڈ کی ہم آہنگی سے ایک الگ چیز ہے۔ موڈ کی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہے کہ غزل کے تمام اشعار میں ایک خاص ذہنی کیفیت موجود ہو۔ چاہے جذبات و کیفیات میں کتنا ہی تنوع موجود ہو مسلسل غزل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی

خاص واقعہ یا ذہنی کیفیت ایک ایسے تسلسل کے ساتھ
بیان کی جائے جس کو تمام اشعار ایک وحدت کی صورت
میں ظاہر کریں۔

حبیب اشعر:۔ یہ اسی چیز سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے جسے قطعہ
کہتے ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ جی ہاں۔

وقار عظیم:۔ غزل مسلسل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر
اس کا ایک شعر نکال دیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز
کم ہے۔ لیکن ایک موڈ کی غزل میں یہ بات نہیں ملے گی۔

احمد ندیم قاسمی:۔ مسلسل غزل کے سلسلے میں ذاتی طور پر میں سوچتا
ہوں کہ غزل کی یہ خصوصیت کہ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہو آئندہ
برقرار نہ رہ سکے گی۔ اور وہ نظم کے قریب قریب
پہنچ جائے گی۔

عبادت بریلوی:۔ نظم اور غزل میں فرق ہمیشہ باقی رہے گا
غزل کی تکنیک نظم سے بالکل مختلف ہے۔ غزل میں موڈ
طور پر موڈ کی ایک وحدت ہوتی ہے لیکن اس کا ہر شعر
بھی اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس میں
بہر حال باقی رہنا چاہیے ورنہ وہ یقیناً نظم ہو
جائے گی۔

عبدالمجید سالک:۔ مسلسل غزلوں یعنی ایسی غزلوں کا تناسب
جو ایک موضوع سے متعلق ہوں —— موجودہ شعرا
کے ہاں زیادہ نہیں۔ مرزا غالب کے ہاں زیادہ ہے۔

عبادت بریلوی:۔ نوجوانوں کے ہاں بھی مسلسل غزلیں کم
ہیں۔ موڈ کی ہم آہنگی کی غزلیں زیادہ ہیں۔ فیض اور ناصر
کاظمی کی غزلیں اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

حبیب اشعر:۔ ایسی غزلیں قدما کے یہاں بھی ملتی ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدما شعوری
طور پر ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا
ضروری بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود جذبے کی
شدت اور خلوص نے اس صورت حال کو پیدا کیا ہے۔ میر
کی غزلوں میں یہ خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔
مثلاً میر کی یہ غزل ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں　　تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے　　یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ لیکن یہ تو ایک ایسی غزل
ہے جس میں اشعار کم و بیش ایک ہی طرح کے خیالات اور
جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ بعض غزلیں ان کے
یہاں ایسی بھی ہیں جن میں خیالات اور جذبات و احساسات
مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں موڈ
کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی مشہور غزل ہے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کاش اب برقعہ منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
کیا، اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

یہ تمام اشعار مختلف خیالات اور متنوع جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک وحدت پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب ناکامی حسرت اور مایوسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی پس منظر نے اس غزل میں موڈ کی ہم آہنگی کو پیدا کیا۔

وقار عظیم:۔ جب آپ نے دوسری غزل کا ذکر کیا تھا تو میں یہ سمجھا تھا کہ آپ یہ اعتراض کریں گے کہ اس میں موڈ کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو ہے۔

عبادت بریلوی:۔ ظاہر ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی متنوع ہونے کے باوجود اس میں ایک ہمواری بھی ہے۔

حبیب اشعر:۔ تمام مستند غزل گوؤں کے ہاں فکر اور موڈ کی وحدت ملتی ہے۔

عبادت بریلوی:۔ بیشک ملتی ہے لیکن اس کو محسوس کرنے کے لیے ایک مخصوص ذہنی اور جذباتی تربیت کی ضرورت ہے۔ غزل اس تربیت کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء اس ہم آہنگی کو غزل کا لازمی جزو نہیں سمجھتے تھے لیکن جو باشعور تھے ان کے یہاں یہ چیز ضرور پیدا ہوئی ہے جو شخص خود ایک کہنے کا شعور رکھتا ہے صرف اس کی غزل میں دشواری پیش نہیں آ سکتی۔

عبدالمجید سالک:۔ میر کے ہاں کہیں کہیں یہ ہم آہنگی نہیں بھی ملتی۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

مفت آبروئے زاہدِ علامہ لے گیا
اک مغبچہ اُتار کے عمامہ لے گیا

میر ہی پر کیا منحصر ہے، تقریباً تمام غزل گو شعراء کے یہاں یہ صورت حال ملتی ہے۔ میر کا شعر زیادہ عجیب معلوم ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ شگفتگی میر کے یہاں بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ اس حزن و یاس کا ردِ عمل ہے جو میر کے یہاں شیخ اور واعظ پر کہیں کہیں جو پھبتیاں ملتی ہیں۔ وہ اسی ردِ عمل کے اظہار کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے لیکن بہرحال موڈ کی ہم آہنگی کا اس میں کوئی تعلق نہیں۔

وقار عظیم:۔ اس میں قافیہ پیمائی کو بھی بڑا دخل ہے۔ قافیہ کی کمی پوری کرنے کے لیے انہیں مجبوراً دو چار شعر زبردستی کے کہنے پڑتے تھے مثلاً اسی وزن پر علامہ ایک قافیہ تھا جسے باقی غزل کہنے کے بعد شاعر نے مطلع میں عمامہ کے ساتھ جوڑ دیا۔

عبادت بریلوی:۔ آج کل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کر لی ہے۔ اور اس کے مطابق شعر ڈھالے جا رہے ہیں۔

حبیب اشعر:۔ سہ غزلے اور چار غزلے یہ سب اسی قافیہ پیمائی کی پیداوار تھے۔

عبدالمجید سالک:۔ بعض بعض جگہ تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ ARTIST نہیں تھے بلکہ ARTISAN تھے۔ اور شعر قافیہ کے مطابق ڈھالا کرتے تھے۔

عبادت بریلوی:۔ آتش نے تو اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کو یہ لوگ مرصّع سازی سمجھتے تھے۔ اس زمانے کا
یہی معیار تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنویت کا خیال
ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ وہ معنویت کا خیال بھی رکھتے تھے
لیکن الفاظ کی اہمیت بھی ان کے نزدیک کم نہیں تھی۔ اور
شاعری میں الفاظ کے استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔
بات درحقیقت یہ ہے کہ قافیہ پیمائی وہیں پیدا ہوتی
ہے جہاں جذبے کی شدت اور احساس کا خلوص نہیں
ہوتا۔ غزل کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اسی
لئے غزل کے بارے میں امداد امام اثر نے واردات
تجربہ اور موزونیٔ ذہنیہ کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ صحیح
ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ قافیہ پیمائی بن جاتی ہے۔

عبدالمجید سالک: غزل کے لئے ریاضت ضروری ہے۔
غزل خاصے ریاض کی چیز ہے۔

عبادت بریلوی: غزل میں واقعی ریاضت کی ضرورت تھی
اور ہے۔ ہمارے نوجوان شعراء میں اس کی زبردست
کمی محسوس ہوتی ہے اور اس نے انہیں خراب کیا ہے۔
صرف چند غزلیں لکھ کر وہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ استاد ہو گئے۔
اسی وجہ سے ان میں سے بعض تو قافیہ پیمائی کی صلاحیت
بھی نہیں رکھتے۔

عبدالمجید سالک: ان نوجوانوں کو پریس نے بھی بہت
خراب کیا ہے۔ اچھا برا، رطب و یابس سب اس قسم
کا کلام چھپ جاتا ہے۔ نوجوان پہلی ہی دوسری غزل
کہنے کے بعد پریس کی طرف بھاگتے ہیں۔

وقار عظیم: غزل کی ایمائیت، گہرائی اور گیرائی، معنویت اور
دیگر تقاضوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے
زبان پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔

عبادت بریلوی: صرف غزل ہی پر کیا منحصر ہے۔ زبان پر
عبور تو ہر صنفِ ادب کے لئے نہایت ضروری ہے۔
کولرج نے شاعری کے بارے میں جو (BEST
WORDS IN BEST ORDER) کہا ہے وہ
بالکل صحیح ہے۔ نوجوان شعراء کو اس طرف توجہ کرنے
کی ضرورت ہے۔

عبدالمجید سالک: نظم و نثر کے جمالیاتی پہلو اور زبان دانی
کی طرف بالارادہ خصوصاً شعراء کو انتہائی توجہ دینی چاہئے۔
جس کی آج کل بے حد کمی ہے۔ حسنِ بیان، حسنِ زبان، حسنِ
ترتیب ایک اچھے شاعر یا ادیب کی یہی صفت ہونی چاہئے۔

وقار عظیم: اس گفتگو سے یہ خاص بات نمایاں ہوتی کہ ہمارے
بہت سے نوجوان غزل گو اندازِ بیان اور زبان کی طرف
توجہ نہیں کرتے ہیں۔ اور اگر چندے ان کا یہی حال رہا تو
غزل ترقی نہیں کر سکے گی۔

عبدالمجید سالک: قدما ہر شاگرد کو دواوین کے مطالعہ
کی نصیحت کرتے تھے۔ آج کل یہ چیز مفقود ہے۔ پھر
اصلاحِ سخن کا رواج بھی ایسا نہیں۔ اور یہ چیز غزل اور
شاعری کے مستقبل کے لئے کوئی نیک فال نہیں۔

عبادت بریلوی: قدما کے کلام کے مطالعہ اور موازنہ کے
بغیر غزل کی روایت کا صحیح احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ غزل
کا مزاج اور انداز، اس کی مخصوص فضا اور مخصوص علامتی زبان
یہ تو [illegible] اساتذۂ قدیم کے [illegible] مطالعہ ہی سے
پیدا ہو سکتی ہیں۔

وقار عظیم: اس کی بعض زندہ شہادتیں موجود ہیں۔ یہ شعراء ہمارے
جدید شعراء میں جنہوں نے فارسی کا مطالعہ کیا ہے۔
ان کے ہاں بڑی رچی ہوئی غزلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً
فیض اور راشد۔

عبدالمجید سالک: لیکن راشد صاحب ایران جانے سے

پہلے زیادہ اچھی فارسی ترکیبیں لکھتے تھے۔ (قہقہہ)

عبادت بریلوی :۔ سالک صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ غزل میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ ایک اچھا رواج تھا۔ اس سے مشق ہوتی تھی اور نوجوان محنت کرتے تھے جس سے اس کا ہونا آج بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو غزل ناتجربہ کاروں کی تختۂ مشق بنتے بنتے پست ہو جائے گی۔

عبدالمجید سالک :۔ جی ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ فی زمانہ نکاتِ سخن اور رموزِ سخن کی قسم کی چند کتابیں موجود ہیں لیکن ان سے اتنا کچھ میں نہیں آتا جو اساتذہ کی اصلاح اور عملی ہدایات سے آتا تھا۔ اور موجودہ شاعر تو ان کتابوں کو بھی نہیں پڑھتے۔

وقار عظیم :۔ آج کل کے شاعر قدیم اساتذہ کو پڑھتے تو ہیں۔ اور میر سے معذرت کے ساتھ، کے عنوانوں سے ان کے ڈھنگ میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبادت بریلوی :۔ بلکہ بعض اپنی غزلوں پر "بطرزِ میر" لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ میر سے انھیں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

عبدالمجید سالک :۔ اسی لئے تو لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ بطرزِ میر نہیں ہوتیں۔ اور افسوس نے میر کو پوری طرح پڑھا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر وہ میر کو پڑھ لیں تو میر کا طرز خود ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی :۔ موجودہ شعرا میں زبان کے علاوہ فکر کی کمی بھی ہے۔

عبدالمجید سالک :۔ فکر کی کمی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ یہ تو علم اور مطالعہ کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور مطالعہ اور علم سے استفادہ کرنا ہی اس کا واحد حل ہے۔

عبادت بریلوی :۔ موجودہ دور کے شعراء کا اندازِ فکر ذرا مختلف ہے۔ سماجی اور عمرانی مسائل پر ان کے ہاں فکر کی کمی نہیں۔ ہاں مابعد الطبیعاتی انداز اور فلسفیانہ انداز جو غالب کے ہاں بیشتر ہے۔ اس کی کمی ضرور ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء کو سماجی اور عمرانی مشکلات کا احساس ہے۔ اور بہت سے شعراء کے کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے وقت کے سماجی حالات سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں۔

حبیب اشعر :۔ احساس تو ہے لیکن علاج اور حل ان کے پاس کوئی نہیں۔ ویسی روشنی جو اقبال کے کلام سے نظر آتی ہے، ان کے کلام سے نہیں حاصل ہوتی۔

عبادت بریلوی :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کوئی ایسا واضح نصب العین لوگوں میں پیدا نہیں ہوا جیسا کہ اقبال کے ہاں تھا۔

عبدالمجید سالک :۔ اب تو جمہوریت ہر چیز کو تباہ کر رہی ہے۔ ادب، مذہب، سیاست، سب کو اس جمہوریت نے خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے۔ اور یہی نصب العین کے فقدان کی ذمہ دار ہے۔

وقار عظیم :۔ فراق جیسے شاعر کے ہاں بھی زندگی کی کشمکش کا احساس تو ہوتا ہے لیکن کوئی بڑی ہمہ گیری ان کے ہاں بھی نہیں۔

حبیب اشعر :۔ اقبال کو بھی چھوڑیئے۔ اصغر کے ہاں رجائیت ہے۔

احمد ندیم قاسمی :۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اصغر کے ہاں رجائیت بالکل نہیں بلکہ اپنے کو کھو دینے کا احساس ہے۔

عبادت بریلوی :۔ میرے خیال میں یہاں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ شاید حبیب اشعر صاحب کی مراد یہ ہے کہ اصغر کے یہاں جو ایک سرمستی پائی جاتی ہے اور ایک والہانہ انداز

نظر آتا ہے وہ غزل میں بالکل نئی چیز ہے۔ اصغر نے
غزل کو بالکل ایک نیا انداز اور آہنگ دیا ہے ان کی ساری
شاعری میں پھول سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔
وقار عظیم:۔ اصغر کے ہاں یہ احساس پہلی بار ہوتا ہے۔
حبیب اشعر: یہی میری مراد ہے۔
عبادت بریلوی:۔ حبیب اشعر جو بات کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔
بعض نوجوان شاعروں کے ہاں ماحول کی قنوطیت کا اثر
ہے۔ مثلاً جذبی، ناصر کاظمی کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے
کہ ان پر غم، حزن و یاس کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ شاید
یہ سیاسی اور سماجی ماحول کا اثر ہے۔
وقار عظیم:۔ ماحول کی قنوطیت نے لوگوں پر بہت کچھ اثر کیا
ہے۔ ملک کی تقسیم سے لوگ ادھر اُدھر بکھر گئے اور تقریب
قریب ہر شاعر نے اس پر اظہار خیال کیا ہے
مثلاً احسان کا یہ شعر ؎

میں دیوانہ بھلا مجھ کو مرے صحرا میں رہنے دو
کہ میں پابند آداب گلستاں ہو نہیں سکتا

اسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔
عبادت بریلوی:۔ لیکن یہ قنوطیت سب کے یہاں نہیں ہے۔
جگر صاحب کے یہاں بھی یہ رجحان پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس
رجحان کو پیش کرتے ہوئے وہ قنوطی نہیں ہوتے۔ ان کے
دو شعر مجھے یاد آ رہے ہیں ؎

صحن کعبہ نہ سہی کوئے صنم خانہ سہی
خاک انسانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی
تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکست خم و خمخانہ سہی

یہ اشعار گزشتہ چند سال کے سیاسی معاملات کو پیش
کرتے ہیں لیکن ان میں رجائی نقطۂ نظر اور رجائیانہ انداز
ہے۔ یہ بھی یہ غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔
وقار عظیم:۔ یہ تو غزل کا رچا ہوا انداز ہے۔ اقبال کے متعلق جو
کچھ ہم کہہ رہے تھے اس میں شخصیت اور کردار کو بھی بڑا دخل
ہے۔ موجودہ دور میں اخلاقی اقدار کا کوئی احساس نہیں۔ اس
لئے اقبال کے ہاں جو پیغام ہے اور احساس کے ساتھ
علاج ہے وہ موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں اسی وجہ
سے کم ملتا ہے۔
عبادت بریلوی:۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کے شعور
میں وہ ارتقائی کیفیت ہے جو اقبال کے یہاں تھی۔ نوجوان
شعراء کی غزلوں میں اسی وجہ سے واضح نقطۂ نظر نہیں ملتا۔
حزن و یاس کی کیفیت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔
عبدالمجید سالک:۔ شدت احساس جو ہمارے شعراء کے ہاں
ملتی ہے وہ بھی عارضی ہے اس کے پیچھے فکر نہیں۔ اگر یہ
عارضی نہ ہو تو یہ ملائکہ کا مجمع بن جائیں۔
(قہقہہ)
اقبال کے ہاں یا ن م راشد کے ہاں کہیں کہیں سارے کلام میں انڈر
کرنٹ موجود ہے
عبادت بریلوی:۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضرور محسوس ہوتا ہے
کہ نوجوان شعراء اپنے زمانے کے مسائل سے متاثر ہوتے
ہیں۔ اور ان مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بناتے ہیں۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں فکر کی گہرائی اور شعور
کی پختگی ہو۔ کیونکہ شاعری صرف جذبات کی برانگیختگی کا نام نہیں
ہے۔ جدید تنقید اس کے لئے فکر و شعور کو بھی لازمی قرار
دیتی ہے۔ اگر ہمارے نوجوان شعراء نے اس طرف توجہ
نہیں کی تو ان کی غزلوں میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔
سالک:۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر ان پر جذبہ وارد بھی ہوتا
ہے اور یہ فکر بھی کرتے ہیں تو اس کو بیان نہیں کر پاتے۔

چوٹ ذہنی ہے۔ درد کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن صحیح اظہار کی صلاحیت نہیں۔

عبادت:۔ غزل گو نوجوان غزل گو شعراء سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے متفکرانہ انداز پیدا نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ ماحول روح کش ہے۔ نوجوان شعراء زندگی کی تلخیوں سے گھبراتے ہیں۔ انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی زندگی اور ادب دونوں میں ایک فرار کی ذہنیت نظر آتی ہے۔ ان کی غزلیں بھی غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ ماسی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

وقار:۔ اسے ہم مان بھی لیں کہ ابھی شاید ایسا ماحول نہیں جو فکر کے لئے سازگار ہو۔ تاہم فنی پہلو تو بہرحال لازمی ہے۔

سالک:۔ جیسا کہ عبادت صاحب نے فرمایا لوگ پڑھتے ہی نہیں۔ اور اسی لئے فکر کی کمی نظر آتی ہے۔

وقار:۔ اور شاید کچھ معاشی بدحالی بھی اس کی وجہ ہے۔

ندیم:۔ فکر کی کمی کا الزام موجودہ معاشی بدحالی پر نہیں ڈال سکتے۔ حافظ کا دور بھی ایسا ہی تھا۔ گذشتہ پندرہ سال میں ترقی پسند مصنفین نے اسے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

عبادت:۔ آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ انسان کی بڑائی تو یہ ہے کہ ماحول کا اسیر ہو کر نہ رہ جائے۔ اس پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جدید غزل گو شعراء کے لئے یہ ضروری ہے۔ ایسے شعراء بھی ہمارے یہاں موجود ہیں۔ جنھوں نے اسے صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔

سالک:۔ لیکن کم ہیں اور ہر دور میں ایسا ہوتا ہے۔ پچاس ہزار شاعروں میں سے پانچ باقی رہ جاتے ہیں۔ باقی شعراء زندہ نہیں رہتے۔

عبادت:۔ غزل کی تاریخ سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے باقی رہنے والے وہی شعراء ہوتے ہیں جن کے یہاں زندگی کا شدید احساس اور حالات کا صحیح شعور ہوتا ہے۔ اور جو ان سب کو غزل کے انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

جیب اشعر:۔ اسی کو ایک عمومی انداز کہہ سکتے ہیں۔

سالک:۔ غزل کے لئے یہ عمومی کیفیت ضروری ہے۔

عبادت:۔ غزل میں فکر کے ساتھ بھی یہ عمومی انداز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں یگانہ کی شاعری اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ فانی کے یہاں بھی اس کی کمی نہیں ہے۔

سالک:۔ یہ صحیح ہے لیکن جس زمانے میں آتش گزرے اس زمانے میں آتش ہی کیوں استاد مانے گئے۔ حالانکہ کئی اور شعراء تھے۔

اشعر:۔ بقلائے مصلح

سالک:۔ بقلائے مصلح ٹھیک ہے لیکن اس کے اسباب دیکھئے نا۔ وہی تعلیم، فکر، مشق اور صحت کا اثر ہے۔

اشعر:۔ ہاں یہ ضروری چیزیں ہیں

سالک:۔ میاں بزواتی کے یہاں بخصوصیات ملتی ہیں۔ لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

عبادت:۔ وقار صاحب نے ان پر ایک مضمون لکھا ہے۔

(قہقہہ)

وقار:۔ وہ جو سروائیول آف دی فٹسٹ کی بات ہو رہی تھی آج کل کے سینکڑوں شعراء میں ایسا معیاری شاعر کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ڈیا کریں غزل ہوتی ہے۔ اس سے تو HIGH BROW ATTITUDE ٹھیک تھا۔ امیر مینائی اسی لئے مراغنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سالک:۔ جی ہاں ستیاناس ہو گیا اتنے بڑے شاعر کا۔

وقار:۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سیدھے مولوی تھے۔

عبادت:۔ امیر مینائی مولوی ضرور تھے لیکن ماحول نے انہیں

خوب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماحول کے اسیر ہو گئے۔
لکھنؤ کے دو سالہ قیام میں انھوں نے اپنے آپ کو
طبعی تقاضوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ قیصر باغ کی
تعریف میں انھوں نے اس طرح کے شعر کہے۔

پاؤں کا بیاں ذکر کیا صاف ہے ایسی زمیں
دل پستے ہیں سر بازار قیصر باغ میں

یہ علم پور میں انھوں نے داغ کی تقلید کی۔ اسی نے
انھیں خراب کیا۔ کاش وہ صوفی رہتے۔

وقار:۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن ساحر اس کے بالکل برعکس
ہیں۔ وہ نیک آدمی تھے لیکن تجربات کے اظہار کے لیے
شعر کہے کوئی جواب نہیں۔ حالانکہ کبھی شراب کو منہ نہ لگایا۔

عبادت:۔ نئے شعرا میں بھی کا خاص ذکر ہوا ہے۔ بعض شعرا
ایسے بھی ہیں جو زندگی سے بھرپور غزلیں لکھتے ہیں اور انھیں
دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بعض شعرا نے جذبات کے
اظہار میں حالات سے ایسی مطابقت باقی رکھی ہے کہ
معلوم ہوتا ہے بالکل ڈوب کر لکھا ہے۔ پوری سماجی
طبقاتی الجھنوں کا بیان اور زندگی کے معاملات کا اظہار
ان کے ہاں ملتا ہے۔ اسی احساس نے ان کی غزلوں میں
غم جاناں کو غم دوراں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ جدید غزل
کا سب سے اہم رجحان ہے اور اس رجحان نے اس کو
حقیقت سے قریب کیا ہے۔

سالک:۔ جی ہاں یہ حقیقت چھپائی نہیں معلوم ہوتی۔

وقار:۔ بہت سی باتیں اگرچہ غزل کے لئے اس دور میں سازگار
نہیں لیکن بعض کرنیں ضرور دکھائی دیتی ہیں اور اسی لئے ہم
کہتے ہیں کہ غزل کا مستقبل روشن ہے۔

عبادت:۔ جدید غزل نے بہت سے اضافے کئے اور غزل کو حقیقت
سے قریب کیا ہے اور اسی سے ہم غزل کی ترقی اور اس کے
آئندہ امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سالک:۔ حقیقت کی طرف آنا ہی غزل کی ترقی کا ثبوت ہے۔

عبادت:۔ بہرحال نوجوان شعرا بالکل گروہ بندی نہیں ہیں۔ انھوں
نے غزل کو کھلا ہے اس کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی
کوشش کی ہے اور اس میں اظہار و بیان کی نئی راہیں نکالی ہیں۔

سالک:۔ لیکن نقادوں کو غافل نہیں رہنا چاہئے۔ کوتاہی ضرور
کرنی چاہئے۔ (قہقہہ)

وقار:۔ سوچ اور فکر ضروری ہے۔ نوجوان شعرا کو چاہئے کہ وہ
پوری روایت کو اپنے اندر جذب کریں اور بیان میں زور اور
رچاؤ پیدا کریں۔

سالک:۔ زمانے کی رفتار کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس وقت جو
ذہنیت تن آسانی اور سہل انگاری کی ہے اسے ترک کرنا
ضروری ہے۔ ہر صنف محنت چاہتی ہے۔

ندیم:۔ قدما کی کوششوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ مجھے
میر درد کی ایک تشبیہ بہت ہی بھاتی ہے۔

جدھر گزرے ہے پھیرا دھر سے   آواز کہسار جیسے ہم

ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

وقار:۔ مجموعی حیثیت سے غدر کے بعد سے آج تک دیکھیں تو آجکل
کے شعرا کے ہاں اکثر اچھے شعر ملتے ہیں۔

ندیم:۔ شاید اس لئے کہ پڑھنے والا اسی دور کا آدمی ہے۔

سالک:۔ بہر حال یہ ہے کہ فکر ترقی کر گئی ہے۔

وقار:۔ بہرحال غزل امتحان سے گزر رہی ہے۔ اسے ٹھیک طور سے برتنا
چاہئے۔ غزل میں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے۔

عبادت:۔ غزل میں زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے اسی نے
اس کو زندہ رکھا ہے۔ موجودہ دور کی غزل میں جو انقلاب انگیز
تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ آج اس میں نئے
اشاروں اور نئے کنایوں کی فراوانی ہے۔ اسی نے اس میں

نئی [illegible] کو پیدا کیا ہے [illegible] موجودہ حالات
سے مطابقت رکھتی ہے۔ اقبال کے وقت سے اس کا آغاز ہوتا
ہے۔ بعد کے نوجوان شعرا میں فیض، ناصر کاظمی اور مجروح نے
اس سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔

وقار:- جدید غزل ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

عبادت:- جدید غزل گو شعرا پر غور کرتے ہوئے ایک بات ضرور کھٹکتی
ہے وہ یہ ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہتے۔ ان کی حیثیت
شعلۂ مستعجل کی ہوتی ہے۔ متقدمین کی تخلیقی کاوشوں کا سلسلہ
خاصے عرصے تک جاری رہتا تھا۔ موجودہ دور میں شعرا چند
غزلیں لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

وقار:- یہ غزل ہی پر منحصر نہیں۔ افسانہ کا بھی یہی حال ہے۔

عبادت:- اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ ناسازگار
حالات اعصاب کو مضمحل کر دیتے ہیں اور اس سے تخلیقی صلاحیتیں
ختم ہو جاتی ہیں۔

وقار:- ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوان شعرا محنت نہیں کرتے۔ چند غزلیں
لکھ کر اپنے آپ کو استاد سمجھ لیتے ہیں۔

سالک:- معاشی مشکلات بھی اس کا ایک سبب ہیں۔ یورپ میں مصنف
عرصہ دراز تک تخلیق میں منہمک رہتے ہیں۔ برنارڈ شا کی مثال ہمارے
سامنے ہے۔

عبادت:- لیکن اس کے باوجود جدید غزل کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے
اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے اور اس طرح ایک نئی معنویت کو پیدا کیا ہے۔
حزن و یاس کے باوجود اس میں زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے کی
خواہش نمایاں نظر آتی ہے۔ اصغر نے اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریادِ ماتم کی

ندیم:- یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے جو وابستۂ غم بھی نہ ہوئے

عبادت:- زندگی کو ہم نے اس سے [illegible] کا پہلو جو آج
جدید غزل میں پایا جاتا ہے اس کے اثرات [illegible] کے
یہاں ملتے ہیں۔ ان کے اس شعر میں ؎

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم [illegible]
[illegible] بہار کا موسم

خیال کو صحیح ثابت کرتا
ہے۔ اس اعتبار سے جدید غزل قدیم غزل سے آگے نظر آتی
ہے اور یہی ثبوت ہے کہ وہ آگے بڑھ رہی ہے اور آئندہ
بھی آگے بڑھتی جائے گی۔

سالک:- غزل کی زندگی کا یہی ثبوت ہے جو صنف انقلاب
کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ
سکتا۔ وہ زندہ رہے گی۔

عبادت:- غزل نے انقلابات زمانہ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ
کیا ہے۔ اس میں تجربے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ان تجربات
میں انتہا پسندی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل
کی صنف انتہا پسندی کو روا نہیں رکھتی۔ نظم میں جو تجربات
ہوئے ہیں اس کا عکس غزل میں نہیں ملتا۔ لیکن تجربات ہوئے
ضرور ہیں۔ یہ تجربات نئی اشاریت، نئی ایمائیت، نئے انداز
اور نئے آہنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

سالک:- نئے انداز اور آہنگ میں ہندی کی بحروں کو بھی خاصا
دخل ہے۔ اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی
ضرورت ہے۔

عبادت:- بحروں کے استعمال کا شعور موجودہ دور کی غزل
میں بہت بڑھا ہے۔ ہندی کی بحروں کے استعمال میں خاصے
تجربے کیے گئے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے بحریں استعمال
کی گئی ہیں۔

سالک:- اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل ترقی کر رہی ہے اور
آئندہ بھی اس کے لیے ترقی کا امکان ہے۔ لیکن نقادوں کو
غافل نہیں رہنا چاہیے۔

شعرائے متغزّلین

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

جن جن شعرائے کرام کی غزلیں "غزل نمبر" میں شائع ہوئی ہیں ان کے مختصر حالات زندگی جس وقت مجھ سے مرتب کرنے کیلئے مدیر صاحب "نقوش" نے فرمائش کی تو میں نے اسے معمولی کام سمجھ کر حامی بھر لی لیکن جس وقت کام کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا میں سمجھا تھا۔ بیسیوں تذکروں، تاریخوں، رسالوں اور اخباروں کو کھنگالنا پڑا تب جا کر چھ ماہ کی مدت میں کچھ حالات جمع ہو سکے۔ میں نے اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے بھی اس کام میں مدد لی اور خود بھی یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کے چکر لگائے اور جہاں سے جو کچھ ملا جمع کرتا رہا۔ بعض شعراء جن کے حالات کہیں لکھے ہوئے نہ مل سکے ان سے خود بھی ملا اور اپنے احباب کو بھی ان کے پاس بھیجا تب جا کر بہت تگ و دو اور تلاش و تفحص کے بعد میں یہ حالات ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اب بھی اگر کسی محترم بزرگ کے حالات اس میں آپ کو نظر نہ آئیں تو اس کی وجہ صرف یہ سمجھیں کہ مجھے باوجود کوشش کے ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

میں نے اس تذکرہ کے مرتب کرنے میں اگرچہ بہت اختصار سے کام لیا ہے مگر اس امر کو ضرور ملحوظ رکھا ہے کہ اختصار میں بھی جامعیت پیدا ہو جائے اور کسی شاعر کے حالات میں سے کوئی اہم اور ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔ جہاں کسی شاعر کے سنہ پیدائش یا سنہ وفات کے بیان میں اختلاف تھا وہاں حتی الامکان تلاش و تحقیق کر کے ٹھیک سنہ یا مستند سنہ اس تذکرہ میں درج کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اوراق ایک جدید تذکرہ شعراء کے حامل بن گئے ہیں جو امید ہے کہ شعر و سخن کے شائقین اور شعراء کے تذکروں کے طالبین کے لیے اچھے مواد کا کام دیں گے۔

میں نے اس تذکرہ کی ترتیب شاعروں کے تخلص کا خیال کرتے ہوئے حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے یعنی آپ کو جس شاعر کا حال دیکھنا ہو اس کا بیان شاعر کے تخلص کے لحاظ سے دیکھیں نہ کہ نام کے لحاظ سے اور اس تخلص میں حروف تہجی کی ترتیب کا خیال رکھیں۔ ترتیب کی بعض اور صورتیں بھی پیش نظر تھیں مگر تخلص کے لحاظ سے حروف تہجی کی ترتیب ہی نسبتاً آسان اور بہتر معلوم ہوئی اس لیے وہی اختیار کی گئی۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس ترتیب کو پسند فرمائیں گے البتہ اس کے تین حصے ہیں، پہلے حصہ میں پرانے شعراء، دوسرے میں [illegible] اور تیسرے میں وہ جو باقی رہ گئے تھے۔

حالات شعراء کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ آخری بات بھی عرض کر دوں کہ میں نے شعرائے کرام کے سوانح تلاش کرنے میں اپنی طرف

سے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا اور بغیر اس خیال کے کہ کسی شاعر کا حال تلاش کرنے میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے، اس کام کو کیا ہے۔ قدیم اور مشہور شعراء تو تقریباً سب آگئے اور ان کے کم و بیش حالات مل گئے۔ بالکل جدید اور موجودہ شعراء کے حالات فراہم کرنے کی بھی انتہائی سعی کی گئی مگر افسوس ہے کہ اس کوشش میں سو فی صدی کامیابی نہیں ہوئی اور بعض کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے جس کے لیے ہم ان سب اصحاب سے معذرت خواہ ہیں کیونکہ ان کے سوانح نہ کسی جدید تذکرۃ الشعراء میں مل سکے نہ کسی اور ذریعے سے حاصل ہو سکے اس لیے میں باوجود خواہش کے ان کو اس تذکرہ میں شامل کرنے سے قاصر رہا۔

آبرو :- نجم الدین نام عرف شاہ مبارک تخلص آبرو۔ درویش منش، قلندر مشرب اور حسن پرست انسان تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد ہیں۔ وطن گوالیار تھا۔ طبقۂ اول کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ صاحب دیوان تھے لیکن کلام تلف ہوگیا۔ لچھمی نرائن اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعراء میں ان کے بہت سے اشعار تلاش کر کے نقل کیے ہیں۔ [illegible] میں بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی وفات پائی۔

آتش :- خواجہ حیدر علی نام، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ آبائی وطن دہلی تھا مگر ان کے والدین ترکِ وطن کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ کرتے تھے۔

والد کی وفات چونکہ صغر سنی میں ہو گئی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بڑے ہو کر نواب میر محمد تقی کی سرکار میں سپاہی بھرتی ہو گئے جوان کو [illegible] کے قریب لکھنؤ میں لے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ یہیں مصحفی کی شاگردی کی اور شاعری میں نام پیدا کیا۔ سرکار اودھ سے اسی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جو پورا چار دن بھی نہ رہتا اور مہینے کے باقی دن قرض پر گزارہ چلتا تھا۔ مزاج میں توکل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جو کچھ آتا خرچ کر دیتے اور کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے۔ ننگے بدن صرف ایک لنگوٹ باندھے سارا دن ایک جھلنگے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مٹی کا [illegible] سامنے رکھا رہتا تھا۔ جو آتا اس کے سامنے یہ حقہ پیش کر دیا جاتا۔ بھنگ کا بھی شغل جاری رہتا تھا۔ خوب گھٹتی تھی اور خوب پی جاتی تھی۔ وضع سپاہیانہ تھی جب مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتے تو تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ [illegible] (بقول صاحبِ مراۃ الشعراء [illegible]) میں پیدا ہوئے اور [illegible] میں انتقال کیا۔ دو دیوان چھوڑے جو تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بعض نامور شاگرد یہ تھے۔ سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی جلیل، مرزا عنایت علی بسمل اور پنڈت دیا شنکر نسیم۔

اثر :- شمس العلماء نواب امداد امام اثر [illegible] اگست [illegible] کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ ان کی شاعری فطری جذبات اور محققانہ مسائل سے معمور ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ بڑے معرکے کی ایک کتاب کشف الحقائق کے نام سے بھی لکھی ہے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

میر اثر: ۔ سید محمد میر المتخلص بہ اثر۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور فقیری اور شاعری دونوں میں اپنے بھائی کے پیرو اور مرید۔ کلام اگرچہ صاف اور سادہ ہے مگر درد اور اثر میں میر درد کے برابر نہیں۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں "مضامین کو دیکھئے تو اس میں تصوف ہے نہ اخلاق۔ نہ حکمت ہے نہ فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کردی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔" دیوانِ اثر کو مولوی عبدالحق نے معہ مقدمہ کے انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع کردیا ہے ان کی مثنوی خواب و خیال بھی انجمن نے شائع کی ہے۔

احسان: منشی احسان علی خاں المتخلص بہ احسان۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ترکِ وطن کرکے شاہجہانپور (یو۔پی) آ گئے تھے۔ جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شاہجہانپور کی عدالت میں مختار تھے۔ ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں بمقام اوڈھار (ضلع بریلی) پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کشمیر کے مورخ منشی محمد الدین فوق انہی کے شاگرد تھے۔ گلکدۂ خیال ان کے دیوان کا نام ہے شاہجہان پور کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ فنِ تشبیہ میں ایک رسالہ موسوم بہ تشبیہ یار بھی تصنیف کیا تھا اور اپنے گلدستہ ارمغان کے ساتھ بالاقساط چھاپا تھا۔

شعر و سخن کا شوق ۱۶ سال کی عمر سے ہوگیا تھا پہلے شاہجہان پور میں حافظ شاہ احمد خاں ناب کے شاگرد ہوئے۔ پھر حکیم میر ضامن علی جلال کے، پھر دکن جاکر داغ کی شاگردی اختیار کی۔ لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں "عربی کی لیاقت بقدر ضرورت اور فارسی کی استعداد زبردست ہے۔ آپ کے اشعار عیوب اور اسقام سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ بلندی مضمون و شیریں زبانی کلام میں دلچسپی پیدا کرتی ہیں۔ طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ گو چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔"

احسن مارہروی: ۔ سید علی احسن المتخلص احسن اُردو زبان کے نہایت کامیاب مصنف۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب، زبان کے ماہر، قادر الکلام سخنور اور کامل الفن استاد تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ نثر اُردو نہایت مفید اور بڑی بلند پایہ کتاب ہے۔ تحفۂ احسن کے علاوہ اور کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی جس میں اردو ضرب الامثال کی کہانیوں کو نظم کیا گیا ہے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید مجتبیٰ تھا جو حسن تخلص کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوقِ سخن ہوا اور آخر تک رہا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار گلدستہ ریاضِ سخن کے نام سے جاری کیا جو عرصہ تک جاری رہا۔ فنِ شعر میں آپ داغ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کی سوانح بھی جلوۂ داغ کے نام سے لکھی ہے۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک رسالہ فصیح الملک کا اجرا کیا جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہوتا رہا کچھ دنوں تک خمخانۂ جاوید کی ترتیب و تصنیف بھی ان سے متعلق رہی۔ ایک دفعہ تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور بھی آئے تھے اور برس ڈیڑھ برس یہاں قیام کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی میں اُردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۸ء تک کام کرتے رہے۔ ۳۰ یا ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میں انتقال کیا جہاں آپ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

[illegible]

آبرو :- نجم الدین عرف شاہ مبارک۔ [illegible] عاشق مزاج اور حسن پرست انسان تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ وطن گوالیار تھا۔ متقدمین کے مشہور شعراء میں ہیں۔ صاحب دیوان تھے لیکن کلام تلف ہو گیا۔ لچھمی نرائن اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ چمنستان شعراء میں ان کے بہت سے اشعار تلاش کر کے نقل کیے ہیں۔ ۱۱۴۶ھ میں بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی وفات پائی۔

آتش :- خواجہ حیدر علی نام، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ آبائی وطن دہلی تھا مگر ان کے والد ترک وطن کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ کرتے تھے۔

والد کی وفات چونکہ صغر سنی میں ہو گئی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بڑے ہو کر نواب میر محمد تقی کی سرکار میں سپاہی بھرتی ہو گئے جو ان کو [illegible] کے قریب لکھنؤ میں لے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ یہیں مصحفی کی شاگردی کی اور اردو شاعری میں نام پیدا کیا۔ سرکار اودھ سے اسی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جو پورا چار دن بھی نہ رہتا اور مہینے کے باقی دن قرض پر گزارہ چلتا تھا۔ مزاج میں توکل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جو کچھ آتا خرچ کر دیتے اور کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے۔ ننگے بدن صرف ایک لنگوٹ باندھے سارا دن ایک جھلنگے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا [illegible] سامنے رکھا رہتا تھا جو آتا اس کے سامنے یہ حقہ پیش کر دیا جاتا۔ بھنگ کا بھی شغل جاری رہتا تھا۔ خوب گھٹتی تھی اور خوب پی جاتی تھی۔ وضع سپاہیانہ تھی جب مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتے تو تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ ۱۷۶۷ء (بقول صاحب مراۃ الشعراء ۱۷۷۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا۔ دو دیوان چھوڑے جو تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بعض نامور شاگرد یہ تھے۔ سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی جلیل، مرزا عنایت علی تجمل اور پنڈت دیاشنکر نسیم۔

آثر :- شمس العلماء نواب امداد امام آثر ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ ان کی شاعری فطری جذبات اور عاشقانہ مسائل سے معمور ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ بڑے معرکے کی ایک کتاب کاشف الحقائق کے نام سے بھی لکھی ہے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

اثر: سید محمد میر متخلص بہ اثر۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور فقیری اور شاعری دونوں میں اپنے بھائی کے [illegible] صاف [illegible] سادہ ہے مگر درد اور اثر میں میر درد کے برابر نہیں۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں: "مضمون کو [illegible] ہے۔ [illegible] اخلاق نہ حکمت نہ فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح [illegible] ہے جیسے کوئی [illegible] دیوانِ اثر کو مولوی عبدالحق نے مع مقدمہ کے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کردیا ہے [illegible] ہے۔

[illegible] علی خاں متخلص بہ احسان بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ترک وطن کرکے شاہجہانپور [illegible] شاہجہانپور کی عدالت میں مختار تھے۔ ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی [illegible] بریلی) پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کشمیر کے مؤرخ منشی محمد الدین فوق انھی کے شاگرد تھے۔ [illegible] کا نام ہے شاہجہان پور کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ فن تشبیہ میں ایک رسالہ موسوم بہ تشبیہ [illegible] تصنیف کیا [illegible] ضابطہ چھاپا تھا۔

[illegible] سال کی عمر سے ہوگیا تھا پہلے شاہجہان پور میں حافظ نثار احمد خاں ثاقب کے شاگرد ہوئے۔ پھر حکیم میر [illegible] کی شاگردی اختیار کی۔ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں: "عربی کی لیاقت [illegible] درست ہے۔ آپ کے اشعار عیوب و اسقام سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ بلندی مضمون و شیرینی زبان [illegible] طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ گو چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔"

[illegible] مارہروی: سید علی احسن متخلص احسن اردو زبان کے نہایت کامیاب مصنف۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب، [illegible] الکلام سخنور اور کامل الفن استاد تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ نثر اردو نہایت مفید اور [illegible] کتاب ہے۔ تحفۂ احسن کے علاوہ اور کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھی جس میں [illegible] کہانیوں کو نظم کیا گیا ہے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید مجتبیٰ تھا جو [illegible] تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوقِ سخن ہوا اور آخر تک رہا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار گلدستہ ریاضِ سخن کے نام سے [illegible] تک جاری رہا۔ فنِ شعر میں آپ داغ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کی سوانح بھی جلوۂ داغ کے نام سے لکھی [illegible] انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک رسالہ فصیح الملک کا اجرا کیا جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہوتا رہا کچھ دنوں تک خمخانۂ جاوید [illegible] تصنیف بھی ان سے متعلق رہی۔ ایک دفعہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں لاہور بھی آئے تھے اور برس ڈیڑھ برس یہاں قیام کیا تھا۔ [illegible] مسلم یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک کام کرتے [illegible] ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو [illegible] انتقال کیا جہاں آپ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

احسن:۔ مرزا احسن علی نام، احسن تخلص۔ سودا اور ضیا کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ زیادہ حالات نہ مل سکے۔

اختر:۔ نواب واجد علی شاہ اختر اودھ کا آخری بادشاہ اپنے باپ امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۱۸۴۷ء میں تخت پر بیٹھا
ہر وقت عیش و عشرت اور لہو و لعب میں مشغول رہتا۔ انتظام سلطنت اور ملک کی خبرگیری سے کچھ واسطہ نہ رکھتا۔ ناچ گانے اور رقص و سرود
کی محفل ہر وقت جمی رہتی۔ آخر انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ میں بھیج دیا مگر اس کی رنگ رلیاں وہاں بھی ختم نہ ہوئیں۔
پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ ملتا تھا اور سب کا سب خرچ ہو جاتا تھا۔ اسی عیش و نشاط کی حالت میں ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو سفر آخرت کیا۔ امیر
اور فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتا تھا۔ اردو زبان کا بہت اچھا شاعر تھا۔ علمی لیاقت میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ فن موسیقی کا ماہر تھا۔ چالیس کے
قریب تصانیف چھوڑی ہیں۔ حال میں "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" کے نام سے مولانا رئیس احمد جعفری نے اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔

آرزو:۔ سراج الدین علی خان نام آرزو تخلص۔ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر۔ اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور بہت سی کتابوں
کے مصنف ہیں۔ والد کا نام شیخ حسام الدین تھا بمقام آگرہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے تو گوالیار میں منصبدار مقرر ہو گئے فرخ سیر
کے عہد میں دہلی آئے اور شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا مگر لاش حسب وصیت دہلی لا کر دفن کی گئی
تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ نہایت خوبی طباع، فن شعر میں کامل اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کے متعلق میر تقی میر کا قول ہے کہ
ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور قادر الکلام نہ تھا۔ لطف یہ کہ ان کے شاگرد ان سے بھی زیادہ نامور ہوئے ہیں مثلاً مرزا
مظہر جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی میر اور خواجہ میر درد۔
نہایت شگفتہ مزاج بذلہ سنج واقع ہوئے تھے مگر مزاج میں بہت انکسار تھا۔ سلطنت کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدہ
پر متمکن تھے مگر غرور اور فخر نام کو نہ تھا۔
ان کے فارسی دیوان میں قریباً ۳۰ ہزار اشعار ہیں۔ تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے۔ شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی،
شرح گلستان، سراج اللغات (فارسی)، غرائب اللغات (اردو)، موہبت عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، تذکرہ مجمع النفائس موسوم بہ تذکرۂ آرزو، تنبیہ الغافلین۔

آرزو لکھنوی:۔ نام سید انور حسین تخلص آرزو اور وطن لکھنؤ ہے۔ آپ کے آبا و اجداد حضرت اورنگ زیب کے
عہد میں ہرات سے وارد ہند ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ اجمیر سے لکھنؤ چلے گئے اور یہیں ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں آرزو پیدا ہوئے۔
والد کا نام سید ذاکر حسین تھا۔ پانچ برس کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی۔ ذہن عمدہ تھا اس لیے جلدی فارسی و عربی کی کافی لیاقت حاصل کر لی۔
۱۲ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ فن شعر میں جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ غزل گو شعراء میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی کی
فلم کمپنیوں کے لیے عرصہ دراز تک انھوں نے گانے اور گیت لکھے ہیں۔ فغان آرزو، جہان آرزو اور سریلی بانسری ان کے کلام کے مجموعے
ہیں۔ سریلی بانسری کی زبان نہایت سادہ، آسان اور عام فہم ہے اور فارسی اور عربی الفاظ سے خالی۔ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

ارشد ۔ خاندانِ مغلیہ کے چشم و چراغ صاحبِ عالم مرزا عبدالغنی گورگانی تخلص بہ ارشد ۱۸۵۸ء میں قلعۂ معلیٰ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔ طرزِ قدیم اور طرزِ جدید دونوں انداز کی نظمیں لکھتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی سوانح عمری نظم میں لکھی ہے جو اب نایاب ہے۔ پرانے بزرگوں میں بہت قابل اور لائق شخص تھے۔ پنجاب میں سررشتۂ تعلیم میں مدرس ہو گئے تھے اور اسی میں ساری عمر گزار دی۔ ملتان میں ۱۲ فروری ۱۹۰۶ء کو وفات پائی۔

آزاد انصاری : ۔ ابوالاحسان حکیم الطاف احمد آزاد انصاری ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد سے تھے اور سہارنپور میں رہتے تھے۔ عربی فارسی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور ڈیرہ دون، میرٹھ، سہارنپور، انبالہ، علی گڑھ، دہلی اور حیدرآباد وغیرہ میں پھرتے اور تلاشِ معاش میں مصروف رہے۔ کہیں طبابت کی اور کہیں عینکوں کی تجارت۔ فنِ شعر میں مولانا حبیب الرحمٰن بیدل سہارنپوری سے اصلاح لی اور پھر شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی جن سے ان کو نہایت درجہ عقیدت تھی۔ کلام نہایت ستھرا، شائستہ، بلند پایہ اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

آزردہ : ۔ مفتی صدرالدین نام، آزردہ تخلص، مولوی لطف اللہ کے بیٹے، کشمیری الاصل۔ دہلی کے باشندے۔ ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی سے علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ فنِ شعر میں شاہ نصیر اور مومن دہلوی کے شاگرد تھے۔ دہلی کے مفتیِ اعظم تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی قیامت میں قید ہوئے۔ جائداد، کتب خانہ اور مکان سب ضبط ہوا۔ بہ ہزار خرابی قید سے مخلصی پائی۔ ۱۶ ربیع الاول ۱۸۶۸ء کو انتقال ہوا۔ اپنے علم و فضل اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ جید عالم اور یگانہ فاضل ہونے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے نادر الکلام شاعر تھے۔ نواب یوسف علی خاں والیِ ریاست رامپور، نواب صدیق حسن خاں آف بھوپال، سرسید احمد خاں اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔

اسد : ۔ میر امانی نام تھا اور اسد تخلص کرتے۔ سودا کے شاگرد تھے۔ تلاشِ معاش میں لکھنؤ آئے اور یہیں وفات پائی۔ مجموعۂ نغز کا مصنف ان کے متعلق لکھتا ہے: جوانے بود خوش طبع، شیریں زبان، بذلہ سنج، طیب بیان، خلیق و یار باش، خوش فکر، پاکیزہ تلاش۔

اسمٰعیل : ۔ محمد اسمٰعیل نام، میرٹھ کے باشندے۔ ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ مروجہ عربی فارسی تعلیم کے مابعد ۱۶ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ سنٹرل ماڈل سکول آگرہ سے ۱۸۹۹ء میں ریٹائر ہوئے اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ ہی میں انتقال ہوا۔

بچوں کے لیے آسان نظمیں لکھنے میں ان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے ریڈریں بھی لکھیں جو بڑی مقبول ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی بیشتر شاعری طرزِ جدید کی حامل ہے جس میں اصلاحی رنگ جھلک رہا ہے۔

ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "حالی کے سوا اگر کسی نے سننے کے قابل کچھ کہا ہے تو وہ اسماعیل میرٹھی ہیں۔ کلیات اسمٰعیل متعدد بار چھپا تھا مگر آج کل کمیاب ہے۔

آسی: ۔ مولوی عبدالباری نام، آسی تخلص، جائے پیدائش الدن ضلع میرٹھ، سال ولادت ۱۸۹۳ء۔ ۱۹۱۴ء سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ناطق گلاؤٹھوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد ۳۴ تک پہنچتی ہے۔ بصائر آپ کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ دیوان غالب اور تحفۃ العراقین کی شرحیں بھی آپ نے کی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

اسیر: ۔ سید مظفر علی نام، دبیر الدولہ خطاب اور اسیر تخلص تھا۔ علامہ سید مدد علی کے فرزند تھے اور ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں قصبہ امیٹھی (نواح لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے ہوئے تو لکھنؤ چلے آئے۔ تحصیل علوم متداولہ کے بعد شاعری کا شوق پیدا ہوا تو اسیر تخلص رکھ کر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سرکاری ملازم ہوئے۔ اور ۲۴ گھنٹے خدمت میں حاضر رہتے تھے جس نے ان کو چیلوں کا افسر اعلیٰ اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سرکاری کا بنا دیا تھا۔ جب واجد علی شاہ معزول ہو گئے تو رام پور چلے گئے اور وہاں عزت کے ساتھ رہے۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ فن عروض کے ماہر تھے۔ معیار الاشعار کا نہایت قابلیت سے ترجمہ کیا۔ شعر العروض اور کئی رسالے فن عروض پر لکھے۔ اردو کے چار اور فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے علاوہ مراثی اور مثنویاں بھی بہت سی لکھیں۔ فن شعر میں ان کی وقعت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ منشی امیر مینائی، مہدی حسن ماہر، احمد علی شوق قدوائی، سلیمان خاں اسد، ظہور الحسن ظہور، ریاض خیرآبادی، نواب سید یوسف حسن طباطبائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے مشاہیر ادب ان کے شاگرد تھے۔

اشتیاق: ۔ شاہ ولی اللہ نام اور اشتیاق تخلص ہے۔ سرہند (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے اور وہاں کے پیرزادے تھے۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے ہم عصر تھے۔ مگر شعر کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ نہایت متوکل اور عابد زاہد شخص تھے۔ ۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔

آشفتہ: ۔ ان کا نام عظیم الدین تھا لیکن بھورے خاں کے نام سے مشہور تھے۔ آشفتہ تخلص کرتے تھے۔ مصنف مجموعہ نغز ان کے متعلق لکھتے ہیں: "جوانے است خوش فکر، شیریں بیان، عالی طبیعت، فصاحت بیان، غزل طرحے از خوب سرانجام می یافت و بہ فصاحت می نگاشت۔" شروع میں شاعری کا نہایت شوق تھا لیکن بعد میں ایک بزرگ میاں مجیب الدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے شاعری چھوڑ دی اور زہد و پارسائی کی زندگی اختیار کی۔ مگر صوفیانہ اشعار کبھی کبھی کہتے تھے۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔

آشفتہ: ۔ مرزا رضا قلی نام اور آشفتہ تخلص تھا۔ حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے تھے۔ میر سوز کے شاگرد اور فن طبابت میں ماہر تھے۔ طبیعت درد مند پائی تھی اور شعر بامزا کہتے تھے۔

اصغر گونڈوی :۔ نام اصغر حسین، تخلص اصغر، وطن گورکھپور ہے مگر گونڈہ میں مستقل قیام کے باعث گونڈوی کہلاتے ہیں۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم کسی سکول یا کالج میں نہیں پائی مگر پرائیویٹ طور پر انگریزی عربی اور فارسی میں اچھی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ فن شعر میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی اور منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ کلام میں متانت اور سنجیدگی اور انداز بیان میں شگفتگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ نظموں میں فارسی الفاظ و محاورات کی کثرت ہے مگر ساتھ ہی سلاست اور روانی بھی موجود ہے۔ کچھ دنوں تک لاہور میں رہ کر ادبی خدمت کی۔ پھر انڈین پریس میں الہ آباد چلے گئے۔ زاں بعد ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر ہو گئے اور وہیں ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ نہایت راہد اور متقی اور درویش صفت بزرگ تھے۔ تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ نشاط روح اور سرود زندگی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

آصف :۔ یحییٰ خاں نام، مرزا زمانی عرف، آصف تخلص تھا۔ لکھنؤ کے نواب تھے ۱۷۷۵ء میں تخت نشین ہوئے اور ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو وفات پائی اور اپنے ہی بنا کردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ امام باڑہ آصف الدولہ لکھنؤ کے تمام امام باڑوں میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنا دار السلطنت فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل کر لیا تھا۔

شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ میر قدرت اللہ ان کے متعلق اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں "گاہ گاہ طبع فیض بخش میل سخن می کرد و بامزاحی گفت"۔ "خمخانۂ جاوید" کے مصنف کی ان کے متعلق یہ رائے ہے "ان کے کلام میں استاد میر سوز کی سی سادگی اور روانی نمایاں ہے۔ خیال ستھرا ہے اور زبان پاکیزہ"۔

آفتاب :۔ ابو المظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر شاہ عالم دہلی میں مغلیہ دور انحطاط کا ایک کمزور بادشاہ تھا۔ ایک طرف مرہٹوں نے سلطنت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف انگریز چھائے ہوئے تھے۔ تیسری طرف روہیلے قتل و غارت مچا رہے تھے۔ غلام قادر روہیلے نے قلعہ معلی دہلی پر قابض ہو کر اور چھاتی پر چڑھ کے بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں مگر بعد میں خود بھی کتے کی موت مارا گیا۔ بادشاہ علم کا قدر دان اور شعراء کا سرپرست تھا۔ خود بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ آفتاب تخلص تھا اور صاحب دیوان تھا۔ سودا، میر، نصیر، انشا، مصحفی اور احسان سب اس کے ہاں سے وظیفہ پاتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں پیدا ہوا، ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا اور کم و بیش ۴۵ سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۸ نومبر ۱۸۰۶ء کو انتقال کیا۔

افسوس :۔ میر شیر علی نام، افسوس تخلص۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں بہت مشہور شخص گزرے ہیں۔ میر حیدر علی حیران اور میر سوز کے شاعری میں شاگرد تھے۔ نارنول (قریب آگرہ) کے رہنے والے دہلی میں ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر اس وقت کے علوم پڑھے۔ پھر تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولیعہد دولت مغلیہ ان دنوں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کا کلام سنا تو اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیا۔ جب دہلی واپس جانے لگے تو انھوں نے لکھنؤ کی شاعرانہ دلچسپیوں کو چھوڑنا نہ چاہا اور یہیں رہ گئے۔ نواب سرفراز الدولہ نے سرپرستی کی اور ان کو فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد فورٹ ولیم کے لیے لائق اور قابل مصنفوں

کی تلاش ہوئی۔ نواب سرفراز الدولہ نے ان کا نام پیش کر دیا اور یہ کلکتے روانہ ہو گئے۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور آٹھ نو سال تک اس مشغلے میں عمر نہایت آرام سے کٹی۔ ۱۸۱۵ء میں انتقال کیا۔ تصانیف میں ایک پورا دیوان یادگار چھوڑا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ (۲) گلستانِ سعدی کا اردو میں ترجمہ کر کے باغِ اردو نام رکھا (۳) لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ "آرائشِ محفل" ہے جو "خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ابتداً منشی سجان رائے ساکن پٹیالہ نے فارسی میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق لکھی تھی اور عہدِ قدیم کی بڑی مستند تاریخوں سے اسے ترتیب دیا تھا مگر "آرائشِ محفل" صرف عہدِ ہنود کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ نہیں۔

اقبالؔ: ۔ شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ بچپن میں شمس العلماء مولوی سید میر حسن کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا جہاں مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ فلسفہ کے معلم تھے اور اقبال کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور بیرسٹری شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ گئے۔ پاکستان کا نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال ہی نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ آخری عمر نہایت تکلیف اور درد و کرب میں گزری اور مختلف عوارض ایسے لگ گئے جنھوں نے آخر وقت تک پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر اسی حالت میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ایشیا کا یہ بہت بڑا شاعر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال کا نام ان کی ولولہ انگیز نظموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:۔ بانگِ درا۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ بے خودی۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم۔ جاوید نامہ۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ پس چہ باید کرد، مسافر۔ ارمغانِ حجاز۔ باقیاتِ اقبال۔ ان کی سب سے پہلی کتاب کا نام علم الاقتصاد ہے۔

اکبر الہ آبادی: ۔ سید اکبر حسین نام، اکبرؔ تخلص، لسان العصر لقب، وطن الہ آباد، تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء۔ والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ گھر میں خوشحالی اور امیری نہ تھی اس لیے معمولی تعلیم کے بعد نوکری کی فکر ہوئی اور محکمہ تعمیرات میں ملازم ہو گئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر مختاری کا امتحان پاس کیا۔ پھر وکالت کا امتحان دیا۔ ۱۸۸۰ء میں منصف ہو گئے۔ ۱۸۹۴ء میں جج عدالتِ خفیفہ مقرر ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں ملازمت چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ اہلیہ کی وفات اور اپنے بیٹے ہاشم کی موت کے باعث آخری عمر نہایت حزن و غم میں گزری۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ اعلیٰ پایہ کی ظریفانہ شاعری ان پر ختم تھی۔ ان کا کلیات چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

الم: ۔ حضرت خواجہ میر کے پوتے صاحب میر نام۔ میاں صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ الم تخلص کرتے تھے۔ میر قدرت اللہ قاسم ان کے متعلق لکھتے ہیں: کلام صحت نظام ایشاں حلاوتے دارد کہ ذائقہ سخن داں داند و کیفیتے دارد کہ وجدان بادہ نوشاں جامِ وحدت شناسد۔

امانت :- نام سیّد آغا حسن تخلص امانت، پیدائش ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) وطن لکھنؤ، میر آغا رضوی کے بیٹے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری کے باعث گونگے ہو گئے۔ یہ سخت تکلیف دہ مرض ۹ برس تک عذاب جان بنا رہا۔ اس کے بعد اس سے رہائی ملی۔ اُردو میں سب سے پہلے ڈراما انھوں نے ہی لکھا جس کا نام اندر سبھا ہے۔ اپنے واسوخت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ دلگیر کے شاگرد تھے ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) میں وفات پائی۔

امانی :- میر امانی نام امداد امانی تخلص تھا۔ ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے حالات نہیں ملے۔

امید :- ان کا نام مرزا محمد رضا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے قزلباش خاں خطاب اور منصب یک ہزاری ملا تھا۔ وطن ہمدان تھا۔ جوانی میں اصفہان آئے۔ وہاں مرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے پھر ہندوستان چلے آئے۔ یہ فارسی کے شاعر تھے اور امید تخلص کرتے تھے مگر کبھی کبھی اُردو میں بھی کہتے تھے ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں سکتے کی بیماری سے وفات پائی۔

امیر مینائی :- امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ ایک بزرگ حضرت شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے۔ اس لیے امیر مینائی کہلاتے ہیں۔ فن شعر میں منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ اُن میں علم الصنعت استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۲۰ سال کی عمر تھی کہ شاعری کا شہرہ واجد علی شاہ تک پہنچا۔ اس نے بلا کر کلام سنا ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور نے بلایا اور نہایت تعظیم و تکریم کی۔ بعد میں نواب کلب علی خاں نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ آپ وہاں عدالت دیوانی کے حاکم بھی تھے۔ ۴۴ برس نہایت عزت کے ساتھ رامپور میں گزارے پھر نظام کے ایماء و آرزو نے حیدرآباد بلایا۔ مگر وہاں قضا لے گئی تھی۔ پہنچتے ہی تھے کہ بیمار ہو گئے اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ مرحوم نہایت عالم و زاہد، متقی، پرہیزگار اور نہایت نیک نفس بزرگ تھے۔ فن شعر میں کامل ہونے کے علاوہ عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ طب سے بھی واقف تھے اور علم جفر کے بھی ماہر تھے۔ نظم اور نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ بعض نام یہ ہیں۔ ارشاد السلطان، ہدایت السلطان، مرآۃ الغیب دیوان، صنم خانہ عشق (دیوان)، محامد خاتم النبیین، مینائے سخن نظم میں ہیں۔

نثر کے بعض رسائل یہ ہیں۔ خیابان آفرینش، نماز کے اسرار، ذخیرۃ الامیر، شعراء کا ایک تذکرہ انتخاب یادگار کے نام سے لکھا جس میں ۵۰۰ سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔ امیر اللغات لکھنی شروع کی جو اُردو کی بے نظیر لغت ہوتی مگر صرف ۲ جلدیں چھپ سکیں جن میں الف کی تقطیع آئی۔ حضرت امیر مینائی کے بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ حافظ جلیل حسن جلیل، حفیظ جونپوری، وفا رامپوری، ریاض خیرآبادی، حضرت حافظ سید مختار احمد مختار شاہجہانپوری (جو الحمد للہ حیات ہیں اور جودھا بلڈنگ لاہور میں سکونت پذیر ہیں)، حکیم ضمیر حسن خاں دل (جو شاہجہانپور میں تشریف رکھتے ہیں)۔ آپ کے ایک ممتاز شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار نے آپ کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات امیر مینائی کے نام سے شائع کیا تھا مگر اب نہیں ملتا۔

امیر:- نواب محمد یار خان نام امیر تخلص، نواب فیض اللہ خاں نواب رامپور کے بھائی تھے اور ٹانڈہ میں رہائش رکھتے تھے۔ ہر وقت سیر و شکار اور شعر و سخن میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ قیام الدین علی قائم کے شاگرد تھے۔ حق استادی کے ... روپیہ ماہوار دیتے تھے اکثر شعراء ان کے ملازم تھے اور دن رات شعر و شاعری کی مجلس بھی رہتی تھی مگر ہنگامہ گردی میں تمام مجلس عیش درہم برہم ہو گئی اور یہ بھائی کے پاس رام پور چلے گئے جہاں انھوں نے ۵ ہزار روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور انھوں نے اسی کنج عافیت میں اپنی عمر بسر کر دی [illegible] میں انتقال ہوا۔

امین:- ان کا نام شاہ امین الدین تھا اور تخلص امین کرتے تھے عظیم آباد کے رہنے والے تھے [illegible] میں انتقال کیا اور غزلیات کا ایک دیوان یادگار چھوڑا۔

انجام:- نواب امیر خاں نام، عمدۃ الملک خطاب، انجام تخلص، شاہ نعمت اللہ ولی کی نسل میں سے محمد شاہ رنگیلے کا منظور نظر تھا۔ کچھ عرصہ الہ آباد کا صوبہ دار بھی رہا۔ نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا اس لیے بادشاہ کو بہت عزیز تھا اور وہ اس کو اپنے سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا مگر یہ شاہی عنایات کے بھروسے پر نہایت گستاخ ہو گیا آخر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک امیر کو اشارہ کیا اور اس نے [illegible] دسمبر [illegible] کو اسے قتل کر دیا۔ دہلی میں سرائے روح اللہ خاں میں دفن ہوا۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا (مختلف تذکروں میں اس کے قتل کا سنہ مختلف لکھا ہے ہم نے نسبتاً معتبر تاریخ کو لیا ہے)

انشا:- میر انشاء اللہ خاں نام، حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر کے بیٹے اور اردو کے نہایت نامور شاعر تھے۔ نہایت ذی علم شخص تھے مگر طبیعت کو ہزل اور مسخرہ نویسی میں ڈال کر اپنے علم سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی مسخرے پن کی بدولت آخر عمر نہایت مصیبت سے کٹی اور بڑی حسرت کے ساتھ جان دی۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر دہلی آئے۔ یہاں سے لکھنؤ پہنچے اور وہیں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں فوت ہو گئے۔ کلیات کے علاوہ دریائے لطافت ان کی نہایت مشہور کتاب ہے جو صرف و نحو، معانی و بیان، عروض و قافیہ پر اردو میں سب سے پہلی تصنیف کی جاتی ہے۔

انیس:- میر ببر علی انیس مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جب تک واقعہ کربلا کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی ہے انیس کا نام بھی باقی رہے گا۔ ابتدائے شاعری میں کچھ غزلیں کہیں پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ساری عمر گزار دی۔ نہایت وضع دار اور بڑے خود دار شخص تھے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے گھر والوں سے بھی صرف مقررہ اوقات پر ملتے تھے۔ استغنا، خودداری اور قناعت کے گویا مجسمہ تھے۔ جب تک کوئی آدمی لینے نہ آیا اور امرا سے نہ بلایا گیا اس وقت تک بادشاہ کے ہاں بھی نہ گئے۔ اردو شعرا میں چوٹی کے شخص سمجھے جاتے ہیں۔ ساری عمر میں ڈھائی لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ ان کی زبان نہایت مستند اور ٹکسالی مانی جاتی ہے۔ اردو کو انھوں نے بہت سے نئے محاورے دیے اور بیان کے نئے نئے طریقے سمجھائے۔ زبان کی لغات

[illegible] ات بھی نہایت وسیع تھیں۔ منظر نگاری کا بہت اعلیٰ درجہ کا سلیقہ رکھتے تھے۔ الفاظ اور محاورات کا استعمال ان کے ہاں بڑی خوبصورتی [illegible]
[illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] سال کی عمر میں ۹ دسمبر ۱۸۳۸ء کو انتقال کیا۔

بحر:- شیخ امداد علی نام تھا اور بحر تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے نامور شاگردوں میں سے تھے اور لکھنؤ کے شعرا میں خصوصیت [illegible]
[illegible] نے شعر و شاعری کے مشغلے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے ساری عمر عسرت و غربی میں گزری۔ ارادے بڑے بڑے تھے مگر سب
[illegible] پریشان ثابت ہوئے۔ زبان کے استاد تھے اور صحت الفاظ کا خاص خیال رکھتے تھے ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔

برق:- مرزا محمد رضا نام، برق تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا۔ اس سے زیادہ
[illegible] کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

بقا:- نام شیخ بقاء اللہ، ابن حافظ لطف اللہ خوشنویس۔ وطن اکبر آباد۔ پیدائش دہلی کی۔ [illegible] عنوان شباب میں دہلی کو چھوڑا
[illegible] لکھنؤ میں جا رہے۔ فارسی میں بقا تخلص اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کے، اور اردو نظم میں شاہ حاتم کے شاگرد
[illegible] میر درد سے بھی اصلاح لی۔ [illegible] زندگی [illegible] لطف اور فقر و فاقہ میں گزری۔ طبیعت فن شعر کے لیے نہایت موزوں پائی تھی۔
[illegible] اور سادہ ہے، مزاج شگفتہ اور طبع رنگین رکھتے تھے۔ [illegible] سودا جیسے [illegible] استادانِ سخن کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ نواب شیفتہ
[illegible] کے متعلق فرماتے ہیں: "در مراتب نظم طبیعے شگفتہ و رنگین و طرزے با مزا و شیریں داشت۔" ۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔

بیاں:- نام خواجہ احسن اللہ خاں تھا اور بیاں تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد، مولانا فخر الدین کے
[illegible] تھے۔ قدرت اللہ قاسم مولف مجموعہ نغز سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد میں ملازم تھے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں
[illegible] ت پائی۔ مولوی عبد الحق اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "خواجہ صاحب اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے
[illegible] رنگینی اور [illegible] رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر پڑھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے۔ دوراز قیاس استعارات اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک
[illegible] سادگی میں ان کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان ہیں۔"

بیاں و یزدانی:- نام سید محمد مرتضیٰ تھا (صاحب مراۃ الشعراء نے محمد تقی غلط لکھا ہے) والد کا نام میر گوہر علی ۱۸۵۰ء
[illegible] قول صاحب مراۃ الشعراء ۱۸۴۶ء اور بقول صاحب قاموس المشاہیر ۱۸۴۷ء) بمقام میرٹھ پیدا ہوئے۔ [illegible] عرفانی کے
[illegible] کرتے۔ اردو میں بیاں اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ بہت اچھے [illegible] تھے مگر کلام کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں چھپا
[illegible] میں مختلف اخبارات اور رسالوں میں اپنی غزلیں اور نظمیں [illegible] رہتے تھے۔ ایک ماہوار گلدستہ لسان الملک کے نام سے خود بھی
[illegible] جاری کیا تھا۔ طوطی ہند کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اردو کے علاوہ عربی [illegible] پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ صاحب مراۃ الشعراء ان کے حال میں

لکھتے ہیں کہ "ہمیشہ اندھیری کوٹھڑی میں پڑے رہتے تھے۔ صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہر وقت ایک لحاف اوڑھے رہتے تھے خواہ کوئی موسم ہو۔ حقہ پر کچھ توجہ رکھا رہتا تھا۔ باہر کبھی آتے جاتے نہ تھے۔ پلنگ پر ہی کبھی کبھی نہا لیتے تھے۔ محض شاعر تھے اور کسی کام کے نہ تھے۔"
تصنیفات یہ ہیں (۱) مسدسِ حالی کا جواب (۲) پانچ بند در جواب شکوۂ ہند (حالی) (۳) سیلی استاد و مثنوی حقوقِ اولاد (حالی) (۴) مجموعہ نعت ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو انتقال ہوا۔ کلام کا کچھ انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے شائع کیا ہے۔ کچھ کلام فروری ۱۹۰۵ء کے رسالہ الحمرا لاہور میں بھی چھپا تھا۔

بیخود بدایونی: ان کا نام مولوی عبدالحی تھا اور مولوی غلام سرور صدیقی کے فرزند تھے۔ بیخود تخلص تھا اور بدایوں (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ خوش وضع، رنگین طبع اور نہایت ہنس مکھ انسان تھے۔ فنِ شعر میں مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی مگر طبیعت کو چونکہ غزل سے بڑی مناسبت تھی لہٰذا بعد میں داغ کو استاد بنایا اور طبع کی خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ ایک دیوان مرآۃ الخیال یادگار چھوڑا۔

بیخود دہلوی: حاجی سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی عہدِ حاضرہ کے نہایت نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور نہایت شریف اور نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سارے کا سارا علم و فضل اور شعر و ادب کی دولت سے مالا مال تھا۔ والد کا نام سید شمس الدین سالم اور دادا کا سید بدرالدین سالک تھا جو غالب کے شاگرد تھے۔ پردادا بادشاہ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے جن کا نام امتیاز الدولہ افتخار الملک منصور جنگ نواب سید احمد امیر خاں تھا۔ منشی محمد کرم اللہ خاں شیدا ماموں اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ ان کی والدہ کے پھوپھا تھے۔
۳ رمضان ۱۲۷۹ھ (۲۲ فروری ۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی۔ رنگِ طبیعت دیکھ کر انھوں نے داغ سے مشورۂ سخن کی صلاح دی۔ چنانچہ یہ حیدرآباد پہنچے اور چھ ماہ تک داغ سے اصلاح لیتے رہے پھر دہلی چلے آئے اور ساری عمر شعر و شاعری کے شغل میں اور انگریزوں کو اردو پڑھانے میں گزار دی۔ بیخود مرحوم اس صدی کے ان بزرگوں میں سے تھے جن کے ہوتے ہوئے شعر و ادب اور زبان و بیان کی وہ روایتیں زندہ تھیں جو خاص دہلی کی ادبی مجالس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے اشعار میں محاورہ کی بے ساختگی، الفاظ کی بندش، خیالات کی صفائی، بیان کی سادگی اور زبان کی شیرینی بدرجۂ اتم موجود ہے ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ اردو شاعری میں دہلوی رنگ کی یہ آخری شمع تھی جو بجھ گئی۔
ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "گفتارِ بیخود" ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں چھپا اور دوسرا مجموعہ "شہسوارِ بیخود" ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں چھپا۔ "گفتارِ بیخود" ۸ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

بیدار: میر محمدی عرف سید محمد علی نام اور بیدار تخلص تھا۔ میر درد اور ظہور الدین حاتم کے شاگرد ہیں۔ نہایت دین دار اور باخدا بزرگ تھے۔ مجموعۂ نغز میں ان کے متعلق ہے "خوش گو، شیریں گفتار، پاکیزہ خو، فرشتہ کردار، شعرش بسیار باکیفیت و پختگی در نہایت حلاوت و دل بستگی است" دیوانِ بیدار ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں

ا ہوئے ۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی ۔

تاباں :- نام میر عبدالحی اور تخلص تاباں تھا۔ شاہ حاتم یا حشمت کے شاگرد اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے
ں طور پر حسین اور خوب صورت واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ دہلی کے لوگ ان کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ لیکن جبش خاں ہیں ان کا مکان
ں کے حسن کی شہرت میں اتنی شہرت ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ بادشاہ ان کو دیکھنے ان کے مکان پر آئے تھے۔ عین جوانی میں انتقال ہوا تو ساری
ں نے سوگ منایا۔ ان کے انتقال کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ قیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا اپنے
ر مراۃ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے درمیان انتقال ہوا۔
ان کے کلام کی نسبت رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ "کلام عاشقانہ، شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک اور زبان
ت سلیس ہے" ان کا دیوان انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔

دمولانا **تاجور نجیب آبادی** :- احسان اللہ خاں نام۔ تاجور تخلص۔ وطن نجیب آباد (یو پی) مقام پیدائش نینی تال۔
ال ولادت ۱۸۹۴ء۔ والد کا نام محبت اللہ خاں تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند میں پڑھا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۰۸ء میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے مولوی فاضل
رنشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کر کے دیال سنگھ ہائی سکول میں اورینٹل ٹیچر لگ گئے۔ کچھ عرصہ بعد دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور بقیہ زندگی
یہیں بسر کرنے کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔
تاجور بحیثیت شاعر یا ادیب کے صحافی زیادہ تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں ادیب سے ماہنامہ "آفتاب اردو" نکالا
ور ۱۹۱۲ء میں تاج الکلام۔
لاہور آ کر ۱۹۱۶ء میں "مخزن" کے مدیر بنے اور پانچ سال تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر میاں
بشیر احمد نے ہمایوں کی جائنٹ ایڈیٹری کے لیے بلا لیا اور اس مشہور و معروف ماہنامہ کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۲۲ء میں مولانا کی زیر ادارت
شائع ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہاں کام کرنے کے بعد مولانا نے اپنا پرچہ "نیرنگِ خیال" کے نام سے جاری کیا جو بچوں کے لیے وقف تھا اور بہت ہی
خوبی اور قابلیت سے ایڈٹ کیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم ملک سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ ازاں بعد ۱۹۲۹ء میں رسالہ "ادبی دنیا" جاری کیا۔ یہ
پرچہ آج کل مولانا صلاح الدین کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں علامہ تاجور نے لاہور سے "شاہکار" نکالا اور اس شان سے
نکالا کر سارے ماہنامے اس کے آگے ماند پڑ گئے۔
مولانا کی ادبی اور علمی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ انھوں نے لاہور کی مشہور ہندو فرم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کو "اردو مرکز"
کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور خود اس ادارہ کے نگران بنے۔ اس ادارہ نے اردو نظم و نثر کا بہترین انتخاب
۴ جلدوں میں شائع کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مبسوط جلدوں میں اردو نظم و نثر کا انتخاب اور اس پر ریویو شائع کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ
بہت اچھے شاعر تھے اور انھوں نے کہا بھی بہت کچھ اور ان کے شاگرد بھی بہت سے تھے مگر ان کے اپنے کلام کا مجموعہ اب تک شائع

جاکر ملازم ہو گئے، پھر لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے پاس نوکر ہو گئے۔ انشا سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں۔ جوانی ہی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ قصیدہ وغیرہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دیوان موجود ہے۔ آزاد ان کے متعلق کہتے ہیں: طبیعت غزل گوئی کے لیے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ حریف، ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج تھے، طبیعت عشرت پسند تھی اور ساری عمر عیش میں گزری۔ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقت نہیں مگر کہتے ایسا تھے کہ اب تک دل پھڑک اٹھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ لکھی ہے:

ہائے ہندوستان کا شاعر ہوا

۲۵ ۲ ۱ھ

جلال لکھنوی: حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی بہت مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے۔ شعر میں امیر علی خاں ہلال اور ان کے استاد رشک اور نواب فتح الدولہ برق کے شاگرد ہیں۔ ابتداء برسوں تک نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رام پور کے ہاں ملازم رہے۔ وہاں ان کے معاصر داغ، تسلیم اور امیر مینائی تھے۔

اس صحبت کے بکھرنے کے بعد آپ نواب حسین میاں والی منگرول کے ہاں چلے گئے اور آخر عمر میں وطن آ گئے جہاں ۷۶ برس کی عمر میں ۵ شوال ۱۳۲۷ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو وفات پائی۔ تصانیف میں غزلوں کے چار دیوان، سرمایۂ زبان اردو، افادۂ تاریخ، منتخب القواعد، تنقیح اللغات، گلشن فیض، رسالہ دستور الفصحاء، مفید الشعراء ان کی یادگار ہیں۔ شاگردوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں: میرزا اکر حسین یاس، آرزو لکھنوی، احسان شاہجہان پوری اور سردار ادھم سنگھ۔

جلیل مانک پوری: نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حضرت امیر مینائی کے ممتاز شاگرد اور ان کے جانشین تھے۔ امیر اللغات کی تدوین انہی کے سپرد تھی۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ داغ کے انتقال کے بعد آپ ہی نظام دکن محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے اور نواب فصاحت جنگ خطاب پایا۔ حیدر آباد میں محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر رہے۔ تذکیر و تانیث پر ان کی ایک تصنیف لاجواب ہے۔ اپنے استاد کی سوانح حیات بھی قلمبند کی تھی اور دکن کی ایک ضخیم تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کے علاوہ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

تاج سخن - جان سخن - معراج سخن - سرتاج سخن - معیار اردو - عطر سخن - اردو کا عروض - گل صد برگ - روح سخن، نجم سخن اور بہار سخن
آخر الذکر تینوں غیر مطبوعہ ہیں۔

جنوری ۱۹۴۶ء (۱۳۶۵ھ) میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔ ولادت ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں مانک پور (اودھ) میں ہوئی۔
مؤلف تذکرہ جدید شعرائے اردو نے سال پیدائش ۱۸۶۹ء لکھا ہے۔

ان کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق اس تذکرہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے:

(۱) سادگی بیان کے ساتھ ساتھ نازک خیالی۔

(۲) غزلوں میں الفاظ کی ماہرانہ نشست سے ترنم کا لطف۔

(۳) بیانِ حسن وعشق میں روزمرہ و سلاست کی روانی۔

ان کے بہت سے اشعار رعایتِ لفظی اور محاورہ بندی کے طلسم سے باہر نہیں نکلے۔ تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو بھی دلچسپ بنادیتی ہے۔ ان کا اصل رنگ حسن وعشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔" ان کے دیوان سہلِ ممتنع کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ ہمارے دوست جناب کسری منہاس نے ان کی ہجری و عیسوی دونوں تاریخیں کہی ہیں جو قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

ملہم غیبی نے کسری! یہ کہا سالِ وفات

ہے امام الفن جلیل اللہ کی رحلت ہوئی ہا (۱۳۶۵ھ)

اور عیسوی تاریخ ؎ نکلا ہے فردِ رنگ میں اپنے یہ سالِ فوت

مرگِ سخن ہے اصل میں رحلت جلیل کی (۱۹۴۶ء)

جوان:۔ ان کا نام مرزا نعیم بیگ اور تخلص جوان تھا۔ فنِ شعر میں مصحفی کے شاگرد رہیں۔ مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں بزمرۂ شعرا ملازم تھے۔

جوشش:۔ شیخ محمد روشن یا روشن علی نام جوشش تخلص اور وطن عظیم آباد (پٹنہ) ہے بقول صاحب رآۃ الشعرا تذکرہ نویسوں نے ان کی بلندیِ فکر، قدرتِ تخیل اور مہارتِ سخن کی بہت تعریف کی ہے۔"

دیوان کے علاوہ انھوں نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو اب نہیں ملتا۔ تیرھویں صدی ہجری میں وفات پائی۔ صحیح سنہ معلوم نہیں ہوسکا۔

جوہر:۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد سے کون واقف نہیں۔ ہندوستان کی کامل آزادی کے بہت زبردست علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر تھے۔ شروع شروع میں محض اس خیال سے کہ کانگرس آزادی کی حامی ہے اس کے ساتھ رہے۔ یہ محمد علی ہی تھے جنھوں نے گاندھی جی کو مشہور کیا ورنہ اس سے پہلے ملک میں ان کا کوئی اثر تھا نہ رسوخ ——— آزادی کی جو تڑپ ان کے دل میں تھی وہ ان کے اس فقرے سے ظاہر ہے جو انھوں نے لندن میں کہا تھا کہ "میں غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ یا تو تم ہمارے ملک کو آزادی دینی پڑے گی یا مجھے دو گز زمین قبر کے لیے۔" اور انھوں نے اپنا یہ عزم پورا بھی کر دکھایا۔ لندن ہی میں ان کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا اور نعش بیت المقدس لا کر دفن کی گئی۔ آزادی کے عشق میں متعدد مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں مگر استقامت میں فرق نہ آیا۔ بلند پایہ الکلام شاعر، انگریزی اور اردو کے اعلیٰ پایہ کے ادیب، زبردست صحافی، شعلہ بیان خطیب، ماہر سیاست دان اور نہایت بلند کیرکٹر کے انسان تھے۔

۱۸۷۸ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے جو عوام میں بی اماں کے نام سے مشہور تھیں ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کی۔ بی۔ اے علی گڑھ کالج سے کیا۔ پھر آئی۔ سی۔ ایس کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ واپس آ کر رام پور اور بڑودہ میں کچھ عرصہ ملازمت کی مگر جلد ہی نوکری کی پابندیوں سے گھبرا کر استعفیٰ دے دیا اور کلکتہ سے ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو کامریڈ جاری کیا۔ اس میں انھیں

زبردست مقالے لکھے اور انشا پردازی کے ایسے شاندار نمونے پیش کیے کہ مشہور انگریز ادیب ایچ۔ جی ویلز نے کہا: "محمد علی نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔"

مولانا کے اشعار جذب، اثر، جوش سے بھرے ہوتے تھے۔ "کلام جوہر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے مگر شاعری ان کا اصلی میدان نہیں۔ ان کی عظمت کے جھنڈے سیاست کے خارزار میں گڑے ہوئے ہیں۔ کاش محمد علی جیسے باہمت مخلص ہمدرد، مستقل مزاج اور صداقت پیشہ لیڈر مسلمانوں کو چند ہی میسر آ جاتے۔

چکبست :- پنڈت برج نرائن نام، چکبست تخلص، وطن فیض آباد (یو۔ پی) ۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان دیا اور لکھنؤ میں وکیل ہو گئے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو فالج کے حملے سے وفات پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا مگر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی اور قوم پرستی نہایت نمایاں ہیں۔ ان کی منظومات کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے چھپا اور نثری مقالات مضامین چکبست کے نام سے شائع ہوئے۔ معرکہ چکبست و شرر ان کے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مولانا عبد الحلیم شرر کے جواب میں لکھے۔ علاوہ [illegible] کا دیباچہ اور مثنوی گلزار نسیم پر مقدمہ بھی انھوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ آتش کے کلام پر تنقید ان کے وجدان صحیح اور خوش ذوقی کا بہترین نمونہ ہے۔

حاتم :- دلی کے پر عصر شاعروں میں سے ہیں۔ شیخ ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص کرتے تھے۔ دہلی میں شیخ فتح الدین کے ہاں ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ انسان تھے مگر نوجوانی سے شعر کا چسکا لگ گیا۔ نواب عمدۃ الملک امیر خان کے ندیم خاص اور داروغہ مطبخ تھے۔ بعد ازاں میر بادل علی شاہ کے مرید ہو گئے اور ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مصحفی ۱۷۸۳ء بتاتے ہیں۔ بعض تذکروں میں ۱۷۹۱ء مرقوم ہے۔ صاحب مراۃ الشعراء نے ۱۷۹۲ء لکھا ہے۔

"دیوان زادہ" ان کا اردو کا دیوان ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی موجود ہے۔ اس میں دس ہزار اشعار ہیں۔ فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ایک مثنوی قہوہ کی تعریف میں بھی لکھی ہے۔ ۶۰ سال کے طویل عرصہ تک شعر کہتے رہے۔ مرزا رفیع سودا اور عبد الحی تاباں ان کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔

حالی :- نام خواجہ الطاف حسین تخلص حالی۔ خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ باپ کی طرف سے انصاری اور والدہ کی طرف سے سید ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں غالب اور شیفتہ کے شاگرد ہیں۔ عربی و فارسی، صرف و نحو، تفسیر و فقہ دیگر استادوں سے حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق رہے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ پھر دہلی کے اینگلو عربک سکول میں مدرسی کی۔ درمیان میں کچھ عرصہ ایچیسن کالج کے ہوسٹل میں طلباء کے اتالیق کے طور پر رہے مگر پھر گھبرا کر دہلی چلے گئے۔ جب ریاست حیدر آباد سے [illegible] روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تو عربک سکول کی نوکری چھوڑ دی اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ یہاں تک کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ نظم اردو کے مجدد اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ مسدس مد و جزر اسلام کی تصنیف نے آپ کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی معرکۃ الآرا اخلاقی، اصلاحی اور معاشرتی نظمیں آپ نے لکھیں جن میں سے اکثر کو نہایت قبولیت حاصل ہوئی۔ مناجات بیوہ، مثنوی حقوق اولاد، حب وطن، تحفۃ الاخوان، شکوۂ ہند اور چپ کی داد وغیرہ۔ دیوان ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا جو جدید شاعری کا بہترین نمونہ تھا۔ نثر میں حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب اور حیات جاوید نہایت مشہور ہیں۔ سر سید احمد خاں کے تعلیمی مشن کو کامیاب کرنے میں حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ حالی اخلاق اور انسانیت کے لحاظ سے سر سید احمد خاں صاحب کے تمام گروہ میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس بے نظیر انسان کی مفصل سوانح عمری اب تک کوئی شائع نہیں ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی سوانح عمریاں کئی ہیں جو اکثر تاریخی اور دوسری اتفاقی غلطیوں سے پُر ہیں۔

حزیں:- نام میر محمد باقر تھا اور مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے اور انہی کے پاس رہتے تھے۔ پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں نواب صولت جنگ نے ان کی خوب قدر دانی کی۔ صاحب دیوان تھے۔ "گلستان شعراء" میں ان کے متعلق لکھا ہے "شعرش رنگین و گفتش شیریں است...... اشعار سوز انگیز و مضامین عجیب بسیاری دارد۔"

حسامی:- حسام الدین حیدر ان کا نام تھا اور حسامی تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ خدا بخش تنویر کے شاگرد تھے۔

حسرت موہانی:- رئیس المتغزلین سید فضل الحسن حسرت موہانی موجودہ دور کے غزل گو شعراء میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں اور غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور علی گڑھ ہی سے اردوئے معلّٰی نکالا جو کم و بیش ۴۰ سال تک نکلتا رہا۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ان کے بزرگ نیشاپور سے ہندوستان میں آئے اور قصبہ موہان ضلع اناؤ (یو۔پی) میں سکونت اختیار کی۔ تسلیم لکھنوی اور نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے علاوہ مقتدر سیاست داں بھی تھے۔ اس جرم میں عرصہ دراز تک قید کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انگریزوں کے سخت دشمن اور کانگرس کے رکن تھے اور ساری عمر کانگرس کی حمایت میں بسر کر دی۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ بہت سے شعراء کے نایاب دیوان نہایت تلاش کے بعد شائع کیے۔ دیوان غالب کی ایک بے نظیر شرح لکھی۔ نکات سخن اصولِ تنقید پر ان کی لاجواب تصنیف ہے۔ نہایت با اخلاق، منکسر المزاج، سادہ طبع، پابند وضع اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حج بیت اللہ کا شرف کئی بار حاصل کر چکے تھے۔

حسرت: - چراغ حسن نام حسرت تخلص ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ
بدرالدین تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں مدرسی کی پھر کلکتہ چلے گئے وہاں عصر جدید۔ جمہور۔ نئی دنیا۔ استقلال کے ایڈیٹر رہے۔
کچھ دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" میں کام کیا، پھر ظفر علی خاں نے "زمیندار" میں بلا لیا۔ اس کے بعد ہندستان ٹائمز۔ احسان۔
شہباز۔ احسان اور انصاف کی ادارت کی۔ اپنا اخبار "شیرازہ" بڑی شان سے نکالا۔ دوسری جنگ میں ملایا چلے گئے۔ وہاں دو فوجی
اخباروں کی ایڈیٹری کی۔ پھر لاہور آ کر امروز کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ چار برس یہاں گزرے، پھر ایک جھگڑا ہونے کے باعث ملازمت
چھوڑ کر کراچی چلے گئے جہاں کچھ دنوں ماہ نو کی ایڈیٹری کی۔ ریڈیو میں ملازم ہو گئے پھر سول برڈٹ کمپنی نیو یارک کے لیے کتابوں کا ترجمہ کیا۔
ازاں بعد لاہور چلے آئے اور نوائے وقت میں افکار و حوادث لکھنے شروع کیے یہاں تک کہ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو انتقال ہو گیا۔ سندباد جہازی
آپ کا قلمی نام تھا۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب، نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر، بہترین مصنف، زبان و بیان اور محاورے کے استاد،
نکات اور ملفوظات کے گل سرسبد، ہر ادبی محفل کی جان اور ہر علمی مجلس کی روح رواں تھے۔ صاف سلیس اور صحیح اردو لکھنے میں اپنی
نظیر نہ رکھتے تھے۔ "پربت کی بیٹی" ان کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ دیگر تصانیف یہ ہیں۔ مردم دیدہ۔ دو ڈاکٹر۔ کیلے کا چھلکا۔
تاریخ کے خطوط۔ سرگذشت اسلام۔ مطائبات۔ پنجاب کا جغرافیہ۔ بغاوت عرب۔ خاتم النبیین۔ کشمیر۔

حسرت: - جعفر علی نام حسرت تخلص۔ دہلی کے باشندے تھے۔ رہائش لکھنؤ کی تھی جہاں عطاری کی دکان کرتے تھے
فن شعر میں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب حسرت موہانی نے شائع کیا تھا جو ساڑھے تین سو اشعار کے
قریب ہے۔ ان کا کلام تصنع اور ناگوار رعایت لفظی سے پاک، سادگی سے معمور اور درد سے لبریز ہوتا ہے۔ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں
بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ "دہلی کا دبستان شاعری" میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) لکھا ہوا ہے۔

میر حسن: - میر غلام حسن ابن میر غلام حسین ضاحک نام۔ حسن تخلص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا وطن ہرات تھا۔
خوش مزاج اور شیریں زبان تھے۔ شعر کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ اس فن میں میر درد، میر ضیاء الدین ضیا اور مرزا سودا کے شاگرد ہیں۔
بڑے ہوئے تو دہلی چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کی شہرت ہندوستان میں لکھنؤ ہی سے پہنچی۔ کلام سادہ
لیکن با مزا ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا دیوان قریباً آٹھ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ حسرت موہانی نے اس کا انتخاب
گیارہ سو اشعار میں چھاپا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۱ مثنویاں لکھیں مگر سحر البیان معروف بہ مثنوی بدر منیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء)
میں پرانی دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے اور ۶۰ سال کی عمر پا کر ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ میر مستحسن خلیق، میر احسن
خلق اور میر محسن محسن آپ کے تین لڑکے تھے۔ مرثیہ گو شعراء کے امام میر انیس ان کے پوتے تھے۔
ان کی مثنوی سحر البیان کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:۔
"زمانہ نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعراء اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان، لطف محاورہ،
شوخی مضمون، طرز ادا اور سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے۔ آج کس کا منہ ہے جو ان خوبیوں کے ساتھ پانچ شعر بھی

سوزوں کر سکے۔ قبولِ عام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں سے دل و زباں کے حوالے کیا۔

ان مثنویوں کا ایک مجموعہ مدت ہوئی نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا جس میں سحر البیان، گلزارِ ارم اور رموز العارفین وغیرہ شامل تھیں۔ اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی ان کی یادگار ہے جسے انجمن ترقی اُردو نے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔ حسرت کے علاوہ نولکشور پریس سے بھی ان کی غزلوں کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ایک صاحب علی حسن نے بھی لکھنؤ سے غزلیاتِ میر حسن کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ محترمی ڈاکٹر وحید قریشی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے بڑا زبردست تحقیقی مقالہ میر حسن پر لکھا ہے۔

حسن: حسن رضا خاں ان کا نام تھا۔ بریلی (یو۔ پی) کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۹ء سالِ پیدائش ہے اور ۱۹۰۱ء سنہ وفات۔

حسین: ان کا نام سید صادق علی تھا اور حسین تخلص کرتے تھے۔ تقریباً ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اچھے شاعر تھے۔

(آغا) **حشر:** مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کا نام آغا محمد شاہ تھا۔ وطن کشمیر اور پیدائش امرتسر کی ہے۔ ڈرامہ نویسی کی ابتدا بمبئی میں ہوئی۔ شروع میں بہت سے ڈرامے نیو الفریڈ کمپنی کے لیے تصنیف کیے۔ پھر کلکتے چلے گئے اور وہاں فلم ایکٹر ہو گئے۔ شکریہ یورپ اور موجِ زمزم ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ بہت سے ڈراموں کے مصنف ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ڈرامہ نویسی کے علاوہ غزل گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

حفیظ جونپوری: ان کا نام محمد علی تھا اور حفیظ تخلص کرتے تھے۔ جون پور کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبد القادر کے مشہور رسالہ "مخزن" کے نامہ نگاروں میں سے تھے اور اس میں ان کی نظمیں اور غزلیں اکثر چھپا کرتی تھیں۔

حیا: مرزا رحیم الدین ان کا نام تھا اور حیا تخلص کرتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کے اور پھر ذوق کے شاگرد رہے۔ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔

حیران: میر حیدر علی ان کا نام تھا اور حیران تخلص کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنف میر شیر علی افسوس ان کے شاگرد تھے اور یہ خود راجہ سرب سکھ (یا سرب سنگھ) دیوانہ کے استاد تھے۔ ضلع بہار میں ایک شخص نے ان پر حملہ کر کے قتل کر دیا مگر مرنے سے پہلے انھوں نے بھی نہایت جواں مردی سے اپنے قاتل پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اٹھارویں صدی میں گزرے ہیں۔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے اور راجہ ٹکیت رائے رئیس لکھنؤ کے ہاں سپاہیوں میں ملازم تھے۔ مجموعہ نغز کا مصنف ان کی

شاعری کے متعلق لکھتا ہے: خوش بگو تدامادعوی شاعری خیلے دردماغش جاگردیدہ۔

خلیق: میر مستحسن نام، خلیق تخلص، میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر کے فرزند، میر انیس کے والد اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے، پھر صرف مرثیہ کہنے لگے اور اسی میں نام پیدا کیا۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن کا شوق ہوا۔ گھر میں غربت تھی۔ غزلیں بیچ بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے۔ کلام نہایت فصیح و بلیغ اور صاف و شستہ ہوتا تھا۔ ۱۸۵۶ء کے قریب انتقال کیا۔

داغ: مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہان استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی غزل گو شعراء کے امام ہیں۔ ۵۔ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پائی۔ فارسی غیاث اللغات کے مصنف غیاث الدین سے اور فن خوش نویسی مشہور عالم خطاط میر پنجہ کش سے حاصل کی۔ نظم میں استاد ذوق کے شاگرد اور جرأت کے مقلد ہیں۔ تیر اندازی، شہسواری اور نشانہ بازی وغیرہ فنون میں بھی طاق تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دہلی سے نکلے اور رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی اور کلب علی والیان رام پور کے درباروں میں رہے۔ نواب کلب علی کے انتقال کے بعد حیدر آباد کا رخ کیا مگر وہاں کسی نے بات نہ پوچھی، چلے آئے۔ کچھ عرصہ بعد نواب محبوب علی خاں والی حیدر آباد نے خود طلب کیا تو ساڑھے تین برس کے بعد باریابی نصیب ہوئی اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی جو بعد میں ایک ہزار ہو گئی اور انھیں نواب حیدر آباد کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ یہ ۱۸۸۸ء کا واقعہ ہے۔ زندگی کے باقی ایام نہایت عیش و آرام اور امن و اطمینان سے کاٹنے کے بعد ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لاڈلی بیگم ایک صاحبزادی چھوڑی جو نواب سراج الدین خاں سائل کی اہلیہ تھیں۔ سلاست، روانی، صفائی، شگفتگی اور شوخی ان کے کلام کا خاص زیور ہیں۔ غزلوں میں خمریات کا بھی بہت سا حصہ ہے مگر خود شراب بالکل نہیں پیتے تھے بلکہ اگر دستر خوان پر کوئی شرابی شریک طعام ہوتا تو کھانا نہ کھا سکتے۔

ان کی مشہور مثنوی "فریاد داغ" منی جان طوائف کی داستان عشق و محبت ہے۔ آخر عمر میں بھی اختر جہاں طوائف دو سو روپیہ ماہوار ان کے یہاں سے تنخواہ پاتی تھی۔ چار دیوان غزلوں کے یادگار چھوڑے "گلزار داغ" "آفتاب داغ" "مہتاب داغ" "یادگار داغ"، مثنوی فریاد داغ۔ بےشمار شاگردوں میں سے بعض شعراء کے نام یہ ہیں۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں، نوح ناروی، نسیم بھرت پوری، رسا رام پوری، بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی، آغا شاعر دہلوی، احسن مارہروی، جگر مراد آبادی۔ سب سے بڑھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال۔

(میر) **درد**: ایک نہایت ہی صوفی منش اور محترم بزرگ تھے۔ نام [illegible] میر تھا، درد تخلص کرتے تھے اس لیے میر درد کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت امام حسن عسکری کی اولاد سے ہیں اور خواجہ [illegible] کے بیٹے تھے۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے تمام مروجہ علوم سے استفادہ کیا اور اپنے زمانہ کے بڑے بزرگ صوفیائے کرام سے فیض حاصل کیا چونکہ

حصول معاش سے بے فکری تھی لہذا تمام وقت ذکر الٰہی میں گزرتا تھا۔ ولی دہلی تھا اور سودا، میر تقی، مرزا مظہر جان جاناں جیسے قادر الکلام ہمعصر ۷۶ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ ایک مرید نے تاریخ کہی ہے

حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

میر درد طبقۂ فقہا و شعراء دونوں میں یکساں عزت و احترام کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کا اردو دیوان نہایت منتخب اشعار کا ایک دلفریب مجموعہ ہے۔ ساری عمر کسی کی ہجو کہی نہ تعریف لکھی۔ تمام دیوان زندگی کے آلام، دنیا کی بے ثباتی، تعلق باللہ اور فقر و استغنا جیسے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ فارسی کا دیوان بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں فارسی میں لکھیں مثلاً رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد، علم الکتاب اور چھوٹے بڑے ایک سو گیارہ رسالوں کا مجموعہ ہے اور تمام تصوف کے مضامین سے معمور ہیں۔ واقعات درد، رسالہ درد حرت تھا۔ ان کی بزرگی اور تقدس اتنا بڑھا ہوا تھا کہ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ ور جب ایک روز مجلس تصوف میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے تو کوئی توجہ نہ دی بلکہ خلاف مجلس ایک حرکت پر سر مجلس ٹوک دیا۔ بادشاہ نے معذرت کی۔ ان کی شاعری کے متعلق آزاد کی رائے سننے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

"چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا ہے اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

ان کے شاگردوں میں قیام الدین قائم، ہدایت اللہ خاں ہدایت، ثناء اللہ خاں فراق، میر محمدی بیدار، مرزا اسمٰعیل طپش اور محمد پناہ نثار مشہور ہوئے۔

دلؔ:- افتخار الملک حکیم مولوی ضمیر حسن دلؔ شاہجہان پوری۔ دور موجودہ کے غزل گو شاعروں میں نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں اور حضرت امیر مینائی کے جانشین ہیں۔ ۱۸۶۲ء میں شاہجہان پور کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر دلائی گئی۔ سترہ برس کی عمر سے شاعری کا چسکا پڑا۔ آپ امیر مینائی کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ عربی میں معقول کی کچھ کتب مولوی محمد علی خیال سے پڑھیں کتب فقہ کا درس مولوی نادر الدین پشاوری سے اور مشکوٰۃ اور جلالین کی تکمیل مولوی بشیر احمد مراد آبادی اور مولوی عبد الباسط شاہجہان پوری سے کی۔ طب باقاعدہ طور پر مولوی حکیم محمود اور ان کے بعد حکیم محمد بشیر اللہ خاں سے حاصل کی۔ حکیم صاحب بلحاظ اخلاق و عادات نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ تقدس و حیاداری کے اخلاق کا امتیازی وصف ہے۔ نہایت ملنسار، ہمدرد، نیک، شفیق و مہربان اور راست باز شخص ہیں اور ہر شخص سے نہایت تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ نغمۂ دل آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام ترانۂ دل کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں نغمۂ دل اور اس کے بعد کا کلام شامل ہے۔ درد دل اور دل سوز نامی ناول بھی آپ نے لکھے ہیں۔ آپ کے شاگرد بکثرت ہیں بعض کے نام یہ ہیں:-

عابد شاہجہان پوری، اورد شاہجہان پوری، مضطر شاہجہان پوری، عبرت بریلوی، قضا جالندھری، طپش فیروز پوری، تسلیم شاہجہان پوری، غلام حسن کسرئی، پیام شاہجہان پوری ایڈیٹر اخبار حمایت اسلام لاہور۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت دل انتقال فرما گئے۔

دیوانہ: رائے سرب سنگھ (بعض تذکروں میں سرپ سنگھ لکھا ہے) تخلص بہ دیوانہ۔ اردو اور فارسی کے نہایت پرگو شاعر تھے دہلی کے باشندے اور قوم کے کھتری تھے مگر وضع قطع اور لباس بالکل ایرانیوں جیسی رکھتے تھے۔ راجہ رام ناتھ دیوان نواب شجاع الدولہ صوبیدار اودھ کے برشتہ زادے تھے۔ جب دہلی تباہ ہوئی تو یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ شیفتہ، دردیہ اور ذوقیہ ان کے تین فارسی دیوان ہیں۔ اردو کا بقول صاحب خمخانۂ جاوید ایک دیوان ہے۔ جعفر علی حسرت اور حیدر علی حیران انہی کے شاگرد ہیں۔ ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۹ء) میں انتقال ہوا۔ کتاب "ہندو ادیب" مؤلفہ ناظر کاکوروی میں ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) سال وفات لکھا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ بڑے جامہ زیب، نفیس مزاج وجیہہ اور شکیل جوان تھے اور بڑی امیرانہ شان سے رہتے تھے۔ مرزا فاخر مکین سے بارہ برس اصلاح لی اور اپنے وقت کے مستند شاعر مانے جاتے تھے۔

ذوق: محمد ابراہیم نام، شیخ محمد رمضان کے بیٹے، ذوق تخلص۔ دہلی کے ایک بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں غلام رسول شوق اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے "خاقانی ہند" کا خطاب پایا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور قصیدہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اپنے دور کے بزرگ ترین شعراء میں سے ہیں۔ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ زبان و بیان اور محاورات کے بادشاہ ہیں۔ علاوہ شعر کے علم و فضل کے بھی مالک تھے۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ علاوہ بہادر شاہ ظفر کے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، نواب مرزا داغ، سید ظہیر الدین ظہیر، سید شجاع الدین انور، نواب الٰہی بخش خاں معروف اور حافظ غلام رسول ویران بھی ذوق کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء کو انتقال کیا۔ بعد میں آزاد نے دیوان مرتب کیا۔

راسخ: "خلاق المعانی" مولوی محمد عبد الرحمٰن المتخلص بہ راسخ دہلی کے مشہور و اعلیٰ مصنف اور شاعر تھے۔ آپ فن شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے جن کا نام وہ خود اس طرح لکھتے ہیں: "مداح رسول بشیر و نذیر حاجی الحرمین شریفین، حافظ القرآن، شیخ الوقت حسان الہند عالیجناب حضرت مولانا مولوی محمد حسین صاحب دہلوی مدظلہ العالی المتخلص بہ فقیر، نقش بندی، چشتی، شاذلی، قادری مصنف کلیات مدحیہ فقیر، تعلیم محمدی و تیغ فقیر بر گردن شریر سابق سفیر قسطنطنیہ بجانب ریاست بھوپال"۔

طالب علمی کا زمانہ تھا اور عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بقول خود مکم بختی کے دن آگئے یعنی سر پہ شاعری کا جنوں آ چڑھا۔ ہنوز تعلیم عربی کا سلسلہ ناتمام تھا کہ شعر گوئی کا شوق مدرسۂ عقل و نقل سے اٹھا کر مصطبۂ حسن و عشق میں لے گیا۔ پیر مغاں سے بیعت ہوئی عنبریں زلفوں کا سلسلہ سنداً ملا۔ عشق ابرو نے تلوار کے گھاٹ اتارا اور کسی کافر ادا کی بانکی چتون نے ایک سیدھے مسلمان کا کام تمام کر دیا۔ یہ مشہور شعر انہی کا ہے ؎

جا وڑی قاف سے باخلد بریں ہے راسخ
جھگڑے ملوڑوں کے پریوں کے پیچے ملتے ہیں

مرآۃ الخیال اور آئینہ کمال دو دیوان یادگار چھوڑے۔ مثنوی مولانا روم کے پہلے دفتر کا منظوم ترجمہ مع شرح کتاب مرقوم کے نام سے

۹۲۔ [illegible] پر نہایت عمدگی سے لیاقت سے لکھا اور ۲۹ اپریل ۱۹۰۵ء کو بڑے اہتمام سے مطبع احسن المطابع دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ آج کل بالکل کمیاب اور نایاب ہے۔ حق یہ ہے کہ بے نظیر شرح اور ترجمہ ہے۔ دوسرے دفتر کی شرح مسکنِ مخدوم کے نام سے اور تیسرے دفتر کی مفتی مقصود کے نام سے بھی تیار کر لی تھی مگر غالباً ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بعارضہ ذیابیطس ۲۹ ستمبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ ۷۴ برس کی عمر پائی۔

مولف خم خانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ قصبہ بنت (نواح پانی پت) کے رہنے والے تھے مگر تعلیم دہلی میں پائی اور یہیں قیام رہا۔ ابتدائے شباب میں اکمل الاخبار، بے مثال پنچ، چیتا، پرزہ اور خیر خواہ عالم کے برسوں ایڈیٹر رہے۔ دہلی سے باہر ان کی شاعری کی شہرت رسالۂ زبان جاری کرنے کے بعد ہوئی۔ طبیعت نہایت ظریف پائی تھی اور زبردست عالم تھے۔ وعظ بہت اچھا کہتے تھے۔ فقہ، معقول، منقول اور کتبِ حدیث پر کامل عبور تھا۔ داغ دہلی کے نوآموز شاعروں کو کہا کرتے تھے کہ راسخ کی موجودگی میں اپنی غزل انہی کو دکھاؤ۔ مرنے سے چار سال پہلے عشقیہ شاعری بالکل ترک کر دی تھی اور وعظ و نصیحت اور درس و تدریس کا اپنا مشغلہ بنا لیا تھا۔

راقم :۔ خواجہ قمر الدین نام، راقم تخلص، وطن دہلی، خواجہ بدر الدین مترجم بوستانِ خیال کے فرزند اور غالب کے شاگرد تھے۔ ریاست جے پور سے وظیفہ مقرر تھا جس پر گزران تھی۔ آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر جے پور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۹۰۹ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ "عقدِ ثریا" تعلیم نسواں کے متعلق ان کی ایک بہت ہی دلچسپ کتاب ہے جو قصہ کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے مگر اس میں کمال یہ دکھایا ہے کہ ہر فقرہ مسجع اور مقفیٰ ہے۔

رخشاں :۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں دہلی کے رئیس اور عربی، فارسی اور اردو کے بے مثل عالم تھے۔ فارسی اور اردو میں بہت اعلیٰ پایہ کے اشعار کہتے تھے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے۔ تاریخ کے بہت بڑے فاضل تھے۔ ایلیٹ صاحب نے اپنی تاریخِ ہند انہی کی مدد سے لکھی تھی۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو انہی کے کتب خانہ میں قلمی موجود تھا جہاں سے ڈاکٹر شیفر نے گورنمنٹ ہند کی وساطت سے وہ فرانس منگوایا اور اسے شائع کیا۔ بعد میں وہی اصل نسخہ مولانا حالی نے نواب صاحب سے لے کر دہلی سے ۱۸۸۲ء میں چھاپا۔ سرسید کی آثار الصنادید پر ایک بہت عمدہ تقریظ لکھی، غالب کے دیوان پر مفصل تنقید کی۔ مسدس حالی کے متعلق ایک لطیف رباعی کہی جو مسدس کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔

باوجود رئیس ابن رئیس ہونے کے نہایت منکسر المزاج اور با اخلاق انسان تھے۔ نایاب اور قلمی کتابوں کا بے نظیر کتب خانہ بڑے شوق سے جمع کیا تھا جس میں بڑی قیمتی قیمتی کتابیں تھیں۔ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۶ جون ۱۸۸۵ء بروز شنبہ انتقال کیا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے فارسی میں پُر درد مرثیہ لکھا۔ حضرت مولانا حالی ان کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عمرے ست کہ دہلی جسدِ بے جان است ——— در زِ قحطِ رجال سر بسر ویران است

اما صد شکر کوکبِ منقش ——— روشن ز فروغ نیر رخشاں است

رسا: ان کا نام خوش حیات بخش تھا اور رسا تخلص کرتے تھے۔ رام پور کے رہنے والے تھے مگر دہلی میں شاعری پروان چڑھی۔ رسا مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی فن شعر میں آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

رشک: میر علی اوسط نام، رشک تخلص۔ مولد فیض آباد۔ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے۔ پھر کربلا جا کر وہیں کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد اور منیر شکوہ آبادی کے استاد ہیں۔ اُنھوں نے زبان کی ایک مبسوط لغت بڑی محنت کے بعد مرتب کی مگر اسے چھپنا نصیب نہ ہوا۔ نظم مبارک اور نظم گرامی ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں وفات پائی۔

رشکی: نواب محمد علی خاں نام، رشکی تخلص۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے فرزند اکبر تھے۔ اپنے والد ماجد کی طرح شعر کا نہایت پاک مذاق رکھتے تھے اور دہلی کی ادبی مجالس کی رونق تھے۔ فن شعر میں غالب سے تلمذ تھا۔ حضرت مولانا حالی کو انھی کا اتالیق مقرر کر کے شیفتہ اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے تھے جہاں آٹھ سال تک مولانا نے یہ خدمت بہت احسن طریقہ پر ادا کی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ہی جہانگیر آباد کے رئیس ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ حضرت مولانا حالی نے بہت پُردرد مرثیہ ان کا فارسی میں لکھا۔

رند لکھنوی: سید محمد خاں نام اور رند تخلص تھا۔ نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۴ ستمبر ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے تو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وفا تخلص اختیار کیا اور میر مستحسن خلیق کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں کی رہائش اختیار کر لی۔ یہاں آ کر خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی اور وفا سے بدل کر اپنا تخلص رند رکھ لیا اور خلیق کی شاگردی کے زمانہ کا سارا کلام دریا میں غرق کر دیا۔

گلدستۂ عشق ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آخر عمر میں کربلا کی زیارت کو عراق جا رہے تھے مگر بمبئی ہی پہنچے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔ تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۷ء کے قریب سمجھ لیجئے۔ دیوان میں غزلیات کے تقریباً سات ہزار اشعار ہیں۔

رنگین: نام سعادت یار خاں، تخلص رنگین۔ سرہند میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پائی۔ فن شعر میں شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ طبیعت ایجاد پسند تھی۔ ہر صنف شعر میں انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ سپاہ گری میں طاق تھے۔ شہسواری اور تیر اندازی میں کمال حاصل تھا۔ گھوڑوں کے علاج میں ماہر تھے۔ دہلی سے نکل کر کچھ مدت مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں بھی بمقام لکھنؤ رہے۔ آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں وفات پائی۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ ریختہ۔ بیختہ۔ آمیختہ اور انگیختہ۔ ان کے علاوہ ایجادِ رنگین، فرس نامہ، رنگین نامہ، مجالسِ رنگین اور مثنوی دل پذیر بھی ان کی تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر صابر علی خاں پروفیسر کرسچین کالج لاہور نے ان پر نہایت مبسوط مقالہ لکھا ہے جو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔

ریاض :- ریاض احمد نام اور ریاض تخلص ہے۔ خیر آباد وطن ہے جہاں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلے لکھنؤ جاکر اسیر کے شاگرد ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے۔ معاصرین کے نہایت بلند پایہ غزل گو شعراء میں سے ہیں۔ ان کے اشعار نہایت دلکش، دل فریب اور دلچسپ ہیں۔ ریاض الاخبار، گلچیں، فتنہ، عطرِ فتنہ، گلکدۂ ریاض اور تحسین وغیرہ پرچے وقتاً فوقتاً نکالے۔ حرم سرا ـــــ اور نظارہ تین ناول بھی آپ کی یادگار ہیں۔ ریاض رضوان کے نام سے آپ کا دیوان چھپ گیا ہے۔ مختلف مضامین عقیل احمد جعفری نے مرتب کر کے "نثر ریاض" کے نام سے شائع کیے۔ اشعار کا انتخاب مے خانہ ریاض کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو انتقال ہوا۔

زکی :- نواب سید محمد زکریا نام، زکی تخلص، کشمیر کے سادات میں سے تھے۔ بمقام دہلی ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں پیدا ہوئے۔ مختلف اوقات میں الٰہ آباد، بریلی، گورکھپور اور بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز رہے۔ عربی اور فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ حدیث، فقہ، تصوف اور نجوم میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی اور خوش نویسی سے بھی بہت زیادہ شوق تھا۔ فن شعر میں طرزِ قدیم کے استاد مانے جاتے ہیں۔ اول اول صہبائی، پنڈت رام کشور تسکل سے اور بعد میں غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ ان کے شاگرد ہیں۔ بدایوں میں ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں انتقال کیا۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

ساحر دہلوی :- پنڈت امرناتھ مدن نام اور ساحر تخلص ہے۔ دہلی کے رہنے والے اور نہایت باذوق، صاحب علم اور پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی تھا۔ آپ رائے بریلی میں ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں پنڈت رام پرشاد رازدان سے شاگرد ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت لائق اور فاضل علماء سے پائی۔ فارسی شاعری میں مولوی عبدالحلیم حاشم کاشانی کے شاگرد ہیں۔ نہایت وسیع الاخلاق، ملنسار اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ وضع قطع میں پرانے بزرگوں کی نشانی تھے۔ مولانا حالی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔ سحرِ ساحر، ترجمہ وشنو پران، ترجمہ گیتا فارسی منظوم آپ کی تصنیفات ہیں۔

سالک :- مرزا قربان علی بیگ نام، مرزا امام بیگ کے فرزند۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ پہلے مومن کے اور بعد ازاں غالب کے شاگرد ہوئے۔ پہلے زار تخلص کرتے تھے پھر سالک کہلانے لگے۔ غالب کے بہترین شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت میں یہ بھی دہلی سے نکلے اور ریاست الور میں جاکر وکیل ہو گئے۔ پھر حیدرآباد دکن جاکر محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ کچھ عرصہ تک وہاں کے ایک ماہنامہ "مخزن الفوائد" کے ایڈیٹر بھی رہے جو نواب عماد الملک بہادر کی زیرِ سرپرستی اس وقت نکلا کرتا تھا۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں آپ کا حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔

سائل دہلوی :- نواب ابوالمعظم سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی دورِ حاضر کے نہایت نامور غزل گو شاعر۔

۱۸۶۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب آپ کے والد اور نواب سعید الدین خاں طالب آپ کے چچا کا نام تھا۔
سائل عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ طب میں بھی خاصا دخل تھا جس میں آپ حاذق الملک حکیم اجمل خاں
صاحب شیدا کے شاگرد تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں آف لوہارو اپنے دادا کی زیر نگرانی ان کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ نواب مرزا داغ دہلوی ان
کے خسر تھے اور فن شعر میں استاد بھی۔ نہایت نفاست پسند اور جامہ زیب بزرگ تھے۔ مشرقی تہذیب کا عمدہ نمونہ اور پرانے بزرگوں کے
اخلاق کا مجسمہ تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ غزلوں کے چھ دیوان یادگار چھوڑے مگر چھپا ایک بھی نہیں۔ ان کے
مفصل حالات عرصہ ہوا دہلی کے رسالہ البیان کے کئی نمبروں میں چھپے تھے۔ کلام کا انتخاب ۹ صفحات پر تذکرہ جدید شعرائے اردو میں دیا گیا ہے۔

سجاد: میر سجاد ان صاحب کا نام تھا۔ آگرہ کے رہنے والے تھے اور شاہ نجم الدین آبرو کے شاگرد تھے۔

سراج دکنی: دکن کے مشہور شاعر تھے۔ سید سراج الدین نام، سراج تخلص اور اورنگ آباد وطن تھا۔ درویش منش اور
فقیر دوست شخص تھے۔ کلام میں شگفتگی، خیالات میں بلندی اور مضامین میں صفائی و سادگی پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں حسن و عشق اور توحید و معرفت سبھی کچھ
ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دیوان پانچ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب منتخب دیوان ہا کے نام
سے ۱۷۵۵ء میں کیا جس میں ۶۰ شعراء کے اشعار ہیں۔ ایک مثنوی بوستان خیال کے نام سے ۱۷۵۹ء میں مکمل کی جس میں ایک ہزار ساٹھ ابیات
ہیں۔ ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ۶ اپریل ۱۷۶۳ء کو انتقال کیا۔

سلیم پانی پتی: ابو الحسن مولوی سید وحید الدین سلیم ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ گھر میں نہایت غربت تھی لیکن
معمولی تعلیم مکتب میں ہوئی پھر لاہور چلے آئے۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا عبد اللہ ٹونکی سے فارسی و عربی کی تحصیل کی۔ مولانا حالی کی سفارش سے سرسید کے لٹریری
اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں ایک رسالہ معارف کے نام سے علی گڑھ سے نکالا جو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ادبی اور تاریخی ماہنامہ تھا۔
پھر یہ پانی پت سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۰۱ء میں بند ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد مولانا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مشہور شہرہ آفاق اخبار
مسلم گزٹ لکھنؤ سے عرصہ تک انہی کی ایڈیٹری میں نکلتا رہا۔ پھر لاہور آ کر کچھ دنوں تک زمیندار میں رہے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں ادب اردو کے پروفیسر
ہو کر چلے گئے جہاں آخر عمر تک رہے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو سرطان کے عارضے میں بمقام ملیح آباد (یو۔ پی) انتقال کیا۔ اردو زبان کے بے نظیر
فاضل اور زبردست ادیب تھے۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر، بے نظیر نقاد اور بہت بڑے ماہر لسانیات تھے۔ نئے الفاظ ایجاد کرنے کی ان میں
خاص قابلیت تھی۔ نہایت زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش ذوق شخص تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ افکار سلیم کے نام سے میں نے ۱۹۳۸ء میں
شائع کیا تھا۔ ۲۱۴ صفحات کی ضخیم کتاب ہے لیکن آج کل کہیں نہیں ملتی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس کی ساری کاپیاں تباہ ہو گئیں۔ میں
نے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی تین جلدوں میں تیار کیا تھا وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔ افادات سلیم کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ چھپ
چکا ہے۔ وضع اصطلاحات ان کی نہایت بلند پایہ علمی کتاب ہے۔ حضرت عمرو بن العاص کی مبسوط سوانح عمری بھی انھوں نے شائع کی تھی۔ سب
سے پہلے مولانا حالی کے مضامین جمع کر کے انھوں نے ہی شائع کیے تھے۔ مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مولانا حالی

کے نام پر سالانہ میلہ بھی پانی پت میں قائم کیا تھا جس پر بہت اچھی اچھی کتابیں انھوں نے شائع کیں۔

سلیمان: نواب مرزا سلیمان شکوہ شاہزادگانِ مغلیہ میں سے اُردو زبان کے بہت زبردست قدردان اور سرپرست گزرے ہیں۔ سلیمان تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے لڑکے تھے اور دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ نواب آصف الدولہ ان کو چھ ہزار روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ ۲۸ سال کامل لکھنؤ میں رہنے کے بعد آگرہ چلے گئے تھے جہاں ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ علی الترتیب شاہ حاتم، مصحفی اور انشا سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ان کا دربار شعرا اور اہلِ علم کا ملجا و ماویٰ تھا اور مرزا ایسا مرکز تھے کہ ہر شاعر و ادیب دوڑا ہوا ان کی طرف چلا آتا تھا اور ان کی سرکار سے وظیفہ، انعام اور خلعت پاتا تھا۔ راقم الحروف کے جدِ امجد شیخ غلام غوث بےخبر مرزا کی سرکار میں بہت معزز عہدے پر تعینات تھے اور لکھنؤ سے مرزا کے ساتھ ہی آگرہ آ گئے تھے۔ اسی سرکار سے وابستگی کی حالت میں ان کی وفات ہوئی۔

اشد ضرورت ہے کہ اُردو کے اس مربی، قدردان اور سرپرست کی ادبی قدردانیوں اور اس کے ادبی و علمی کارناموں کے متعلق ایک مبسوط مضمون مرتب کیا جائے جو اب تک نہیں ہوا۔

سودا: مرزا کا نام محمد رفیع اور باپ کا نام محمد شفیع تھا جو بسلسلۂ تجارت کابل سے دہلی آئے اور یہیں رہ پڑے۔ سودا ۱۱۲۵ھ (۱۳-۱۷۱۲ء) میں پیدا ہوا۔ کابلی دروازہ کے محلہ میں مکان تھا۔ جوان ہوا تو شاعری کی سوجھی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کا شاگرد ہوا۔ پھر شاہ حاتم سے مشورۂ سخن کرنے لگا۔ فارسی چھوڑ کر اُردو شعر کہنے کی ترغیب خانِ آرزو نے دی۔ بہت جلد شاعری میں کمال حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ شاہ عالم شاگرد ہوئے مگر اس وقت کی دلی بدامنی کا گہوارہ ہو رہی تھی۔ مجبوراً ۶۰ برس کی عمر میں دلی سے نکلا اور نواب بنگش کے پاس فرخ آباد میں پہنچا۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ء) میں لکھنؤ آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے بعد آصف الدولہ نے بڑی خاطر مدارات سے رکھا اور چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ نہایت عیش و آرام سے زندگی گزار کر ۴ رجب ۱۱۹۵ھ (۲۶ جون ۱۷۸۱ء) کو ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ شاہ حاتم نے سنا تو کہا "افسوس ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا۔"

سودا کا کلیات بڑا ضخیم ہے جسے حکیم سید اصلح الدین خاں نے مرتب کیا۔ آزاد کی زبانی کلیاتِ سودا کی کیفیت سنیے:

"اوّل قصائد اُردو بزرگانِ دین کی مدح میں اور اہلِ دول کی تعریف میں ہیں۔ اسی طرح چند قصائد فارسی، ۲۴ مثنویاں ہیں، بہت سی حکایتیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال۔ دیوانِ ریختہ جس میں بہت سی لاجواب غزلیں (قریباً ۵ ہزار اشعار) اور مطلع، رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت، ترجیع بند، مخمس اور ہجویں سب کچھ کہا ہے۔ ایک تذکرہ شعرائے اردو کا ہے۔ ایک کتاب عبرۃ الغافلین مرزا فاخر مکیں کے جواب میں لکھی ہے۔"

مرزا اُردو کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بدنام ہجوگو شاعر ہے جس کی ہجو کرتا تھا بقول آزاد "شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتا تھا کہ شیطان بھی امان مانگے۔" سودا کی ہجوگوئی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جانور تک کو نہ بخشا۔ یہ ہجویں عفونت میں سنڈاس سے بدتر ہیں اور اُردو شاعری کی پیشانی پر سیاہ داغ۔

میر سوز: سید محمد میر نام اور سوز تخلص تھا۔ حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد سے ہیں۔ آباو اجداد بخارا سے آئے اور دلی میں آباد ہو گئے۔ میر سوز دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش اور تعلیم پائی۔ جب بڑے ہوئے تو طوائف الملوکی کے باعث وطن سے نکل کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں سے مرشد آباد۔ کچھ دنوں وہاں رہ کر پھر لکھنؤ آگئے۔ یہاں نواب آصف الدولہ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور میر صاحب نے باقی ماندہ عمر یہیں گزاری۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں وفات پائی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ شہسواری و تیر اندازی میں بھی ماہر تھے۔ خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ خوش گفتار، عالی طبیعت اور درویش صفت اور ظریف الطبع بزرگ تھے۔ دیوان تقریباً سات سو اشعار کا مجموعہ ہے۔

سیماب: عاشق حسین نام۔ محمد حسین صدیقی کے فرزند۔ آگرہ کے رہنے والے۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ عربی ادب، اصول، منطق اور فارسی کی تحصیل کے بعد انگریزی کی تحصیل شروع کی۔ ایف۔ اے میں تھے کہ والد کے انتقال کے باعث تعلیم ترک کرنی پڑی اور ریلوے میں ملازم ہو گئے مگر شعر و شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کہا اور آگرہ آکر زبان اردو کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ رسالہ مرصع جاری کیا۔ پھر ۱۹۲۳ء میں جا کر آگرہ اخبار کی ادارت کی۔ پیمانہ نکالا۔ شاعر اور تاج کے ایڈیٹر بھی رہے۔ فن شعر میں داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع بقول خود "عشق محض اور عشق محض" ہے۔ باقاعدہ شاعری کا کالج بنام قصر ادب قائم کیا اور سینکڑوں شاگرد بنائے۔ چار مہینے فالج میں مبتلا رہنے کے بعد ۷۱ سال کی عمر میں ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ بقول خود ۲۸۴ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے صہبائے کلیم، بانگ درویش اور شیرازہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ساز و آہنگ، سرود غم، کار امروز اور دستور الاصلاح بھی ان کی کتابیں ہیں۔ خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔

شاد عظیم آبادی: سید علی محمد نام اور شاد تخلص تھا۔ والد سید عباس مرزا حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی تحصیل قابل اساتذہ سے کی۔ پندرہ برس کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاہ الفت حسین فریاد کی شاگردی کی۔ راسخ عظیم آبادی سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ شاد نے اپنی ساری عمر ادب اور زبان کی خدمت میں گزار دی۔ گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ نیز ایک ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ ۲۳ سال تک لگاتار آنریری مجسٹریٹ رہے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں بمقام پٹنہ انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب، نہایت خوش گو شاعر اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جو بعض چھپ گئی ہیں۔ بعض نہیں چھپیں۔ چھپی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ کلام شاد۔ الہامات شاد۔ فکر بلیغ۔ مکتوبات شاد۔ حیات فریاد اور فکر بلیغ (اصول فصاحت و بلاغت) ان کی سوانح عمری گلشن حیات کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

شاد: ہز ایکسیلنسی راجہ راجایان یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کے۔ سی۔ آئی۔ اے۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ وزیر اعظم ریاست حیدر آباد بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور ادیب۔ عربی، فارسی، انگریزی، تلنگی اور مرہٹی کے فاضل تھے۔ نظم و نثر نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے اور شاد تخلص کرتے تھے۔ اہل علم کے قدردان اور خود بہت صاحب فہم تھے۔ دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نامی دو جرائد کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ نہایت

صوفی مشرب۔ خوش اخلاق، متواضع، منکسر المزاج۔ وسیع الحوصلہ اور مشرقی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے۔ مزاج میں تکبر اور غرور بالکل نہ
تھا۔ جب راقم مضمون ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد گیا اور مہاراجہ بہادر سے بھی ملا تو مہاراجہ بہادر بہت ہی خوش اخلاقی اور تواضع کے ساتھ
پیش آئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے پان بنا کر مجھے مرحمت فرمایا۔ پھر اپنے کتب خانہ سے ایک قلمی کتاب منگوا کر
مجھے دکھائی جو آپ کی اپنی خود نوشت سوانح عمری تھی اور جس پر جابجا مولانا حالی نے اپنے قلم سے اصلاح دے رکھی تھی۔ مہاراجہ
بہادر نظم و نثر کی اکیاون باون کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں بزم خیال۔ جریدہ شاد۔ فریاد شاد۔ مطلع
خورشید۔ خمخانۂ شاد۔ ارمغان وزارت۔ مخزن القوافی۔ مثنوی آئینہ وجود۔ سیر پنجاب۔ روزنامچہ گلبرگہ۔ فسانۂ شیداد وغیرہ۔ ادبی مذاق
نہایت صاف ستھرا اور متین و سنجیدہ تھا۔ آپ کا کلام حسن تخیل، سلاست زبان اور بندش الفاظ کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے۔
تقریباً سارا کلام تصوف کے رنگ میں رنگین ہے۔ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

آغا شاعر دہلوی۔ آغا شاعر کے جد امجد علی نادر شاہ درانی کے ساتھ ہندوستان آئے۔ اور دہلی میں سکونت
اختیار کی۔ والد کا نام آغا عبد علی تھا۔ آغا شاعر دہلی میں ۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پائی۔
فن شعر میں نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی کے شاگرد ہیں۔ پچیس چھبیس برس کی عمر میں جب حیدرآباد گئے تو داغ کی شاگردی
اختیار کی۔ آپ کا کلام قدیم شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ زبان میں شیرینی اور روانی ہے۔ معاشرت قدیم بزرگوں جیسی تھی۔ قرآن پاک
کا منظوم ترجمہ آپ کا کارنامہ ہے۔ غزلیات کا مجموعہ تیر و نشتر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عمر خیام کی رباعیوں کا بھی منظوم ترجمہ
کیا تھا۔ آغا صاحب کے مضامین کا مجموعہ خمارستان کے نام سے شائع ہوا۔ آویزہ گوش، پر پرواز اور دامن مریم بھی آپ کی
کتابیں ہیں۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو وفات پائی۔

شبلی نعمانی۔ دور جائزہ کے بہت بڑے ادیب۔ زبردست مورخ۔ اعلیٰ پایہ کے سوانح نگار اور نہایت
فاضل و عالم بزرگ تھے۔ نظم میں خاص درجہ حاصل نہیں۔ مگر جتنا اور جو کچھ کہا نہایت مقبول ہوا۔ قومی اور تاریخی نظمیں اعلیٰ۔ انھوں نے جتنی
کتابیں سب نہایت بے نظیر تھیں۔ جتنی مبسوط کتابیں تحریر فرمائیں سب اپنے موضوع کے لحاظ سے بیحد قابل قدر تھیں۔ الفاروق
کا جواب تمام اردو لٹریچر میں نہیں۔ شعر العجم پانچ جلدوں میں فارسی شاعروں کی مبسوط تاریخ ہے۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ سوانح
مولانا روم۔ الغزالی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ اسلامی تمدن و تہذیب کے متعلق جس قدر بلند پایہ مضامین انھوں نے لکھے وہ رہتی
دنیا تک مولانا کے نام کو زندہ رکھیں گے۔ کلیات شبلی ان کی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ سب سے آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ ہے۔ جو
ان کا شاہکار کہی جاتی ہے۔ محمد شبلی نام تھا۔ شبلی تخلص کرتے تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔
بڑے بڑے فاضل استادوں سے تعلیم پائی۔ کئی سال تک علی گڑھ کالج میں پروفیسر رہے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی۔
اور اپنا سفرنامہ قلمبند کیا۔ انگریزی گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب پایا۔ ندوۃ العلماء کو قائم کیا۔ ندوۃ المصنفین انہی
کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے جس نے اسلامی تاریخ اور ثقافت کے متعلق نہایت اہم اور نہایت قابل قدر کتابیں شائع

گئی ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔

شرر ۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ اردو زبان کے نہایت باکمال افسانہ نگار اور ناول نویس تھے۔ اردو میں اسلامی تاریخی ناول انھی کی ایجاد ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف، مورخ اور انشا پرداز تھے۔ شعر و شاعری کو انھوں نے اپنی لاجواب تصنیفات سے ماند کر دیا۔ اگر ان کی تمام تصنیفات کی تعداد گنوائی جائے تو ایک لمبی فہرست بن جائے۔ ۱۲ جنوری ۱۸۶۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتقال ہوا۔ ابتدا میں اودھ اخبار لکھنؤ میں کام کیا۔ پھر مختلف اخبارات و رسائل وقتاً فوقتاً خود نکالے۔ جن میں خاص طور پر دلگداز کو نہایت شہرت و قبولیت حاصل ہوئی۔ مصنف، مؤلف اور کامل نویس ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ اور شرر تخلص کرتے تھے۔

شفیق ۔ ان کا نام مولوی سید حسن مرتضیٰ تھا اور یہ مولوی سید حسن رضا صدر الصدور اضلاع مغربی و شمالی کے لڑکے تھے۔ عماد پور (بہار) ان کا مولد و مسکن ہے جہاں یہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور یتیم بچے کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ مگر انھوں نے بڑے ہو کر اس قدر ترقی کی کہ سارا بہار ان کی ذات پر فخر کرنے لگا۔ تعلیم کی خاطر عظیم آباد اور الہ آباد کے سفر اختیار کیے اور ہر جگہ قابل اساتذہ سے علم کی تحصیل کی۔ حکیم عابد علی کوثر خیر آبادی سے طب اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی سے حدیث پڑھی۔ نو برس کی عمر سے شعر کہنے شروع کیے پہلے اپنا کلام کوثر کو دکھایا۔ ان کے بعد شوق نیموی کو۔ ۱۸۹۴ء میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا۔ ان کا زیادہ تر کلام نعتیہ ہے۔ ان کی نظمیں، سلام، نعتیہ اشعار اور رباعیوں اور غزلوں کے علاوہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً خیابان رحمت، حدیقۂ عزت، ثمرۂ عقیدت، عجیبۂ نوبہار، دل صد پارہ۔ اخلاق کی تعلیم پر ایک کتاب تہذیب الاخلاق اور شاعری کے متعلق دو کتابیں منتخب العروض اور تحقیق سخن اور نگارستان (قدیم فارسی انشا پردازی کا نمونہ) گنجینۂ تاریخ وغیرہ۔ ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں انتقال کیا۔

شوق قدوائی ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی نواح لکھنؤ کے رہنے والے، اور مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں سے تھے۔ آپ کی مثنویوں کی زبان نہایت پاکیزہ اور شیریں ہے۔ مدت تک اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کی نظمیں ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ لکھنؤ سے بھوپال آ گئے تھے۔ اور یہاں ۲۰ سال تک ملازمت کی۔ پھر رام پور چلے گئے۔ ازاں بعد لکھنؤ اپنی بیٹی کے پاس جا کر قیام کیا۔ اور وہیں ۲۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو انتقال کیا۔ بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔ قاسم و زہرہ۔ [illegible] مثنوی عالم خیال۔ دیوان بھی چھپ گیا ہے۔

شہیدی ۔ نام کرامت علی تخلص شہیدی اور وطن بانس بریلی تھا۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کا شوق پیدا

بہادر مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور ان کی وفات کے بعد اپنا کلام شاہ نصیر دہلوی کو دکھانے لگے۔ جب کبھی دہلی آتے تو شیفتہ سے بھی صحبت رہتی۔ بقول صاحب سراۃ الشعرا نہایت یار باش۔ زندہ دل۔ بذلہ سنج۔ مرنجاں و مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔"

آخر عمر میں حج کو گئے۔ حج سے فراغت کے بعد جس وقت مدینہ منورہ کے لیے سوار ہوئے اور روضہ اقدس کے سامنے آپ کا ادسے پہنچا تو گنبد پر نظر پڑتے ہی حرکت قلب بند ہو گئی اور آپ کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ وفات ۱۲ صفر ۱۲۵۵ھ (۱۰ اپریل ۱۸۴۰ء) ہے۔ شہیدی کی مشہد شعروں میں ایک نعت کے سبب مشہور ہیں۔

شیدا ۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں المتخلص بہ شیدا۔ دہلی کے نہایت نامور طبیب۔ خاندان شریفی کے چشم و چراغ۔ مجدد طب حکیم محمود خاں کے فرزند اور ملک کے بڑے سیاسی لیڈر تھے۔ ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ... اس وقت کے تمام متداول علوم یعنی منطق، فلسفہ، ادب، طبیعیات، حدیث اور تفسیر وغیرہ میں کامل مہارت پیدا کر لی۔ طب کا فن اپنے بڑے بزرگ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں سے حاصل کیا۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی چند طبی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی زمانہ ریاست رامپور میں گزرا جہاں ان کا محبوب مشغلہ مطالعہ کتب تھا۔ ہزاروں کتابیں ہر علم و فن کی پڑھ ڈالیں۔ اپنے بھائی حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد دہلی آئے اور اپنی آبائی گدی پر بیٹھ کر مطب کرنے لگے۔ طب یونانی کے گہرے مطالعہ کے علاوہ ڈاکٹری کی طرف بھی آپ نے توجہ کی۔ طبیہ کالج دہلی کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ جس کا سنگ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے رکھا تھا۔ ملک کے جن رہنماؤں نے وطن کی آزادی میں حصہ لیا حکیم اجمل خان کا نام ان میں ہمیشہ نہایت بلند مقام پر لیا جائے گا۔ حکیم صاحب کی ہستی ملک کے نہایت محترم رہنماؤں میں سے سمجھی جاتی ہے۔ اور درحقیقت وہ ملک کے حقیقی اور نہایت مخلص خادم تھے۔ ان کی آخر عمر کا بہت کافی حصہ ملک کے سیاسی مسائل کے حل میں گزرا۔ یہاں تک کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو رامپور میں اس یگانۂ روزگار ہستی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے ان کو حاذق الملک کا خطاب دیا۔ جب سیاسی کشمکش بہت زیادہ بڑھی تو انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ جس پر قوم نے ان کو مسیح الملک کا خطاب دیا۔ آپ شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ کلام کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔

ان کی خوبی طبیعت، بلند اخلاق اور عالی کیرکٹر کی یہ مثال نہایت مشہور ہے کہ ان کو علاج کے سلسلہ میں نواب رامپور سے مستقل تنخواہ ماہوار ملتی تھی۔ کسی بات پر نواب کی اور حکیم صاحب کی ان بن ہو گئی۔ اس نے بلانا چھوڑ دیا۔ انھوں نے جانا چھوڑ دیا۔ تنخواہ ایک عرصہ تک بند رہی۔ ... حکیم صاحب کی ضرورت پڑی تو بلا بھیجا۔ حکیم صاحب تشریف لے گئے اور علاج کیا۔ ... پچاس ہزار روپیہ تنخواہ لینے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس عرصہ میں میں نے کام کوئی نہیں کیا، تنخواہ کیوں لوں؟ نواب نے ہر چند اصرار سے رقم پیش کرنی چاہی مگر حکیم صاحب کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

شیفتہ ۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں رئیس دہلی و جہانگیر آباد۔ فن شعر کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ تجوید۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور تاریخ کی تعلیم ہندوستان، مکہ اور مدینہ کے مستند علما و فضلا سے

پائی۔ نہایت عابد و زاہد اور پاک باطن بزرگ تھے۔ پہلے مومن سے اور پھر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ سفرِ حج سے واپس آنے کے بعد شعر گوئی بہت ہی کم کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ان پر بھی بڑی آفت پڑی۔ قید ہوئے۔ جائداد ضبط ہوئی۔ بہ ہزار مشکل چھٹکارا ملا۔ شمس العلماء مولانا حالی ان کے مصاحب اور ان کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ حالی کو شعر کا صحیح مذاق انہی کی صحبت سے میسر آیا۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

آپ کا اردو دیوان حال ہی میں مولوی صلاح الدین احمد صاحب نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ لاہور سے شائع کیا ہے۔ گلشنِ بے خار۔ اردو شعراء کا بہترین تذکرہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔ دیوان فارسی۔ رقعات فارسی۔ سفرنامہ حجاز موسوم بہ رہ آورد بھی اُن کی تصنیفات ہیں۔ ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو بدھ کے دن وفات پائی۔

صابر دہلوی۔ صاحبزادہ مرزا قادر بخش ان کا نام تھا اور صابر تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دیوان صابر ان کی یادگار ہے۔

صبا لکھنوی۔ مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ نام میر وزیر علی ابن میر بندہ علی تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ فن شعر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہیں۔ گھوڑے سے گر کر ۱۳ جون ۱۸۵۵ء کو انتقال ہوا۔ کلام بقول صاحب سراپا سخن دلچسپ اور صاف ہے۔ زبان پاکیزہ اور عمدہ ہے۔ خیالات سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کا دیوان ساڑھے تین ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں ۷۲۲ غزلیں ہیں۔

صفی۔ سید علی نقی زیدی نام۔ صفی تخلص اور لسان القوم لقب ہے۔ ۲ جنوری ۱۸۶۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور محکمہ دیوانی کے چالیس سال ملازمت کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں اگرچہ کسی کے شاگرد نہیں مگر ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں بہت زیادہ دلچسپی اور ان کے کلام میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ صفی کی مشہور مثنوی تنظیم الحیات ہے۔ جس پر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ یہ ’’لائٹ آف ایشیا‘‘ کا ترجمہ ہے۔ اُن کے کلام کا ایک مجموعہ ’’تحفت جگر‘‘ عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ بعد میں بھی ایک دوسرا مکمل مجموعہ تین نامور ادیبوں کی کوشش سے چھپا ہے۔

صنعت۔ ان کا نام شیخ کریم الدین تھا۔ مراد آباد (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ [illegible] کے شاگرد تھے۔ [illegible] میں انتقال ہوا۔

ضیا ۔ میر ضیاء الدین نام۔ ضیا تخلص۔ دہلی کے باشندے اور سودا کے ہم عصر تھے۔ دلّی کی طوائف الملوکی سے گھبرا کر فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ جا رہے۔ پھر عظیم آباد پٹنہ میں جا کر زندگی کے دن پورے کیے۔ جہاں راجہ شتاب رائے رئیس پٹنہ کا لڑکا ان کا مربی اور سرپرست تھا۔ میر صاحب نہایت تنہا پسند بزرگ تھے۔ اور اسی حالت میں عمر گزار دی۔ نہ کسی سے واسطہ رکھا نہ مطلب۔ ان کو سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا بڑا شوق تھا۔ اصناف سخن میں غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ میر حسن انہی کے شاگرد تھے۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے "شاعر خوش گو۔ شیریں گفتار صاحب اشعار آبدار۔ ستودہ اطوار۔ پسندیدہ کردار بود" ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں پٹنہ میں وفات پائی۔

طاہر ۔ سید اطہر علی کے بیٹے۔ طاہر علی ان کا نام ہے اور فرخ آباد کے رہنے والے ہیں۔ امداد حسین صفیر کے شاگرد ہیں۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں مرتب کیا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں مطبع محمدی کانپور میں چھپا (جواہر سخن جلد چہارم بحوالہ دیوان طاہر صفحہ ۲)۔

ظفر ۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے سب سے آخری بادشاہ تھے۔ طبیعت کو شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ اُن کے اکثر اشعار صدا اور اثر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ بالترتیب شاہ نصیر، کاظم حسین بیقرار، محمد ابراہیم ذوق اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر رنگون بھیج دیئے گئے جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال کیا۔ شمس العلماء مولانا حالی کی رائے میں "زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں ظفر کا تمام دیوان یکساں ہے"۔ ان کے چار دیوان ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ دہلی سے چھپ کر شائع ہو چکے تھے۔ جن میں ۲۰ ہزار کے قریب اشعار تھے۔

ظہیر دہلوی ۔ ظہیر الدین نام اور ظہیر تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے اور ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کے والد کا نام سید جلال الدین حیدر تھا جو بہت اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اور فن خوشنویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ بادشاہ کی درگاہ سے صلاح الدولہ مرتع رقم اور خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ بڑے ہوئے تو یہ بھی قلعہ معلیٰ میں بعہدہ قور بیگی ملازم ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز آندھی میں دہلی سے نکلے اور پھر سونی پت، نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ پھر رامپور میں چار برس رہنے کے بعد واپس دہلی چلے آئے۔ تھوڑے دنوں بعد مہاراجہ شیو دان سنگھ والی الور نے بلا لیا۔ چند برس تک رہے پھر بلند شہر میں اخبار جلوہ طور کی ایڈیٹری کرنے چلے گئے۔ پھر نواب احمد علی خاں والی ٹونک کے دربار میں پندرہ سولہ برس تک رہے۔ پھر جے پور میں ملازم ہو گئے۔ ۹ برس یہاں ملازمت کی۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق ہوا۔ وہاں گئے مگر کوئی قدر دانی نہ ہوئی۔ اور وہیں ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ غزلوں کے چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔

عاجز ۔ ان کا نام عارف الدین خاں اور تخلص عاجز ہے۔ ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

عزیزؔ لکھنوی۔ نام مرزا محمد ہادی۔ محمد علی کے لڑکے۔ وطن لکھنؤ اور تخلص عزیزؔ ہے۔ ۵ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ معقول و منقول۔ فقہ و اصول۔ صرف و نحو۔ ادبیات و درسیات کی تعلیم لکھنؤ کے مشہور علما و فضلا سے پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص مضمون ہیں جن میں آپ نے خوب طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ سنہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ گل کدہ و صحیفۂ ولا ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

عظیمؔ۔ مرزا عظیم بیگ المتخلص بہ عظیمؔ۔ شیخ ظہور الدین حاتم المتوفی ۱۲۰۷ھ کے شاگردوں میں سے ایک نامور شاعر تھے۔ انشاء اللہ خاں انشا کے ہم عصر تھے۔ اُن کی ہجو میں ایک پر زور مخمس بھی لکھی ہے۔ یہ اُس عہد کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ مگر ہر صنف کلام میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اشعار میں نفاست بیان اور لطف زبان دونوں موجود ہیں۔ انشاء کی ہجو بڑی دلچسپ ہے جس کا ایک مصرعہ تو بطور ضرب المثل اب تک زبان زد خاص و عام ہے یعنی:۔

ع تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

غالبؔ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُردو اور فارسی کے مسلم الثبوت شاعر۔ اور دَور موجودہ کی اُردو شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ جتنی شاندار ان کی نظم ہوتی ہے اتنی ہی شاندار نثر لکھتے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ کی زبان اس قدر سلیس۔ شیریں۔ اور دلچسپ ہے کہ اُردو میں اس کا کوئی نمونہ اور موجود نہیں۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا پیشہ تیغ زنی اور سپہ گری تھا۔ انھوں نے اپنا پیشہ انشا پردازی اور شعر و شاعری بنایا اور ساری عمر اسی شغل میں بسر کر دی۔ کم ہی لوگوں کو ایسی بلند شہرت نصیب ہوئی ہو گی جیسی غالبؔ کو۔ شادی دہلی میں ہوئی اس لیے ۱۳ برس کی عمر میں دہلی چلے آئے۔ اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا غلام رسول مہر کا صرف ایک فقرہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں "سپہ گری میں اگر غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالدار یا اپنے نانا کی طرح کمیدان بن جاتے۔ مگر ادب و شعر میں انھیں وہ پایہ حاصل ہوا جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب۔ طغرل۔ سنجر۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا (غالب ص ۲۳)
۱۸۵۵ء میں (ذوق کے انتقال کے بعد) بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ کا خطاب ملا۔ جب ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ قید کر کے رنگون بھیج دیئے گئے تو نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی جو آخر تک ملتی رہی۔ مگر ہمیشہ تنگدستی اور حسرت میں مبتلا رہے۔ مولانا مہر غالب کے انتقال کی تاریخ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو دو شنبہ کے دن ادب و شعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا جس کی عالمتابی دہر و معاصر کے لیے سرمایہ ناز اور قرون آیندہ کے لیے منار ہدایت تھی۔" اُن کے انتقال کے بعد ان کے دیوان کی جتنی قدر ہوئی وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔ خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ وہ بار بار چھاپا گیا۔ اتنی مقبولیت غالباً اُردو کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ ممتاز شاگردوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشاں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ [illegible] مرزا قربان علی بیگ سالک۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ اور نواب علاء الدین خاں۔

فانی بدایونی۔ شوکت علی خاں نام تھا اور فانی تخلص کرتے تھے۔ ان کے باپ شجاعت علی خاں سب انسپکٹر پولیس بڑے پکے اہلحدیث تھے اور بیٹے کو مولوی بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی قسمت میں محض شاعر ہونا لکھا تھا۔ فانی بدایوں کے قریب موضع اسلام نگر میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا۔ ۱۱ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور شوکت تخلص رکھا۔ جو آٹھ برس بعد فانی سے بدل لیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول بدایوں سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد بریلی کالج سے بی۔ اے ہو کر علیگڑھ گئے اور ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بریلی میں وکالت شروع کی مگر وہ شاعری کے سر صدقے ہوئی۔ بریلی سے لکھنؤ، لکھنؤ سے اٹاوہ اور وہاں سے آگرہ گئے مگر کہیں بھی وکالت نہ چلی۔ مگر ہاں شاعری ہر جگہ خوب زوروں پر رہی۔ اور شعر و شاعری کا ہنگامہ ہر وقت ارد گرد رہا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے بلاوے پر ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد گئے۔ مگر بد قسمتی بھی ساتھ ساتھ گئی۔ مہاراجہ نے اگرچہ بہت خاطر مدارات کی اور منصفی کی کوشش کی مگر ملی ایک سکول کی ہیڈ ماسٹری۔ بہت افسردہ ہوئے مگر کرنی پڑی۔ تھوڑے دنوں بعد مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ ادھر جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا اُدھر بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ سخت بیمار اور مضمحل رہنے لگے۔ اور مرنے کے دن گننے لگے۔ آخر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو بلاوا آ گیا اور ایک بہت ہی خوش گو شاعر دنیا کے مصائب اور آلام بڑی تکلیف کے ساتھ برداشت کرتا ہوا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

حیدرآباد میں مرزا داغ کی قبر سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر درگاہ یوسفین نامپلی کے مشرقی دروازے کے باہر والے چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

مفصل حالات اور فوٹو ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے اخبار آئینہ دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ دیوان فانی، باقیات فانی، عرفانیات فانی، وجدانیات فانی، کلیات فانی۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔

فدوی، لاہوری۔ فدوی لاہور کے رہنے والے تھے۔ اور ہندو سے برضا و رغبت مسلمان ہوئے تھے۔ صابر علی شاہ صابر ایک صاحب تھے۔ ان کے ہاتھ پر انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور انھیں سے ان کو شاعری میں تلمذ تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد ضابطہ خاں کے منیب ہو گئے تھے۔ یوسف زلیخا فارسی کو انھوں نے ہی اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ پچاس سال سے زیادہ کی عمر پا کر ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا۔

فراق۔ حکیم ثناء اللہ خاں نام اور فراق تخلص ہے۔ میر درد کے مرید اور شاگرد تھے۔ ہدایت اور سودا سے بھی اصلاح لی ہے۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق یہ الفاظ درج ہیں۔ صورت گزیں۔ محبت آگیں۔ سراپا حیا۔ سرا سر وفا۔ شیریں زبان۔ ملاحت بیان۔ فصاحت قرین۔ بلاغت آگیں۔ جادو طراز سحر پرداز۔ صاحب انداز شریف مالک طرز لطیف۔ بقول صاحب مرآۃ الشعرا، اندازاً ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں پیدا ہوئے اور قریباً ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں انتقال کیا۔

فغاںؔ۔ اشرف علی نام اور ظریف الملک خطاب تھا۔ فغاں تخلص کرتے تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ نہایت
حاضر جواب اور لطیفہ گو واقع ہوئے تھے۔ حاضر جوابی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فن شعر میں قزلباش خاں امید کے شاگرد تھے۔ صاحب
گلشن ابراہیمی اور مصحفی کو علی قلی ندیم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ گھبرا کر دلی سے نکلے اور اپنے
چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد میں چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد لکھنؤ آئے۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ نے بہت تعظیم و
تکریم سے پیش آیا مگر نہایت ہی نازک مزاج تھے۔ ایک ذرا سی بات پر نواب سے ناراض ہو کر مرشد آباد چلے گئے اور وہاں راجہ شتاب رائے
کی نوکری کر لی۔ چونکہ نہایت عالی نسب۔ باکمال، شیریں زبان اور علم مجلس کے پورے ماہر تھے۔ اس لیے راجہ صاحب ان کی بہت عزت
کرتے تھے۔ یہ بھی قدردانی دیکھ کر یہیں رہ پڑے اور بڑی فراغت اور عیش کی زندگی گزار کر ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں وفات پائی۔ گلشن
بیخار میں ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۱ء) لکھا ہے۔ آزاد ان کی شاعری کے متعلق کہتا ہے "فن شاعری کے اعتبار سے ان کی زبان نہایت با اصول
اور برجستہ ہے۔ اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے" فن شعر میں ان کے کمال کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔
کہ بقول آزاد "مرزا رفیع جیسے صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے اور بہت تعریف کیا کرتے تھے"۔

فقیہؔ۔ میر شمس الدین نام تھا اور فقیہ تخلص کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مفتون بھی تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے
والے تھے لیکن ۱۱۶۵ھ میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ اور وہیں ۱۱۷۶ھ میں دریا میں غرق ہوگئے۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی موسوم بہ
"تصویر محبت" ان کی تصنیف ہے۔

قائم چاندپوری۔ ان کا نام کوئی تذکرہ نویس محمد قائم بتاتا ہے۔ کوئی قیام الدین علی اور کوئی قائم الدین۔ مگر صحیح نام
محمد قیام الدین ہے۔ والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ وطن چاندپور (ضلع بجنور۔ یو۔ پی) ہے۔ جوانی میں تلاش معاش چاندپور سے
دہلی آکر شاہی توپ خانے کے داروغہ ہوگئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اور یہیں اپنا تذکرہ شعراء "مخزن نکات" لکھنا شروع کیا۔ اس وقت
دہلی کی شاعری عروج پر تھی اور میر تقی میر۔ خواجہ میر درد اور سودا جیسے باکمال شعراء یہاں موجود تھے۔ قائم پہلے شاہ ہدایت اللہ ہدایت
کے شاگرد ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مزاج کے نہایت اکھڑ اور تند خو تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُستاد سے ایسی بگڑی کہ ان کی ہجو
لکھی۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ اُن سے بھی نہ بنی تو سودا کو کلام دکھانے لگے۔ یہ سلطنت مغلیہ کا دور انحطاط تھا جب
کچھ گڑبڑ واقع ہوئی تو قائم دہلی سے نکلے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں عاجز والی ٹانڈہ کے ہاں ملازمت کر لی۔ جو بڑے علم دوست
اور صاحب ذوق بزرگ تھے اور امیر تخلص کرتے تھے۔ ان دنوں مصحفی بھی یہاں ملازم تھے۔ تین ماہ کے بعد یہاں سے رامپور چلے گئے۔
اور فوج میں سپاہی بھرتی ہوگئے۔ یہیں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں وفات پائی۔
مجموعہ نغز میں ہے کہ امروہہ کے قاضی مقرر ہوگئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔ نام کی طرح سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے۔
کسی تذکرہ میں ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) لکھا ہے۔ کسی میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور کسی میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء)۔ مولوی عبدالحق
مقدمہ مخزن نکات میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) کو صحیح بتاتے ہیں۔ قائم کی شاعری کے متعلق آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "ان کا دیوان ہرگز

یہ ہندوستان کے چاہنے والوں سے چھپا نہیں رہ سکے۔ مگر کیا کیجئے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے شہرت نپائی۔" مولوی عبدالحق اس پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں۔ "اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے مگر اُسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ اُس کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہے۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں اپنے استاد سودا کا ہم پلہ ہے۔ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہے۔"

ان کا تذکرہ شعراء نایاب تھا۔ مولوی عبدالحق نے تلاش کر کے اس پر مقدمہ لکھا اور ۱۹۲۹ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دیا۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۳ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ کی زبان فارسی ہے۔ ابتدائی ۲۵ صفحات میں مقدمہ اور قائم کے کلام کا انتخاب ہے۔ پھر ۹۷ صفحات پر اصل تذکرہ ہے۔ قائم کا مختصر مجموعہ کلام مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا۔ کلام کا انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے بھی دیا ہے۔

قدر۔ مولوی سید غلام حسین ان کا نام تھا۔ سید خلعت علی کے بیٹے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے ۱۸۳۲ء میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں بعہد واجد علی شاہ لکھنؤ آئے اور یہیں تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور اس وقت اس وبا میں تقریباً ہر شخص بُری طرح مبتلا تھا۔ انھوں نے پہلے سحر اور برق کی شاگردی اختیار کی۔ جب ان دونوں کا انتقال ہو گیا تو شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لینی شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی چلے آئے اور غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آخر عمر میں حیدرآباد دکن جا کر نواب کے ملازم ہو گئے تھے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی طبیعت ایسی ہی جگہ ہو سکتی ہے۔ عروض و قوافی اور صنائع و بدائع کے استاد تھے۔ ہندی فن عروض کے واقف تھے۔ حاشیہ اعجاز خسروی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔ عروض پر بھی ایک کتاب "قواعد العروض" کے نام سے لکھی ہے۔ کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۴ء کو انتقال ہوا۔

قدرت۔ ان کا نام شاہ قدرت اللہ تھا۔ اور اپنے نام کی مناسبت سے قدرت تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے۔ ۱۷۹۰ء میں انتقال کیا۔

قلق۔ ان کا نام خواجہ ارشد علی اور خطاب آفتاب الدولہ تھا۔ خواجہ بہادر حسین فراق کے فرزند خواجہ وزیر علی وزیر لکھنوی کے شاگرد اور واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ کے درباری شاعر اور مصاحب تھے۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ "دیوان قلق" اور مثنوی "طلسم الفت" ان کی تصنیفات ہیں۔

کمال۔ شاہ کمال الدین ان کا نام تھا اور کمال تخلص کرتے تھے۔ جرأت اور قائم کے شاگرد تھے۔

کیفی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ نام اور کیفی تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد پنڈت کنہیا لال ریاست نابھہ

میں افسر پولیس تھے۔ بچی کا انتقال کیفی کی صغر سنی میں ہو گیا۔ انھوں نے اپنے شوق اور محنت سے علم حاصل کیا۔ دور حاضرہ کے نہایت اعلیٰ پایہ کے ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا شمار ہے۔ نہایت صلح کل اور مرنجان و مرنج پالیسی کے مالک اور بیحد خوش اخلاق۔ ملنسار اور بے تعصب بزرگ تھے۔ عربی و فارسی کے فاضل انگریزی زبان کے ماہر اور اُردو کے اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ سنسکرت و ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ تصانیف یہ ہیں۔ بھارت درپن (جو مسدس حالی کی طرز پر ہندوؤں کے لیے لکھی) خمخانۂ کیفی۔ پریم ترنگنی۔ شوکت ہند۔ توزک قیصری۔ منشورات۔ کیفیہ۔ آئینۂ ہند۔ جگ بیتی۔ خمسۂ کیفی۔ مرأتِ خیال۔ ناگوبہ تیلی و قال جورت اور اس کی تعلیم۔ چراغ ہدایت۔ پریم دیوی۔ نہتا ماجہ۔ راج دُلاری۔ مراری داد او غیرہ۔ آپ کا دیوان "واردات" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ فن شعر میں مولانا حالی سے تلمذ تھا۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو دہلی کے قریب قصبہ غازی آباد میں وفات پائی۔

گستاخ۔ کرامت اللہ خاں نام۔ گستاخ تخلص اور رامپور وطن تھا۔ آپ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا۔

گویا۔ نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا مشہور شاعر۔ جوش ملیح آبادی کے جدِ امجد لکھنؤ کے رہنے والے۔ عربی و فارسی کے جید عالم۔ اور مشہور شاعر تھے۔ نواب اودھ کی سرکار میں رسالداری اور نظامت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ فرائضِ ملازمت کے علاوہ نہایت علم دوست اور خوش طبع بزرگ تھے۔ اہلِ علم اور شعراء کا ہر وقت اُن کے ہاں جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان کا کلام دیوان گویا کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مشہور عالم فارسی کتاب "انوارِ سہیلی" کا سب سے پہلے انھوں نے ہی ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶ء) میں اُردو میں ترجمہ کیا اور بستانِ حکمت نام رکھا۔ ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں انتقال کیا۔

مجروح۔ میر مہدی حسین مجروح میر حسین فگار کے بیٹے اور دہلی کے نہایت خوش گو شاعروں میں سے تھے۔ غالب کے شاگرد اور ذوق۔ مومن۔ آرزدہ۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ ضیاء الدین حالی۔ کے دوست اور معاصر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سے نکلے اور پانی پت چلے گئے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا کر ریاست میں تحصیلداری کا عہدہ دیا۔ مگر وطن کی کشش نے پھر دہلی میں کھینچ بلایا۔ زبان کے لحاظ سے ان کا دیوان اردو لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔ خیالات کی فراوانی اور تخیل کی بلند پروازی مجروح کی غزلیات کو بقائے دوام بخشتی ہے۔ حالی انھیں کے متعلق کہتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز ....!

• یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ قدم شریف کے زیرِ فصیل دفن ہوئے۔

محب۔ شیخ ولی اللہ نام اور تخلص محب ہے۔ آباء و اجداد سرہند کے رہنے والے تھے۔ دہلی آ گر شاہ عالم کے دربار

شاعر مقرر ہوئے۔ پھر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہیں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور دو ایک مثنوی فارسی ان کی یادگار ہے۔ ان کے ہم عصر شعراء قمر الدین منت۔ شکیبا۔ فراق اور قاسم وغیرہ تھے۔ ان کے متعلق مجموعہ نغز میں یہ رائے لکھی ہے "یہ بسیار پرمشق دیوانے مملو بہ الفاظ رنگین سخن ساز دسے یادگار زمانہ است"

محروم۔ لالہ تلوک چند نام۔ محروم تخلص۔ تحصیل عیسیٰ خیل کے ایک گاؤں میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدت تک عیسیٰ خیل اور میانوالی کے سکولوں میں ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۳۴ء میں گورڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی چلے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں ہفتہ وار تیج کی بھی ادارت کی۔ مگر وطن کی یاد سے عارج ستاتی ہے۔ نہایت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ کلام صاف سلیس اور عام فہم ہوتا ہے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جو الفاظ کی برجستگی۔ بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے متعلق اکبر الہ آبادی کی رائے سنیے۔ فرماتے ہیں۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال۔ معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

جمیل احمد ایم۔ اے اپنی کتاب اُردو شاعری کی مختصر تاریخ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "تلوک چند محروم اُردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جذبات و حسیات کی فراوانی ہے۔ زبان غایت درجہ شستہ و پاکیزہ ہے۔ حسن الفاظ، حسن ادا اور معنی آفرینی محروم کے خاص جوہر ہیں۔ نظم میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے۔ انھوں نے نظموں میں جذبات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔" ان کے اشعار کا پہلا مجموعہ "کلام محروم" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ رباعیات محروم۔ گنج معانی اور برق دروش بھی ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ پاکستان کے ادبی پرچوں میں اکثر اپنا کلام بھیجتے رہتے ہیں۔ فارسی کلام بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

محنت۔ مرزا حسین علی بیگ نام محنت تخلص تھا۔ غیاث پورہ (دہلی) کے رہنے والے تھے۔ مگر صغر سنی میں ہی لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں رہنے لگے تھے۔ فن شعر میں قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔

مصحفی۔ نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اور مصحفی تخلص کرتے تھے۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے اور مراد آباد کے باشندے تھے۔ جوانی میں دلی چلے آئے اور یہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ اُس وقت دلی میں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اور بالآخر اس میں کمال حاصل کیا۔ شیخ امانی کے شاگرد تھے۔ دہلی سے نکل کر مختلف مقامات پر رہتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ اور آٹھ دیوان یادگار چھوڑے۔ دو تذکرے اُردو شعراء کے تذکرہ ہندی (۱۷۹۴ء) اور ریاض الفصحاء (۱۸۲۰ء) اور ایک تذکرہ

فارسی شعراء کا عقد ثریا (م ۱۲۰۸ء) فارسی میں ترتیب دیا۔ بقول تنہا "لکھنؤ کی شاعری کے باوا آدم یہی بزرگوار ہیں"۔ آتش، ضمیر، خلیق اور اسیر وغیرہ شعراء ان کے شاگرد تھے۔ یہ ایسے اعلیٰ پایہ کے استاد تھے کہ اپنے شاگردوں کو بھی استاد بنا دیا۔ چنانچہ ضمیر کے شاگرد دبیر اور خلیق کے شاگرد انیس تھے۔ صاحب مراۃ الشعراء نے مصحفی کے کلام پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا "مصحفی کا کلام ہر قسم کا ہے۔ پرجوش بھی اور پردرد بھی۔ شیریں بھی ہے اور پرکیف بھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پھیکا بھی ہے اور بے لطف بھی۔ پھس پھسا بھی ہے اور کمزور بھی۔ بندشیں چست بھی ہیں اور سست بھی۔ مضمون آفرینی کم ہے اور قافیہ پیمائی زیادہ۔ عشق و عاشقی معمولی ہے اور سادگی بہت ہے تصوف بالکل نہیں۔"

مضطر۔ ان کا نام سید افتخار حسین تھا اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ وطن خیر آباد تھا ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

مظہر جانِ جاناں۔ مرزا جانِ جاں یا جانِ جاناں نام مظہر تخلص۔ نہایت صحیح النسب سید اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ والدہ بیجا پور کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ باپ مرزا جان المخلص بہ جانی شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ دادا بھی دربار شاہی کے معزز عہدہ دار تھے۔ پردادا سے شہنشاہ جلال الدین اکبر کی دختر منسوب تھی۔ جب اورنگ زیب دکن میں تھا۔ اس وقت ان کے والد شہنشاہ سے رخصت ہو کر دہلی کو چلے تو راستہ میں مقام کالا باغ (مالوہ) ۱۳ فروری ۱۷۰۰ء کو یہ پیدا ہوئے۔ باپ نے شمس الدین نام رکھا۔ لیکن شہنشاہ نے سنا تو فرمایا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے تو بیٹے کا نام جانِ جاناں ہونا چاہیئے۔ آج باپ کے رکھے ہوئے نام کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ شہنشاہ کا رکھا ہوا نام زبان زد خاص و عام ہے۔ ان کے والد مرزا جان بھی شاعر تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ مظہر ۱۶ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ جوان ہوئے تو صوفیت اور فقیری کو شاہی مصاحبت پر ترجیح دی۔ اور صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کی۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں صوفی باصفا اور درویش کامل بن گئے۔ یہاں تک کہ سینکڑوں ہندو مسلمان آپ کے مرید ہو گئے۔ شعر و شاعری کا شروع سے ذوق تھا۔ مظہر تخلص اختیار کیا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ "آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے نہ صرف زبان کو ثقیل الفاظ سے پاک کیا بلکہ اس میں نئی نئی ترکیبیں بھی ایجاد کیں۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جذبات و تاثر کے ساتھ تصوف سے بھی مالامال ہے۔"

میر تقی میر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں "مرویست۔ مقدس۔ مطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز و مکرم اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف سے کند۔" ان کے پاک باطن بزرگ اور باکمال صوفی ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی جیسا فاضل اجل انسان ان کا مرید تھا اور انہی کے نام پر انھوں نے اپنی مشہور عالم اور بے نظیر تفسیر لکھی ہے۔ جو تفسیر مظہری کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تاریخ وفات بہت سے مصنفین نے مختلف لکھی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ (مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۱ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ انعام اللہ خاں یقین۔

دیوان مال بیقرار۔ میر باقر حزیں۔ احسن اللہ خاں بیان۔ حسرت قلی خاں حسرت۔ شاہ قدرت اللہ قدرت۔ مصطفےٰ خاں یک رنگ۔ محمد نقیہ دردمند

معروف۔ نواب مرزا الٰہی بخش خان نام، معروف تخلص۔ والی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو اور فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور پرہیزگار شخص گزرے ہیں۔ فن شعر میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ بعد میں ذوق سے اصلاح لینے لگے تھے۔ ان کی بیٹی امراؤ بیگم کی شادی مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی تھی۔ معروف نے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں وفات پائی۔ اور درگاہ نظام الدین دہلی میں دفن ہوئے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

مقتول۔ مرزا ابراہیم بیگ نام اور مقتول تخلص تھا۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منت۔ میر قمر الدین نام۔ منت تخلص۔ سونی پت (نزد پانی پت) کے رہنے والے تھے۔ دلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ تمام درسی کتابیں حضرت شاہ عبد العزیز سے پڑھیں۔ فارسی میں میر شمس الدین کے اور اردو میں شیخ ضیاء الدین کے شاگرد ہیں۔ دونوں زبانوں میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ آصف جاہ ثانی والی دکن کے زمانہ میں حیدر آباد گئے اور نواب کی مدح میں قصیدہ کہے پر دس ہزار نقد ملا اور دو سو ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ کلکتہ میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں انتقال ہوا۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں اور گلستان کے جواب میں ایک کتاب نگارستان ان کی یادگار ہیں۔ میر نظام الدین ممنون مشہور شاعر انہی کے فرزند ہیں۔

ممنون۔ میر نظام الدین ابن میر قمر الدین نام۔ ممنون تخلص۔ وطن سونی پت جو پانی پت اور دہلی کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ پنشن کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ صاحب گل رعنا ان کے متعلق لکھتے ہیں "ان کی زبان صاف و شیریں ہے۔ جس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی موجود ہے۔ جس کے باعث کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پامال اور فرسودہ مضامین کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں ایک لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول صاحب مراۃ الشعراء" ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں ایک ضخیم دیوان چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئے۔" شیفتہ جیسا نقاد سخن ان کے متعلق کہتا ہے: "طرز گفتارش خیلے دلچسپ و دل نشیں است و ملاحت کلامش نہایت عذب و شیریں۔"

منتظر۔ میاں نور الاسلام ان کا نام تھا اور منتظر تخلص کرتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منیر۔ ان کا نام سید محمد اسماعیل حسین تھا۔ شکوہ آباد (ضلع مین پوری) کے رہنے والے تھے۔ منیر تخلص کرتے تھے۔

اور ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں پہلے ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ پھر رشک سے اصلاح لی۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص مضمون ہیں۔ جس میں انھوں نے طبیعت کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ طویل گوئی ان کی خصوصیت ہے اور کلام میں مبالغہ کی انتہا نہیں۔ مرثیہ بھی کہتے تھے جس میں وہ دبیر کے شاگرد تھے۔ اُن کی غزلوں میں لکھنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لکھنؤ سے اُن کو عشق بھی بہت تھا۔ کانپور میں نواب نظام الدولہ کے مصاحب رہے۔ اور لکھنؤ میں ظفر الدولہ کے۔ فرخ آباد میں نواب تجمل حسین خاں کے۔ باندہ میں والیٔ ریاست نواب علی بہادر اور آخر میں نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کے ہاں ملازم رہے جہاں ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ ایک طوائف کے قتل کے سلسلے میں کالے پانی کی سزا بھی ہوئی تھی۔۔۔ مگر پھر رہائی مل گئی تھی۔ منتخبات عالم، تنبیہ الاشعا اور نظم منیر ان کے تین مجموعۂ کلام ہیں۔ معراج المضامین ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

مومن۔ دلی کے رہنے والے اور حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ جب پیدا ہوئے تو حضرت شاہ عبد العزیز نے آکر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ عربی ادب میں حضرت شاہ عبد القادر کے اور طب میں اپنے والد [illegible] کے شاگرد ہیں۔ شاعری میں شاہ نصیر سے شرف تلمذ ہے۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا۔ حضرت شاہ عبد العزیز کا وعظ سنتے تو [illegible] دیتے۔ شاعری کے علاوہ نجوم سے بھی شوق تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ نجوم میں ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ شطرنج کا بھی نہایت شوق تھا۔ بقول مولانا حالی شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع اور خوش لباس تھے۔ ساری عمر کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ غیور اس قدر تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ ان کی تصانیف جو وہ مختلف اوقات میں کہتے تھے۔ بعض نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھیں۔ ان میں سے چند آب حیات میں درج ہیں۔ اُن کے کلام کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ غزلوں میں، اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور سے انھیں اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ قصائد اپنے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں۔ مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ان کے چھوٹے بھائی نواب محمد اکبر خاں۔ میر حسین تسکین۔ سید غلام علی وحشت۔ غلام ضامن کرم۔ میر عبد الرحمٰن آسی۔ حکیم منور علی آشفتہ۔ نواب اصغر علی خاں نسیم اور شہزادہ خدا بخش قیصر ان کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی۔

آب حیات کی تدوین کے وقت مومن کے حالات آزاد کو کہیں نہیں ملتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی درخواست پر مومن کے مفصل حالات لکھ کر بھیجے جو آزاد نے آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں شائع کیے مگر وسعتِ قلب کو دیکھیے، مولانا کا نام بالکل نہ لکھا۔ صرف یہ فقرہ تحریر کیا کہ "ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ حالات لکھ کر عنایت فرمائے" اگرچہ لفظ الطاف سے مولانا حالی کے نام الطاف حسین کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس سے سمجھنے والے سمجھ گئے مگر صاف نام نہ لیا۔

مہر :- حاتم علی بیگ نام اور مہر تخلص ہے۔ ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت کے وقت وفاداری سرکار کے صلہ میں خلعت اور دو گاؤں جاگیر میں ملے جن کی آمدنی سے بقیہ عمر عیش سے گزاری۔ اس سے پہلے یاٹی کورٹ میں وکیل تھے۔ چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے شروع کیے۔ نہایت پرگو شاعر تھے۔ تاریخ کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ آگرہ میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انتقال ہوا۔
دیوان مہر۔ پیرایہ سوومن۔ ایارح فرنگستان۔ مثنوی داغ دل۔ داغ دل مہر۔ مثنوی شعاع مہر تصانیف ہیں۔

میر :- غزل گو شعراء کے سرتاج ہیں۔ نام محمد تقی۔ تخلص میر۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ کلام سادہ، دلآویز اور درد و اثر سے لبریز ہوتا ہے۔ ہر صنف شعر میں طبع کی جولانی دکھائی ہے۔ تمام اساتذہ فن ان کی استادی کے قائل ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق بھی ان کو مانتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب	ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حالی کہتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے	غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

شعر میرے بھی ہیں پر درد و لیکن حسرت	میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ان کو اپنی استادی پر خود بھی فخر تھا۔ کہتے ہیں اور کس زور سے کہتے ہیں ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نہایت نازک مزاج۔ خود دار۔ خود پسند اور بے حد قانع اور متوکل شخص تھے۔ آب حیات میں آزاد نے ان کی عجیب عجیب حکایتیں سپرد قلم کی ہیں۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دہلی میں چلے آئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہیں نوے برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ چھ دیوان غزلوں کے یادگار چھوڑے۔ دو واسوخت اور کئی مخمس بھی لکھے۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں۔ شعلۂ عشق۔ [illegible] دریائے عشق۔ اعجاز عشق۔ خواب و خیال۔ معاملات عشق۔ شکار نامہ۔ اژدر نامہ۔ اردو شعراء کا ایک تذکرہ موسوم بہ نکات الشعراء کے مصنف بھی ہیں۔

مرزا رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ قائم۔ یقین۔ مصحفی۔ جرأت اور [illegible] ان کے ہم عصر تھے۔
ان کے فرزند میر عسکری عرف میر کلو بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ عرش تخلص تھا اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔

ناسخ ۔ شیخ امام بخش نام ناسخ تخلص ۔ آبائی وطن لاہور ۔ پیدائش فیض آباد اور شاعری کا میدان لکھنؤ ہے ۔ انشا ۔ قتیل ۔ جرأت ۔ مصحفی وغیرہ کے ہم عصر ہیں ۔ فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہیں ۔ مگر شعر میں وہ نام پیدا کیا کہ بعض مشہور شاعر ان کے شاگرد ہیں ۔ مثلاً خواجہ وزیر ۔ مرزا محمد رضا خاں برق ۔ میر علی اوسط رشک ۔ شیخ امداد علی بحر ۔ منیر شکوہ آبادی ۔ آغا کلب حسین خاں نادر ۔ ورزش اور ریاضت کا بے حد شوق تھا ۔ انتہا یہ ہے کہ ۱۲۹۷ ڈنٹر روز پیلا کرتے تھے ۔ جیسے تنومند اور طاقتور تھے ۔ ایسی ہی خوراک بھی تھی ۔ کھانا اگرچہ ایک وقت کھاتے مگر وہ پانچ سیر سے کم نہ ہوتا ۔ آم کھانے بیٹھتے تو تین چار ٹوکرے ہضم کر جاتے جامنیں آتیں تو پانچ چھ سیر سے کم نہ کھاتے ۔ غرض نہایت پُرخور تھے ۔ مگر کہتے ہیں عموماً تجلید میں رہتے ۔ حقے کا عشق تھا ۔ اور سینکڑوں طرح طرح کے حقے جمع کر رکھے تھے ۔ جن سے ایک کوٹھڑی بھری ہوئی تھی ۔ نہایت درجہ مستغنی المزاج بے پروا ۔ اور عالی دماغ شخص تھے ۔ لگی لپٹی بالکل نہ رکھتے اور جو بات ناگوارِ طبع ہوتی فوراً منہ پر کہہ دیتے تھے ۔ خواہ مخاطب کو کتنی ہی ناگوار گزرے ۔ سیاحی کا بھی شوق تھا ۔ اس سلسلہ میں الہ آباد ۔ بنارس ۔ عظیم آباد ۔ پٹنہ کی سیر کی ۔ دیوان تین ہیں مگر ان میں دو مشہور ہیں ۔ ایک مثنوی بھی لکھی جو حدیث مفصل کا ترجمہ ہے ۔ نظم سراج نام ہے ۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا ۔ اُن کی غزل کے متعلق آزاد کی یہ رائے ہے کہ ”اس میں شوکتِ الفاظ ۔ بلند پروازی اور نازک خیالی تو بہت ہے مگر تاثیر کم ہے ۔“ مزاج کے متعلق آزاد کہتے ہیں کہ ”بہت خوش اخلاق تھے ۔ مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج اور بد دماغ سمجھتا تھا ۔“ مگر اس میں شبہ نہیں کہ نہایت درجہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے ۔ ان کی نازک مزاجی کے بعض بہت دلچسپ لطیفے آبِ حیات میں مرقوم ہیں ۔ قریباً سو سال کی عمر پائی اور ۱۸۳۸ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا ۔

ناطق لکھنوی ۔ ان صاحب کا نام سعید احمد ہے ۔ اور ۱۸۷۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ اس سے زیادہ ان کے حالات نہیں ملے ۔

ناظم ۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اپنے باپ کے بعد ۱۸۵۴ء میں تخت پر بیٹھے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلہ میں ستارۂ ہند کا خطاب اور ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر ملی ۔ فنِ شعر میں غالب کے شاگرد تھے ۔ اور ناظم تخلص کرتے تھے ۔ منطق اور فلسفے کے بھی خوب ماہر تھے ۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال ہو گیا ۔

نثار ۔ میاں محمد امان نام اور نثار تخلص تھا ۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے شاگرد تھے ۔ وطن دہلی تھا مگر لکھنؤ چلے گئے تھے ۔ وہاں شاعروں سے خوب خوب چوٹیں ہوتی تھیں ۔ سودا ۔ درد اور قائم کے ہم عصر تھے ۔

نُدرت میرٹھی ۔ شعیب احمد نام ۔ ندرت تخلص ۔ مولانا احمد حسین شوکت (مجدد السنہ شرقیہ) کے لڑکے ہیں ۔ ۱۸۸۶ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم شروع میں تو اپنے والد سے پائی ۔ پھر اس کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی تعلیم سے

فراغت کے بعد اپنے والد کے اخبار شحنۂ ہند کے سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۰ء میں خود ایک ادبی رسالہ عندلیب نکالا۔ پھر ناصر الاخبار کی ادارت کی اور مختلف اخبارات میں نظمیں اور مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں میرٹھ سے نظارہ جاری کیا اور پھر ۱۹۲۳ء سے آئینہ نکالا۔ آخر عمر میں تین بیٹے اور ایک بیٹی کا اپنے سامنے انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے نہایت دل شکستہ اور غمگین و رنجور رہنے لگے۔ کلام میں شستگی، معانی اور سلاست ہے۔ خون نابۂ دل ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔

نسیم بھرت پوری۔ نام سید ضمیر حسین (ایک تذکرہ میں شبیر حسین لکھا ہے) اور تخلص نسیم ہے۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ اور اکثر اپنے پاس حیدر آباد بلایا کرتے تھے۔ غزل گو شعراء میں بڑا نام پیدا کیا اور اکثر معرکۃ الآرا طرحوں پر بڑے زور کی غزلیں لکھیں۔ ریاست کے محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔

نسیم دہلوی۔ نواب مرزا اصغر علی خاں نام۔ نواب آقا علی خاں قاجار کے بیٹے۔ نسیم تخلص۔ وطن دہلی تھا۔ ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں حکیم مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ خانگی جھگڑوں کے باعث دلی چھوڑ لکھنؤ کی راہ لی۔ کچھ دنوں واجد علی شاہ کے دربار میں رہے۔ لیکن جب وہ معزول ہو کر کلکتہ گئے تو یہ لکھنؤ ہی رہے۔ بعد کے زمانہ میں منشی نولکشور نے ان کو اپنے مطبع میں نوکر رکھ لیا اور لغت لیلہ کو منظوم کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ تقریباً ہی تمام ہوا تھا کہ پیغام اجل آ گیا۔ اور ۳ رمضان ۱۲۸۲ھ (۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

بے پروائی اور آزاد روی کے باعث کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ دیوان شاگردوں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ حسرت موہانی نے انتخاب ۰۰ ۷ اشعار کا چھاپا تھا۔ آپ کے کلام میں تشبیہات و استعارات اور فارسی تراکیب بھی ہیں۔ کلام میں بالعموم شیرینی اور حلاوت ہے۔ غزل آپ کا خاص مضمون ہے۔ حسرت موہانی کی ان کے کلام کے متعلق یہ رائے ہے کہ "لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جلوہ جیسا مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی"۔

نسیم لکھنوی۔ پنڈت دیا شنکر نام۔ پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے۔ نسیم تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ سال پیدائش ۱۸۱۱ء۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد اور شاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر تعینات تھے۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ بیس سال کی عمر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ نہایت طباع، ذہین اور حاضر جواب تھے۔ اور بڑی رغبت کے ساتھ اشعار اُن کے دماغ سے نکلا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اکثر اساتذہ سے فیض حاصل کیا اور فن شعر میں جلد نہایت نامور ہو گئے۔ ۲۵ برس کی عمر میں قصۂ گل بکاؤلی کو نظم کیا اور مثنوی گلزار نسیم نام رکھا۔ یہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی۔ یہی لاجواب اور دلچسپ مثنوی نسیم کی لازوال شہرت کا باعث ہوئی۔ اس مثنوی پر پہلے [illegible] میں موافق و مخالف بہت

سے مضامین شائع ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں برج نارائن چکبست اور مولانا عبدالحلیم شرر میں بڑے زور شور کی قلمی جنگ ہوئی جس کی روئداد کتاب "معرکہ چکبست و شرر" میں مفصل مذکور ہے۔ نسیم نے عین جوانی میں بعمر ۳۲ سال ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ یعنی یہ پھول ابھی کھلا بھی نہ تھا کہ مرجھا گیا۔

ان کی تصنیف گلزار نسیم کے متعلق رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تالیف تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں "اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ برجستگی محاورات۔ نادر تشبیہات و استعارات یہ سب قابل تعریف ہیں البتہ تصنع ضرور ہے۔... یہ مثنوی اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں اس سے پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں" (تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۵)

شاہ نصیر الدین نصیر۔ شاہ نصیر الدین نام۔ نصیر تخلص۔ دہلی کے رہنے والے۔ فن شعر میں شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ دو مرتبہ لکھنؤ گئے۔ حیدرآباد بھی کئی مرتبہ گئے اور آخر ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں وہیں وفات پائی۔ نہایت نیک نفس۔ نفیس طبع۔ لطیف مزاج۔ با وضع اور خوش پوشاک تھے۔ یار باش۔ ظرافت اور زندہ دلی کا گویا مجسمہ تھے۔ ان کا کلیات میرٹھ میں چھپا تھا لیکن آج کل نہیں ملتا۔ ان کی شاعری کا درجہ اس بات سے سمجھ لو کہ ذوق اور مومن ان کے شاگرد تھے۔

نظام۔ سید نظام علی شاہ ان کا نام تھا اور نظام تخلص۔ رامپور کے سیدوں میں سے تھے فن شعر میں پہلے شیخ علی بخش بیمار سے اصلاح لی پھر نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۲ء کو رامپور ہی میں انتقال ہوا۔ دیوان مرنے کے بعد رامپور میں چھپا۔

نظم طباطبائی۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنؤ میں ۲۹ نومبر ۱۸۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید مصطفیٰ حسین طباطبائی تھا جو ایک سپاہی آدمی تھے۔ جب پڑھ لکھ کر قابل ہوئے تو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ کے پاس مٹیا برج کلکتہ میں شاہزادوں کو پڑھانے پر ملازم ہو گئے۔ جب وہ میلہ بچھڑ گیا تو حیدرآباد دکن جاکر نظام کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم بنا دیے گئے۔ مگر پھر واپس کالج میں چلے گئے۔ جب ۳۰ سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے تو شاہزادوں کی تربیت کا کام ان کے سپرد ہوا۔ دارالترجمہ عثمانیہ میں ناظر ادب کی خدمات بھی انجام دیں۔ پھر زنانہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء کو وہیں انتقال ہوا۔ آپ اخلاق و آداب میں پرانے بزرگوں کی ایک مثال تھے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد آپ ہی کے شاگرد تھے۔ شرح دیوان غالب۔ شرح دیوان امراء القیس۔ تشریح الافلاک اور تاریخ یورپ آپ کی تصنیفات ہیں۔ نظم طباطبائی اور دیوان طباطبائی ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

نظر لکھنوی۔ نوبت رائے نام نظر تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پیدائش ۱۸۶۶ء کی ہے۔ فارسی اردو۔ انگریزی اچھی جانتے تھے۔ شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ آغا مظہر کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے رسالہ خدنگ نظر جاری کیا۔ جو سات سال تک جاری رہا۔ ۱۹۱۰ء میں رسالہ زمانہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اور کان پور آکر اخبار آزاد کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ یہاں سے بعد لکھنؤ جا کر "تفریح" کی ادارت کی۔ پھر اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر وہاں سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ آخر میں اخبار خادم ہند کے بھی کچھ مدت ایڈیٹر رہے۔ نہایت سادہ مزاج۔ سادہ وضع اور خوش اخلاق شخص تھے۔ نمود و نمائش اور غرور و تکبر سے بالکل پاک تھے۔ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار ہونے کے علاوہ خوشنویس اور مصور بھی تھے۔ آخری عمر بہت تفکرات اور مصائب میں گزری۔ یہاں تک کہ زندگی سے تنگ آگئے۔ اسی حالت میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔

ان کے متعلق منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کی رائے سنئے "فطرت سے انھوں نے علم و ادب کے لیے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و مستقیم ذوق سخن عطا کیا تھا۔ بچپن میں اُن کو صحبت بہت اچھی ملی جس سے طبیعت میں رفعت۔ مزاج میں متانت اور عادت میں سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ ذہن بلا کا تھا۔ معیار خیال بہت اونچا اور مطمع نظر نہایت بلند تھا۔"

نظیر اکبر آبادی۔ ولی محمد نام۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ نظیر تخلص تھا۔ ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس موقع پر یہ دہلی سے نکلے اور اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں ۹ کتابیں لکھیں۔ سید زوار حسین صاحب نے ۱۹۵۲ء میں لاہور سے اردو شاعروں کا ایک البم نہایت ہی نفاست کے ساتھ آرٹ پیپر پہ شائع کیا تھا جس میں تصاویر کے ساتھ ہر شاعر کے مختصر حالات بھی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں۔ "نظیر ایک نغز گو اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ فن شعر میں کسی کے مقلد نہ تھے۔ بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ اُن کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ انسانی ہمدردی۔ جزئیات کا مطالعہ اور ہمہ گیر تخیل ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان پر قدرت۔ معاشرتی حالات پر عبور۔ فطرت کی رمز شناسی۔ مناظر قدرت کی مصوری۔ مختلف فنون کا وقوف۔ سیاسی بصیرت۔ رفتار زمانہ سے دلچسپی۔ اختراع۔ الفاظ کا سلیقہ۔ ظرافت۔ سوز و گداز اور ترنم۔ غرض نظیر میں شاعری کے سارے لوازم اور محاسن موجود ہیں۔ نظیر نے اردو زبان میں نئی بندشوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند سب سے پہلے انہوں نے لگایا۔ نظیر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو۔ اور معیشت و معاشرت کا کوئی انداز۔ احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو کلیات نظیر میں نہ ملتا ہو"۔ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں آگرہ میں انتقال کیا۔

نوا۔ ان کا نام شیخ ظہور اللہ تھا اور نوا تخلص کرتے تھے۔ بدایوں کے رہنے والے اور وہاں کے صدیقی خاندان

سے تعلق رکھتے تھے۔ بدایوں سے لکھنؤ جا کر شاہ اودھ کے ہاں نوکر ہو گئے اور "خان" کا خطاب پایا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے ایران گئے اور بہت دنوں تک وہاں رہ کر عوام وخاص کے دلوں پر اپنے علم وفضل کا سکہ جمایا۔ پھر واپس لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۱۲۲۳ھ میں انتقال کیا۔

نوح ناروی۔ ہندوستان کے غزل گو شعرا میں نہایت مشہور شاعر ہیں۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خود ... سے زیادہ شاگردوں کے استاد ہیں۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ ساری عمر حسن وعشق اور ہجر ووصال کے جھگڑوں میں گزار دی۔ سوائے اس کے کچھ کام نہ کیا۔ سفینۂ نوح۔ طوفان نوح۔ اور اعجاز نوح ان کے کلام کے ضخیم مجموعے ہیں۔ مدت دراز سے ماہوار رسالہ زمانۂ تسنیم پہلے لاہور سے اور اب دہلی سے ان کی زیر سرپرستی نکل رہا ہے۔ نام محمد نوح ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء کو بھوانی پور (ضلع رائے بریلی) میں پیدا ہوئے۔ وطن نارہ (ضلع الٰہ آباد) ہے۔

نیاز۔ شاہ نیاز احمد ان کا نام تھا۔ نیاز تخلص کرتے تھے۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔

واقف۔ شاہ واقف کے نام سے مشہور تھے۔ اور سودا کے معاصرین میں سے تھے۔ لکھنؤ میں سکونت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں وفات پائی۔

وحشت۔ رضا علی نام۔ مولوی شمشاد علی کے فرزند۔ وحشت تخلص۔ کلکتہ کے رہنے والے اور وہیں ۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ فن شعر میں مولوی ابوالقاسم محمد شمس کے شاگرد تھے۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کلکتہ میں ملازم ہو گئے۔ پھر اسلامیہ کالج کلکتہ کی پروفیسری پر چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۳۶ء میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں "وحشت کے کلام میں جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی طرز ادا ان سے خوب بن پڑتی ہے۔" ان کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی قیامت میں جب دلی اجڑی تو ان کے دادا حکیم غالب علی دہلی چھوڑ کر بنگال چلے گئے تھے۔

کلام کا پہلا مجموعہ دیوان وحشت کے نام سے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ جس کی مولانا حالی نے بڑی تعریف کی۔ ۱۹۵۰ء میں ترانۂ وحشت کے نام سے ان کے مکمل کلام کا مجموعہ لاہور سے شائع ہوا۔ جس میں قریباً ۴ ہزار اشعار ہیں۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو آپ نے وفات پائی۔

وزیر لکھنوی۔ خواجہ محمد وزیر نام تھا اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کی اولاد سے تھے۔

وطن لکھنؤ تھا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ فنِ شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے اور نہایت فارغ، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ واجد علی شاہ اودھ نے دو مرتبہ دربار میں بلایا مگر نہ گئے۔ آخر عمر میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور علمِ جفر سے شوق پیدا ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں وفات پائی۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جس میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

وفا رامپوری ۔ حکیم عبدالہادی خاں ان کا نام تھا رامپور کے رہنے والے تھے۔ داغ اور امیر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

ولا ۔ اصلی نام مرزا لطف علی خاں مگر مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ولا تخلص تھا۔ شیفتہ نے والا لکھا ہے۔ سودا، مصحفی اور مصحفی کے شاگرد ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت بہت اچھی جانتے تھے۔ اردو تو مادری زبان تھی۔ وطن دہلی تھا۔ دیوان کا قلمی نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی اور ہندی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھے۔ جہاں پر انھوں نے ترجمہ مادھونل اور کام کلا، کریما کا ترجمہ، ترجمہ ہفت گلشن، اتالیق ہندی، ترجمہ بیتال پچیسی، ترجمہ تاریخ شیر شاہی، توزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ، غرض کئی کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں وفات پائی۔

ولی دکنی ۔ ان کے نام میں سخت اختلاف ہے۔ کوئی شمس الدین بتاتا ہے، کوئی شمس الحق۔ مولا کسی کا خیال ہے کہ نام ولی الدین تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں جناب ولی تھا۔ کوئی ولی محمد لکھتا ہے تو کوئی ولی اللہ۔ غرض مختلف تذکروں میں مختلف نام ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ مولد بعض اورنگ آباد دکن بتاتے ہیں بعض احمد آباد گجرات۔ لیکن ہاں اس امر پر سب متفق ہیں کہ انتقال احمد آباد میں ہوا۔ سنہ ولادت میں بھی اختلاف ہے۔ صاحب قاموس المشاہیر سنہ ۱۰۴۳ھ بتاتے ہیں مصنف مرآۃ الشعراء ۱۰۶۲ھ لکھتے ہیں۔ اسی طرح سنہ وفات کوئی سنہ ۱۱۴۲ھ بتاتا ہے کوئی ۱۱۵۵ھ۔ ڈاکٹر ظہیر الدین اپنی کتاب "ولی گجراتی" میں ۴ شعبان ۱۱۱۹ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۷۰۷ء) لکھتے ہیں۔ ولی اب تک اردو شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ ان سے پہلے بھی کئی اردو شعرا گزرے ہیں۔ ان کا کلیات انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ دلی وہ بھی آئے تھے اور حج کو بھی گئے تھے۔ ان کا کلام قدیم اور متروک الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ اور نہ دکنی میں ایسی کوئی لغت موجود نہیں جس سے ان فرسودہ الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔ آپ "نور المعرفت" کے بھی مصنف ہیں جو فنِ سلوک میں ہے۔ ولی شاعری میں سعداللہ گلشن کے شاگرد ہیں۔

ہادی ۔ ان کا نام میر محمد جواد تھا۔ اور ہادی تخلص کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔ دیوان ہادی چھپ گیا ہے۔

ہاشمی ۔ میر ہاشم ان کا نام تھا۔ اور نام ہی کی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔

ہجر - نواب ناظم علی خاں نام تھا اور ہجر تخلص ۔ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے اور داغ کے شاگرد تھے ۔

ہدایت - شیخ ہدایت اللہ نام ۔ ہدایت تخلص ۔ اردو کے مشہور شعرا میں سے ہیں ۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق لکھا ہے "بزرگے بود درویش دل ۔ مسکین نہاد مردالاشراد ۔ سراپا حلم ۔ سر بسر حیا ۔ یکسر مہر ۔ یک قلم وفا ۔ نیک محضر ۔ پاکیزہ سیر ۔ محبت پرور ۔ مروت گستر ۔ صاف دل ۔ یک رو ۔ صافی طینت ۔ فرخندہ خو ۔ نہ بر دل کس از وے غبارے نہ بغبار حدے او را عارے ۔"

ان کے اشعار کے متعلق صاحب مجموعہ نغز کے الفاظ یہ ہیں "فصاحت کلامش مستغنی البیان است و بلاغت سخنش بے پروا از تبیان روزمرہ زبان ازو سے معنی کہ بوشش افتادہ بکسے کم دست بہم دادہ ۔ محاورۂ گفتگوئے ریختہ کہ بدستش رسیدہ در شعر احدے ایں فقیر ندیدہ ۔" ان کا دیوان ۹ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے "چراغ ہدایت" نامی ایک کتاب کے بھی مؤلف ہیں جو تصوف میں ہے ۔ ان کے علاوہ چند مثنویاں اور بھی لکھی ہیں ۔ قیام الدین قائم اور قدرت اللہ قاسم ان کے شاگرد تھے ۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں پیدا ہوئے ۔ اور ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں وفات پائی ۔

ہوس - نواب مرزا محمد تقی خاں شوستری ۔ موتمن الدولہ نواب محمد اسحٰق خاں صوبہ دار گجرات کے پوتے اور نواب مرزا علیخاں دلاور جنگ کے فرزند تھے ۔ پہلے میر تخلص کرتے تھے ۔ پھر ہوس کرنے لگے ۔ عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ مگر جو کچھ کہا ہمیشہ دہلی کے رنگ میں کہا ۔ مشاعروں میں کم شامل ہوتے تھے ۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں شوخی تھی ۔ اپنے وقت میں لکھنؤ کے نامی شاعروں میں شمار ہوتے تھے ۔ اردو میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ انھوں نے ہی لکھا تھا ۔ ایک دیوان بھی چھوڑا ۔

یکیٰ - یکیٰ خاں نام اور یکیٰ تخلص تھا ۔ دہلی کے نہایت معزز اور رئیس شخص تھے ۔ آخر عمر میں سورج مل جاٹ کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا ۔

یقین - ان کا نام انعام اللہ اور ان کے والد کا نام شیخ اظہر الدین خاں ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ شاعری میں مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد ہیں ۔ جوانی ہی میں اپنے باپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے ۔ سنہ انتقال ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۵ء) ہے ۔ میر تقی میر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ محتاج بہ تعریف و توصیف نیست ۔ منشی لچھمی نرائن شفیق تذکرہ چمنستان شعراء میں کہتے ہیں "یقین یکتائے عصر و یگانہ زمانہ است ۔ چشم روزگار چنیں معنی آفرینے نکتہ رس ندیدہ ۔" میر حسن فرماتے ہیں "اشعارش بسیار نمکین و موثر ماند" مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں "تمام قسم کے اشعار میں ہر دا کمال" گلشن بیخار میں ہے "کلامش سیر نمک است حلاوت دلخواہ دارد ۔"

اختر انصاری - یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء ان کی تاریخ پیدائش اور وطن بدایوں۔ مگر عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ وہ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۳۰ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڑھ سے بی ٹی کرکے وہیں ملازم ہو گئے۔ بعد میں ایم۔ اے کیا۔ اور مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں لکچرار ہو گئے۔ بہ نسبت غزل کے قطعات بہت اچھے کہتے ہیں۔ کلام کے یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نغمۂ روح۔ آبگینے۔ خندۂ سحر۔ خون ناب۔ ناظم ہونے کے علاوہ آپ فسانہ نگار بھی بہت اچھے ہیں۔

اختر حیدر آبادی - علی اختر المتخلص بہ اختر حیدر آبادی دراصل علی گڑھ (یو۔ پی) کے رہنے والے ہیں۔ رامپور۔ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۸۹۳ء ہے۔ ۱۹۱۱ء سے حیدر آباد دکن میں ملازم رہے۔ اس لیے حیدر آبادی کہلاتے ہیں۔ شعر کا شوق بچپن سے تھا۔ اس فن میں اپنے والد حضرت ناسخ کے شاگرد ہیں۔ ان کی غزل اور نظم دونوں پختہ ہیں۔ ان کے کلام میں پختہ شاعری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مبالغہ اور غزل قدیم طرز سے پرہیز کرتے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ [illegible] ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

اختر شیرانی - نام داؤد خاں اور تخلص اختر تھا۔ مشہور فاضل اور محقق حافظ محمود خاں شیرانی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور افغانوں کے قبیلہ شیرانی سے تعلق تھے۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں والیٔ ٹونک کی نظر عنایت کے باعث حافظ صاحب اور اختر لاہور آ گئے۔ ۱۹۲۱ء میں [illegible] پڑھ کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کا۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا۔ پہلی نظم جو کہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ جو اتنی شاندار تھی کہ اس نے ان کے نام کو سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا۔ مختلف اوقات میں ہمایوں۔ انتخاب۔ بہارستان۔ خیالستان۔ رومان اور مولانا تاجور کے رسالہ شاہکار کے ایڈیٹر رہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں بھی کام کرتے رہے اور ادارہ اردو مرکز میں مولانا تاجور کے معین و مددگار رہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں وطن واپس چلے گئے مگر تقسیم ملک کے بعد پھر لاہور آ گئے۔ کثرت شراب نوشی نے ان کے دل، دماغ اور دوسرے اعضا پر بہت برا اثر کیا۔ جس کے باعث یہ نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کا شاعر بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میو ہسپتال لاہور میں انتقال ہوا۔ اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی رومانی شاعری نہایت پُراثر، نہایت دلچسپ اور پر لطف ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

صبح بہار۔ اخترستان۔ لالۂ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز۔ پھولوں کا گیت۔ نغمۂ حرم۔ شہرود

ان کے علاوہ ان کی تالیفات و تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں۔

آئینہ خانے میں (بارہ افسانوں کا مجموعہ)

جوامع الحکایات (ترجمہ از فارسی) برائے انجمن ترقی اردو۔ دو جلد۔

دھڑکتے دل (ادبی مضامین۔ تراجم اور افسانوں کا مجموعہ)

گرہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھو " (مختلف ادیبوں اور فنکاروں کے ڈرامے کا مجموعہ)
ان کے متعلق ان کے دوست حکیم نیر واسطی نے جو کتاب " اختر و سلمیٰ " کے نام سے لکھی ہے پڑھنے کی چیز ہے ۔

اختر ۔ پنڈت ہری چند المتخلص بہ اختر ہندوستان و پاکستان کے شاعروں میں سے ہیں ۔ وطن ہوشیار پور ہے۔ تقسیم ملک تک لاہور میں مقیم رہے ۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم اے ہیں ۔ شروع ہی سے مضمون نگاری اور شعر و شاعری سے نہایت درجہ لگاؤ تھا ۔ فارسی میں بہت سے مضامین رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں وقتاً فوقتاً لکھے ۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے ۔ سن شعور کے بعد ابتدا میں چند سال تک اخبار نویسی کی ۔ بعد ازاں دفتر پنجاب اسمبلی اور محکمہ اطلاعات میں کام کیا ۔ دوسری جنگ عظیم میں سرکار انگریزی کے جنگی پراپیگنڈے کے محکمے سے متعلق رہے ۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے ۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا ۔

آزاد ۔ جگن ناتھ آزاد اردو کے موجودہ شعرا میں خاص شہرت کے مالک ہیں ۔ ان کی نظمیں نہایت درجہ درد ، اثر اور جذب میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں ۔ منشی تلوک چند محروم کے فرزند اور عیسیٰ خیل (میانوالی) کے رہنے والے ہیں ۔ سال پیدائش دسمبر ۱۹۱۸ء ہے ۔
ان کی تمام تعلیم پنجاب میں ہوئی ۔ بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد روزنامہ "جئے ہند" کے سب ایڈیٹر ہو گئے ۔ جو اس زمانہ میں لاہور سے نکلا کرتا تھا ۔ کچھ دنوں روزنامہ احسان سے بھی متعلق رہے ۔ پھر ایم ۔ اے کا امتحان دیا ۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل بھی ہیں ۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے والد کے ہمراہ دہلی چلے گئے ۔ وہاں اردو کے مشہور ہفتہ وار روزنامہ "آج کل" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے ۔ اُن کے کلام کے تین مجموعے اس وقت تک چھپے ہیں ۔ ایک " بیکراں " اور دوسرا " ستاروں سے ذروں تک " تیسرا " وطن میں اجنبی " " اردو " پر بھی اُن کی ایک بلیغ نظم چھپ چکی ہے ۔ سنا ہے کہ اقبال پر ہندی پر ایک مبسوط کتاب آج کل لکھ رہے ہیں ۔

اسد ملتانی ۔ محمد اسد خاں المتخلص بہ اسد ماہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے ۔ وطن ملتان ہے ۔ ۱۹۲۴ء میں بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد الشمس نامی ایک اخبار ملتان سے جاری کیا ۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت کی اور سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے ۔ تقسیم ملک کے وقت لاہور اپنی سابقہ ملازمت پر آ گئے ۔
شعر و شاعری کا شوق آٹھ نو برس کی عمر سے ہوا اور عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ۔ وہ ایک مشہور اور کامیاب شاعر ہیں ۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا ۔

حبیب اشعر ۔ حکیم حبیب احمد نام ، اشعر تخلص ۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ دہلی کے معزز ترین

خاندان شریفی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں قرآن حکیم کی تعلیم حافظ بشیر حسین سے حاصل کی۔ فارسی کی تحصیل مولوی جلال الدین سے کی۔ عربی مشہور منطقی و فلسفی بزرگ مولوی عبد السلام سے پڑھی۔ طب کی سند حکیم مولوی محمد مبین پروفیسر طبیہ کالج دہلی سے لی۔ اور تقسیم ملک کے وقت دہلی سے لاہور چلے آئے۔ یہاں شاہی محلہ میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کا مطب "دواخانہ حاذق الملک" رنگ محل میں ہے۔ نہایت قابل اور لائق نوجوان ہیں۔ ملک کے مشہور ادیب اور عربی کے بہت اچھے مترجم ہیں۔ آپ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "راز و نیاز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تراجم کی تفصیل جو آپ نے اب تک کئے ہیں اور شائع ہو چکے ہیں حسب ذیل ہے۔

جبران خلیل جبران کے ترجمے۔ ٹوٹے ہوئے پر۔ شیطان۔ دلہن کی سیج۔ بنفشہ کا پھول۔ ریت اور جھاگ۔ اشک و تبسم۔ پکار۔ مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے تراجم۔ رغمانہ تاج اور شہنانہ۔ نیز محمد حسین ہیکل کی کتاب عمر فاروق۔

ان کے علاوہ متعدد ادبی اور تاریخی عربی کتابوں کے بھی آپ نے نہایت سلاست اور روانی کے ساتھ ترجمے کیے ہیں۔

اکبر۔ چوہدری جلال الدین المتخلص بہ اکبر ستمبر ۱۹۰۸ء میں موضع علی وال نہراں والا (ضلع گورداسپور) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چوہدری فتح علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی، انٹرنس کا امتحان ایم۔ بی ہائی سکول گوجرہ سے دیا۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ بی۔ ٹی کی تعلیم سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پائی اور پھر معلمی کو پیشہ اختیار کیا۔ نقش ارژنگ ان کے کلام کا مجموعہ ۱۹۲۶ء میں چھپا۔ ۱۹۳۰ء میں ایک مرد روحانی حاجی حافظ حاکم علی سے بیعت کی اور ۱۹۴۶ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے۔ اکبر ایک غزل گو شاعر ہیں۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو "ان کے تغزل میں ایک سادگی ایک دھیما پن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ جذبات عام طور پر بلند ہیں اور ان میں بڑی کشش ہے۔ ان کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت و روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں۔"

مجید امجد۔ عبد المجید نام امجد تخلص۔ عام طور پر مجید امجد کہلاتے ہیں۔ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ جہاں یہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ راقم الحروف نے ۱۹۳۲ء میں جھنگ مگھیانہ جا کر وہاں سے ایک نیم سرکاری اخبار اصلاح دیہات کے لیے جاری کیا، اور عروج اس کا نام رکھا۔ خرابی صحت کی بنا پر مجھے وہاں سے ۱۹۳۵ء میں استعفیٰ دینا پڑا۔ تو مجید امجد صاحب ہی میری بجائے عروج کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور عرصہ تک وہاں کام کرتے رہے۔ یہ اخبار آج کل بھی پرائیویٹ ملکیت میں نکلتا ہے۔ اور غلام محمد صاحب رنگین اس کے ایڈیٹر ہیں۔ مجید امجد صاحب آج کل منٹگمری میں راشننگ انسپکٹر ہیں۔

انجم رومانی۔ فضل الدین نام ہے اور انجم تخلص۔ موضع سلطان پور لودھی (ریاست کپورتھلہ) میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج میں شعبہ ریاضیات کے صدر ہیں۔

خیال رکھتے۔ اور کسی کو حتی الوسع اپنے سے ناراض ہونے کا موقع نہ دیتے۔ جو شخص ان سے ایک مرتبہ ملتا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ جس چیز میں حسن اور نفاست نظر آتی اُسے بے حد پسند کرتے اور وہ فوراً خرید لیتے۔ خواہ وہ ان کے کام کی نہ ہوتی۔ صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتے۔ اولاد کو مارنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے سخت خلاف تھے۔ بچوں سے بچہ بن کر نہایت الفت اور محبت سے باتیں کرتے۔ غرض نہایت عیش و مسرت کی زندگی گزارتے ہوئے پاکستان کا یہ نامور ادیب، شاعر اور انشاپرداز ہم سے رخصت ہوا۔

تبسم۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم پاکستان کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ وطن امرتسر ہے۔ جہاں آپ ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں علوم شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل ہو گئے۔ اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ فارسی کے بہت اچھے فاضل ہیں۔ آپ کا فارسی کلام نہایت شستہ اور شائستہ ہوتا ہے۔ اردو کلام میں بھی نہایت سلاست اور روانی ہے۔

جذبی۔ معین احسن جذبی کا سال ولادت ۱۹۱۲ء۔ شروع کی تعلیم جھانسی میں پائی۔ بعد ازاں آگرہ، لکھنؤ اور دہلی میں پھرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں رسالہ آج کل کے ایڈیٹر رہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے لکچرار ہو گئے۔ اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ اشعار بڑی خوش آوازی سے پڑھتے ہیں۔ اور موجودہ شعرا میں بہت مقبول ہیں۔ "فروزاں" ان کے کلام کے مجموعہ کا نام ہے۔

جگر۔ نام علی سکندر، تخلص جگر، اور وطن مراد آباد ہے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ دورِ حاضرہ کے نہایت نامور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "شعلۂ طور" ادارہ فروغ اردو نے نہایت نفاست اور کمال اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ داغِ جگر اور آتش گل بھی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ اُن کے والد مولوی علی نظر بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ جگر شگفتہ مزاج اور رنگین طبع ہیں۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے کا انداز بہت دلفریب ہے۔ شراب کے بہت رسیا تھے۔ مگر اب چھوڑ دی ہے۔ ان کا کلام بے حد مقبول ہوا۔ غالب، حالی اور اقبال کو چھوڑ کر ان کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ فروخت ہوا۔ فن شعر میں اپنے والد، تسلیم اور داغ کے شاگرد ہیں۔

جوش ملسیانی۔ پنڈت لبھو رام جوش ضلع جالندھر کے گاؤں ملسیان میں یکم فروری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ مگر انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سعی سے ایسی عمدہ لیاقت پیدا کی کہ آج ملک میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان دیئے اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ طالب علمی کے زمانہ سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۰۲ء میں داغ کے شاگرد ہوئے مگر ۱۹۰۵ء میں داغ کا انتقال ہو جانے کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

پنجاب کے مختلف سرکاری سکولوں میں عرصہ دراز تک فارسی کے اول مدرس رہے ۔ ۱۹۳۵ء میں ریٹائر ہوئے ۔ ۱۹۱۴ء سے
موضع جالندھر میں قیام ہے جو طلبیان کے پاس ہی ہے ۔ عرصہ دراز سے رسالہ رہنمائے تعلیم کے حصۂ نظم کی ادارت کے فرائض
آنریری طور پر بڑی قابلیت سے انجام دے رہے ہیں ۔ رسالہ مذکور کا حصۂ نثر راقم الحروف کے متعلق ہے ۔ ہندوستان کے غزل گو
شعراء میں آپ کا درجہ نہایت ممتاز ہے ۔ غزلوں کی زبان نہایت شستہ و شائستہ ۔ فصیح و بلیغ اور نہایت بامحاورہ ہوتی ہے ۔
عادات و خصائل کے لحاظ سے پرانے بزرگوں کا نمونہ ہیں ۔ بیحد سادہ مزاج ۔ سادہ وضع اور نیک نفس انسان ہیں ۔ کلام کا
قلیل حصہ بادۂ سرجوش کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ دوسرا مجموعہ جنون و ہوش ہے ۔ غالب کی ایک اعلیٰ درجہ کی شرح بھی آپ نے
کی ہے جو شائع ہو چکی ہے ۔ غرض نہایت خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ادب اور فن کی خدمت کر رہے ہیں ۔ ان کا
شمار ملک کے مقتدر شعراء میں ہوتا ہے ۔

جوش ملیح آبادی ۔ شبیر حسن خاں نام بشیر احمد خاں کے بیٹے ۔ جوش تخلص ۔ شاعرِ انقلاب خطاب اور
ملیح آباد (یو پی) وطن ہے ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں پیدا ہوئے ۔ مشہور شاعر فقیر محمد خاں گویا ان کے پردادا تھے جنھوں نے
سب سے پہلے انوار سہیلی کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک دس سال دار الترجمہ حیدر آباد دکن میں ناظر ادبی
رہے ۔ فن شعر میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی ۔ موجودہ دور کے نہایت نامور شعراء میں سے ہیں ۔ دہلی سے انھوں نے ماہنامہ
کلیم جاری کیا تھا ۔ تقسیم کے بعد دہلی کے ماہنامہ "آج کل" کے چیف ایڈیٹر رہے ۔ مگر اپنے بیوی بچوں کا مستقبل بھارت میں تاریک
دیکھ کر نومبر ۱۹۵۵ء کے آخر میں کراچی چلے آئے اور پاکستان کے شہری ہو گئے ۔
روح ادب ۔ اوراق سحر ۔ مقالات زریں ۔ جذبات فطرت اور آوازۂ حق ۔ ان کی ابتدائی کتابیں ہیں ۔ بعد کی
تصنیفات یہ ہیں : ۔ جنون و حکمت ۔ سنبل و سلاسل ۔ عرش و فرش ۔ فکر و نشاط ۔ حسین اور انقلاب ۔ شاعر کی راتیں ۔ آیات و
نغمات ۔ نقش و نگار ۔ شعلہ و شبنم ۔ حرف و حکایت ۔ حرف آخر ۔ سیف و سبو ۔ پیغمبر اسلام اور ارشادات ان کی تصنیفات ہیں ۔

حفیظ جالندھری ۔ خان بہادر ابو الاثر حفیظ جالندھری ہندوستان و پاکستان کے مشہور شاعر شاہنامۂ
اسلام کے مؤلف ۔ پاکستان کے قومی ترانہ کے مصنف ۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ شروع ہی سے حصول معاش کی پریشانیوں
میں مبتلا رہے ۔ معمولی ملازمتیں کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ سٹیشن پر تیلیوں کے میٹ بھی رہے ۔ جب اپنے وطن میں کوئی ترقی
کی سبیل نظر نہ آئی تو لاہور آئے اور دار الاشاعت پنجاب میں پھول کے ایڈیٹر ہو گئے ۔ مذاق سلیم فطری تھا جسے ملک الشعراء
شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کی صحبت نے جلا دی اور کندن بنا دیا ۔ اور آہستہ آہستہ حفیظ کو اپنے زمانے کا سب سے زیادہ
مشہور اور سب سے زیادہ مقبول شاعر بنا دیا ۔ عزت ۔ دولت ۔ شہرت سب کچھ مل گئی ۔ ان کا لازوال اور بے مثل کارنامہ
شاہنامۂ اسلام ہے جس کی اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں ۔ کاش حفیظ صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی
تکمیل کی طرف متوجہ ہوں ۔

ان کی دوسری منظوم تصانیف نغمہ زار۔ سوز و ساز۔ تلخابۂ شیریں۔ تصویرِ کشمیر۔ بہار کے پھول۔ پھول مالا اور ہندوستان ہمارا کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری۔ شیخ عبد الحفیظ سلیم نام۔ حفیظ تخلص۔ والد کا نام شیخ فضل محمد خاں وطن ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) تاریخ پیدائش ۵ جنوری ۱۹۱۲ء ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں تک ادبی مشاغل میں مصروف رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان سے متعلق ہو گئے۔ کچھ دنوں لاہور بھی رہے۔ اور آج کل کراچی میں ہیں۔ اردو کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ فارسی بھی بہت اچھی جانتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں سے ہیں اور آپ کا کلام پختگی و روانی۔ سلاست و شگفتگی اور درد و اثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ ذاتی لحاظ سے بہت با اخلاق منکسر المزاج اور خوش طبع انسان ہیں۔

خاطر غزنوی۔ محمد ابراہیم بیگ خاطر غزنوی۔ پشاور میں ۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آج کل ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو کے بہت سرگرم ممبر ہیں۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ زندگی نکالا۔ مگر جلد ہی بند ہو گیا۔ خاطر صاحب آج کل کے شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن نظمیں اور گیت بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں رومانی اور انقلابی ہوتی ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خاطر صاحب افسانہ نگار بھی ہیں۔ "فسانہ" اور "پھول اور پتھر" ان کی کتابیں ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ پشتو ادب کے متعلق انھوں نے بہت عمدہ مضامین لکھے ہیں۔

ذو الفقار۔ ان کا نام سید ذو الفقار علی بخاری ہے۔ اور ذو الفقار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد پہلے گورنمنٹ پریس پشاور میں کلرک بنے۔ پھر اپنے بڑے بھائی پطرس بخاری کی امداد سے بی۔بی۔سی لندن میں اناؤنسر ہو گئے۔ ازاں بعد ریڈیو سٹیشن بمبئی کے ڈائرکٹر۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر ہوئے۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح بیحد ہے۔ نہایت زندہ دل اور با اخلاق ہیں۔ کلام میں جان اور اشعار میں دلکشی ہے۔ پُر گو اور بدیہہ گو شاعر ہیں۔ نظم میں بندش الفاظ اور اسلوب بیان خوب ہے۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے۔

رضا ہمدانی۔ مرزا رضا حسین ہمدانی نام۔ رضا تخلص اور وطن پشاور ہے۔ جہاں یہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد خیاط تھے۔ یہ رفوگر ہوئے۔ کام کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور چلتا رہا۔ جب کام نہ چلا تو کسی چائے فروش کے ہاں

[illegible] صاحب الاحترام بزرگ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے آپ احمدی تھے۔ موضع دولت پور
[illegible] کورٹ میں میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

[illegible] سالک کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کے زیر سایہ پٹھان کوٹ میں ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان بٹالہ
[illegible] لاہور میں آ گیا۔ ۱۹۱۴ء میں پٹھانکوٹ سے ایک ادبی ماہنامہ فانوس خیال جاری کیا۔ مگر یہ
[illegible] آپ لاہور آ گئے۔ پھول اور تہذیب النسواں کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سید امتیاز علی نے کہکشاں
[illegible] اس کے بہترین مضمون نگار سالک صاحب ہی تھے۔ بہت اعلیٰ اور بلند پایہ نظمیں، فسانے اور مضامین انھوں نے اس کے
لیے لکھے۔ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو مولانا ظفر علی خاں کے اصرار پر "زمیندار" میں چلے آئے اور اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔ ان کا
"افکار و حوادث" کا کالم مزاح نویسی کا بہترین نمونہ ہوتا تھا اور بے حد دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ پھر نومبر ۱۹۲۱ء کو تحریک عدم تعاون
کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور میانوالی جیل میں ایک سال تک قید رہے۔ رہا ہونے کے بعد پھر "زمیندار" کو سنبھالا۔ ۱۲ مارچ
۱۹۲۷ء کو زمیندار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دیا اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۷ء کو مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر "انقلاب" نکالا۔
جو تقسیم ملک کے بعد تک نہایت کامیابی اور نہایت شہرت کے ساتھ نکلتا رہا۔ پھر مولانا کراچی چلے گئے اور دو سال تک وہاں
علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ ۱۹۵۳ء میں لاہور واپس چلے آئے۔ تقسیم ملک کے وقت تک اپنی سوانح عمری "سرگذشت" کے نام
سے آپ نے لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ پوری نصف صدی کی سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ ہے۔ اور پڑھنے کے قابل
چیز ہے۔ ۱۹۵۳ء کے فسادات کے متعلق "تحقیقاتی رپورٹ" کا بھی ترجمہ آپ ہی نے کیا۔ لاہور کی ادبی مجالس کی رونق آپ ہی
کے دم سے تھی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۰۸ء سے ہوا۔ کلام بہت ہی پر مغز۔ بلند پایہ اور لطیف ہوتا ہے۔ آپ موجودہ دور کے
مزاح نویسوں کے امام سمجھے جاتے تھے۔ "افکار و حوادث" کا تاریخی کالم آپ کی لازوال شہرت کا باعث ہے۔ جپپا اور دیگر افسانے
چترا۔ نیا چاند۔ الف لیلہ جدید۔ خودکشی کی انجمن۔ راجہ کا ہیرا۔ قصر ساحل۔ آئین حکومت ہند۔ امداد باہمی۔ کاریگری۔ ایجادات۔
دانایان فرنگ۔ ساحروں کی کہانیاں۔ قدیم مذہبیں وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ راہ و رسم منزلہا۔ ان کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے۔
تازہ تصانیف "ذکر اقبال" "یاران کہن" ہیں۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔

سکندر علی وجد۔ آپ کا نام سکندر علی اور وجد تخلص ہے۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔
تعلیم حیدرآباد دکن میں پائی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے ہونے کے بعد ریاست کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
کے عہدہ پر تعینات رہے۔

وجد صرف غزل گو شاعر ہی نہیں۔ بلکہ نظم کے میدان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور بہت کامیاب رہے
ہیں۔ "لہو ترنگ" اور "آفتاب تازہ" ان کے کلام کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

سلام۔ سلام صاحب بنگال کے قصبہ مچھلی شہر میں غالباً یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ "میرے نغمے" اور "وسعتیں"

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے حالات اور کلام کا انتخاب خود رسالہ داستان لاہور کے "غزل
شاعر نمبر" میں دیا تھا جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ سوانحی حالات میں سوائے الفاظ کے ایک فقرہ بھی ہمیں ایسا نہ
ملا جو ہم اس تذکرہ میں شامل کر سکتے۔ صرف اتنی سی بات "سوانح" سے ہم اخذ کر سکے کہ یہ حالات لکھتے وقت سلام صاحب کی عمر اکیس
انیس سال کی تھی۔ اوپر کی تاریخ ہم نے عربی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مضمون سے نقل کی ہے۔

سیف - سیف الدین نام، سیف تخلص، امرتسر کے رہنے والے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ دسویں جماعت
سے ... خاکسار تحریک میں شامل ہونے کی پاداش میں دو سال کی قید ہو گئی۔ چھوٹ کر آئے اور کالج میں داخل ہوئے تو
وہاں سے بھی ... خارج ہوئے۔ اس لیے تعلیم ہی کو خیرباد کہا۔ اور معاش کی تلاش میں وہاں سے کشمیر تک گئے۔ آخر میں فلمی گانے
بھی لکھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو بھی اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ غزل گو شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ کلام کے مجموعہ کا
نام "خم کاکل" ہے۔

شاد عارفی - خان احمد علی نام ہے۔ شاد تخلص۔ ریاست لوہارو میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے لیکن تمام ریاست
رامپور میں رہنا ہے۔ "سماج" ان کی تصنیف ہے۔

شاعر لکھنوی - لکھنؤ کے نوجوان شعراء میں شاعر لکھنوی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ عام طور پر غزل کہتے ہیں
اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک طرح کی غزلیں ہی ہوتی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد ترک وطن
کر کے پاکستان آ گئے۔ پہلے لاہور رہے تھے، اب کراچی میں ہیں۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ نام حسن پاشا، ابتدائے شاعری ۱۹۳۸ء ہے۔

شوکت تھانوی - "سودیشی ریل" کے موجد، کتیا کے مصنف اور ریڈیو کے "قاضی جی" کو کون نہیں جانتا۔ جو ان کے
تعارف کی ضرورت ہو۔ مزاح نگاری اور ظرافت کی شہرت کو اپنے ساتھ لکھنؤ سے پاکستان لائے۔ جہاں یہ نعمت اور بھی زیادہ
پھلی پھولی۔ اور شہرت و مقبولیت کے اس درخت میں بہت سے شیریں اور مزے دار پھل لگے۔ جو ان کے قدردان کھاتے اور
لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ مزاح نگار، افسانہ نویس، ناولسٹ اور صحافی ہونے کے علاوہ شاعر بھی واقع ہوئے ہیں اور "گہرستان"
کے نام سے مدت ہوئی اپنا مجموعہ کلام بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے ابتدائی مجموعے طوفان تبسم، دنیائے تبسم،
موج تبسم، بحر تبسم اور سیلاب تبسم ہیں اور پنجاب میں ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۳۲ء میں "شیش محل" شائع ہوئی۔ ان کا سب سے
مشہور افسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں چھپا۔ جس نے ان کے نام کو ملک کے آخری کونے تک مشہور کر دیا۔ پاکستان و
ہندوستان کے مزاحیہ نگاروں میں ان کا نام آج سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اب تک ساٹھ ستر کتابیں لکھ چکے ہیں جو کتاب
لکھتے ہیں، فوراً قبولیت کے پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ محمد عمر نام ہے۔ مگر آج نام کو کوئی جانتا بھی نہیں اور شوکت تھانوی کو سب جانتے
ہیں۔

ہمایوں لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان میں چلے گئے۔ کچھ دنوں اخبار آزاد کشمیر راولپنڈی کے ایڈیٹر رہے۔ بی۔ اے ۱۹۳۶ء میں کیا تھا۔ زنداں اور زہر خند ان کی نظموں کے مجموعے اور "شہسوار" ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ پھول مالا اور روحِ زندگی ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔

ظہیر کاشمیری۔ غلام دستگیر کشمیری ۱۹۲۰ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ظہیر تخلص ہے۔ تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ لاہور میں قیام ہے۔ "عظمت آدم" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

عابد۔ سید عابد علی عابد لاہور کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ وطن لاہور ہے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے۔ والد فوج میں ملازم اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مقیم تھے۔ اسی لیے ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ انٹرنس رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور سے ۱۹۱۹ء میں کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ اسی دوران میں آپ نے رسالہ "دلکش" اور "ہزار داستان" کی ادارت بھی کی۔ اپنے وقت میں دونوں رسالے اردو ادب کے نہایت شاندار نمونے تھے۔ "ہزار داستان" نہایت دلچسپ اور پُر لطف مسلسل اور مختصر افسانوں کے لیے مشہور تھا۔ نیرنگ خیال اور دورِ جدید کے بھی ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں زرعی دنیا اور صادق کی بھی کچھ دنوں ایڈیٹری کی۔ آج کل مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی مجلہ صحیفہ کے اعزازی مدیر ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی ہونے کے بعد آپ نے گجرات میں وکالت شروع کی۔ مگر جس دل میں ادبی امنگ اور شعری ذوق ہو اُس کا دل قانون جیسے خشک مضمون میں کیا لگ سکتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے خیرباد کہہ کر لاہور چلے آئے اور ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ایف۔ سی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد فلم "پورن گنگا" کا ڈائیلاگ لکھنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر ۱۹۴۳ء میں دیال سنگھ کالج کی پروفیسری سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد اُس کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد کالج کے ٹرسٹیوں سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہو گئے۔ آپ پاکستان کے چوٹی کے شعراء میں سے ہیں۔ ادبی مذاق بھی بہت اعلیٰ پایہ کا ہے۔ فنِ موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ گفتگو اور تحریر دونوں شگفتہ اور پُر لطف ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ حجاب زندگی، چاندنی قسمت، ڈکٹیٹر، دو سہاگ، نیرنگ، طلسمات، روپ متی، دہلی میں قتل عام، بیت ہند، شہباز خاں، شیخو، بشر ہے کیا کہئے، انتقام، اُردو کا تنقیدی سرمایہ، گلہائے بہار، اصولِ انتقادِ ادبیات وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کا انتخاب شب نگار بنداں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ کی تازہ تالیفات تلمیحات اور شعر اقبال ہیں۔

عارف عبدالمتین۔ عبدالمتین نام ہے اور عارف تخلص۔ یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے او کالج امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں ایم۔ اے اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ۱۹۵۲ء میں بی۔ ٹی کا امتحان پاس کر کے کچھ

و قت گار ڈینفنس ہیکیری امرتسر اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کلرکی کی۔ مگر جلد ہی کلرکی سے طبیعت اکتا گئی اور اُسے چھوڑ کر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ آج کل اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں طلباء کو سائنس پڑھاتے ہیں۔ دیدہ و دل اُن کے چھپنے والے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔

عارف صاحب ترقی پسند مصنفین میں سے ہیں۔ امرتسر میں انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے مل کر وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے تنِ بے جان میں از سرِ نو جان ڈالی۔ اور لاہور آئے تو یہاں بھی اس انجمن سے عرصہ تک وابستہ رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک انھوں نے بحیثیت ایڈیٹر میدانِ صحافت میں کام کیا اور اس دوران میں ادبِ لطیف، سویرا اور جاوید کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آج کل بھی ماہنامہ جمہور راولپنڈی کے اعزازی مدیر ہیں۔

علاقم۔ سید عبدالحمید نام۔ عدم تخلص۔ ماہ جون ۱۹۰۹ء میں بمقام تلونڈی موسیٰ خاں (ضلع گوجرانوالہ) پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ اور یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ پھر فوجی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ آج کل ملٹری اکاؤنٹس کے محکمہ میں آڈیٹر ہیں۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ کسی کی شاگردی نہیں کی۔ مسلسل مشق و مزاولت کے باعث کلام میں بڑی روانی پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کا شمار پاکستان کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے۔ "نقش دوام"، "خرابات"، "زلفِ پریشاں"، "سرو سمن"، "گردشِ جام"، "قول و قرار"، "شہر خوباں" ان کی تصنیفات ہیں جو ابرو باغ و بہار اور غیب و شہود ان کی تصنیفات ہیں۔

عرش ملسیانی۔ بالمکند عرش ملسیانی پنڈت لبھو رام جوش جیسے فاضل استاد کے لائق فرزند ہیں۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ باپ کا ادبی ذوق پوری طرح بیٹے میں منتقل ہوا۔ اور آپ دورِ حاضر کے نہایت کامیاب اور مقبول شاعر ہیں۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدرسی کی لائن اختیار کی۔ اور پندرہ برس تک یہ شغل جاری رکھا۔ آج کل دہلی کے سرکاری ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر ہیں۔ کلام کے دو مجموعے "ہفت رنگ" اور "چنگ و آہنگ" چھپ چکے ہیں۔ جن کی زبان نہایت شستہ، شائستہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔

عشرت رحمانی۔ عشرت رحمانی ۱۹ اپریل ۱۹۰۵ء کو رامپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اُردو فارسی تعلیم گھر پر ہوئی..... انگریزی تعلیم رامپور، کلکتہ، دہلی اور لاہور میں حاصل کی۔ فارسی اور انگریزی میں آنرز کرنے کے علاوہ ہندی اور بنگلہ بھی سیکھیں۔ نیز ٹیچرز ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۲۴ء سے شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ دہلی میں کچھ عرصہ اردو فارسی اور معاشرتی علوم کے معلم بھی رہے۔ یکم مئی ۱۹۳۹ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسسٹنٹ پروگرام ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں پروگرام ڈائرکٹر ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

عندلیب شادانی ۔ ان کا نام وجاہت حسین ہے۔ اور عندلیب تخلص کرتے ہیں۔ شاداں ان کے اُستاد سید اولاد حسین کا تخلص ہے۔ اُس کی نسبت سے عندلیب شادانی کہلاتے ہیں۔ سنبھل۔ ضلع مراد آباد (یو۔ پی) میں یکم دسمبر ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی ننھیال رامپور (ریاست) میں پائی۔ بڑے ہو کر منشی فاضل پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایم۔ اے کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے ہندو کالج دہلی میں اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا امتحان دیا اور ڈھاکہ واپس چلے آئے۔ جہاں آپ اردو اور فارسی کے شعبہ کے صدر ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے پیدا ہوا۔ اور برابر بڑھتا رہا۔ اس فن میں کسی کے شاگرد نہیں۔ تصنیفات اب تک حسب ذیل ہیں۔

عہد حاضر اور اردو غزل گوئی۔ تحقیقات۔ چھوٹا خدا۔ نوش و نیش۔ سچی کہانیاں۔ ترجمہ انشاء ابوالفضل۔ ترجمہ و شرح رباعیات باباطاہر ہمدانی۔ ترجمہ چہار مقالہ۔ نقش بدیع۔ لغت فارسی جدید۔

آپ کے کلام کا مجموعہ نشاط رفتہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

احمد فراز ۔ احمد شاہ نام ہے اور فراز تخلص۔ احمد فراز کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ سرحد کے مشہور شاعر برق کوہاٹی کے فرزند ہیں۔ اور ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ اسی لیے سکول چھوڑ کر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد شعر کہنے شروع کیے۔ پہلے گوہر تخلص کیا۔ پھر بدل لیا۔

فراق ۔ رگھوپتی سہائے فراق منشی گورکھ پرشاد عبرت کے لڑکے اور گورکھپور کے باشندے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی لحاظ سے ایم۔ اے ہیں اور یو۔ پی کے مختلف کالجوں میں پروفیسر رہے ہیں۔ آج کل الہ آباد میں ہیں۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے ہے۔ فن شعر میں ناصری مرحوم اور وسیم خیرآبادی کے شاگرد ہیں۔ غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ غزل گو شعراء میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ بلکہ غزل میں نئی طرز کے موجد۔ جتنے بڑے یہ شاعر ہیں۔ اتنے ہی بڑے نقاد ہیں۔ ”اندازے“ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ رمز و کنایات۔ شبستاں۔ روپ۔ روح کائنات۔ مشعل۔ شعلۂ ساز۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

فیض ۔ فیض احمد نام۔ فیض تخلص۔ سلطان محمد خاں بیرسٹر سیالکوٹ کے فرزند ہیں جو کہ کوئی عرصہ کے دربار میں افغانستان کے سفیر تھے۔

سال پیدائش میں اختلاف ہے۔ ایک تذکرہ میں ۱۹۱۰ء ۔۔ ایک میں ۱۹۱۱ء اور ایک میں ۱۹۱۲ء لکھا ہے۔ بی اے مرے کالج سیالکوٹ سے اور ایم۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے عربی کا ایم۔ اے بھی کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک ایم۔ اے او کالج امرتسر اور ہیلی کالج لاہور میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ ہند کی فوجی ملازمت اختیار کی جو پانچ سال تک رہی۔ بعد میں لاہور آ کر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ٹائمز اور ۱۹۴۸ء میں روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر

مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عالمی امن کونسل میں پاکستان کے نمائندے مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں انھیں مقدمہ سازش راولپنڈی میں ۵ سال کی سزا ہوئی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا میں بھی کچھ دنوں نظربند رہے۔ پھر چھوڑ دیے گئے۔ فیض اعلیٰ درجہ کے خوش گو شاعر، مشہور نقاد اور اچھے صحافی ہیں۔ ادب اور شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے نقش فریادی، دست صبا اور زنداں نامہ چھپ چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" زیر طبع ہے۔

قتیل شفائی۔ نام اورنگ زیب۔ تخلص قتیل شفائی۔ وطن ہری پور (ہزارہ)۔ تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ فن شعر میں راولپنڈی کے حکیم شفا کے شاگرد ہیں۔ اس لیے قتیل شفائی کہلاتے ہیں۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جوان ہوئے تو تلاش معاش کے سلسلہ میں کہیں چونگی کی محرری کی۔ کہیں لاریوں کے اڈے پر ملازمت۔ شعر اور گیت کہنے کا شروع سے شوق تھا۔ آج کل فلموں کے گیت بھی لکھتے ہیں۔ دو برس تک "ادب لطیف" کی ادارت بھی کی اور ہفتہ وار رسالہ "ادا کار" میں بھی کام کیا۔ لاہور آ کر ان کی شعری صلاحیتیں پورے عروج پر آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کے ادبی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ گیت بھی خوب لکھے اور غزلیں بھی خوب کہیں۔ منظوم ڈرامے، ریڈیو فیچر، سینکڑوں نظمیں، بیسیوں مثنویاں ان کی تصنیف ہیں۔

قتیل کی شاعری اور ان کے گیتوں پر مفصل تبصرہ موقف "ادبیات سرحد" نے ۲۰ صفحات پر کیا ہے۔
ہریالی۔ گجر۔ جلترنگ۔ [illegible] اور روزن ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

ماہر القادری۔ نام منظور حسین۔ تخلص ماہر۔ سلسلہ قادری اور وطن کیسر کلاں (ضلع بلند شہر) ہے۔ والد کا نام محمد معشوق علی تھا۔ جو ظریف تخلص کرتے تھے۔ سال ولادت ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) ہے۔ نام سے تاریخ نکلتی ہے۔ تحصیل علم کے بعد مختلف مقامات میں قیام رہا۔ کئی سال حیدرآباد میں ملازمت کی۔ پھر بمبئی چلے آئے۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا۔ کچھ دنوں بجنور میں رہ کر مدینہ اور غنچہ کی ادارت کی۔ ۱۹۳۳ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ کر کراچی میں مقیم ہیں۔ کراچی پہنچ کر رسالہ "فاران" جاری کیا۔ اس وقت تک بیس پچیس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن میں "دُرِّ یتیم" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ہے۔ روزنامچہ۔ آخری رسول۔ طلسم حیات بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کے مجموعے "محسوسات ماہر"، جذبات ماہر، نغمات ماہر اور ذکر جمیل ہیں۔ غزل میں بے اعتدالی اور لاابالی پن سے احتراز کرتے ہیں۔ مذہب اسلام، تاریخ اسلام اور اسلامی ادب سے بہت گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

مجاز۔ نام اسرار الحق۔ تخلص مجاز۔ والد شیخ سراج الحق تھے۔ ۱۹۱۱ء میں قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے۔ محکمہ اطلاعات بمبئی اور ہارڈنگ لائبریری دہلی میں بھی کچھ دنوں نوکری کی۔ لیکن طبیعت لاابالی پائی تھی۔ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔ اور شعر و شاعری کے شوق میں ساری عمر گزار دی۔

۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔
آہنگ، شب تاب اور ساز نو ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ہیں۔ جو شائع ہو چکے ہیں۔ کلام میں روانی اور شیرینی دونوں
پائی جاتی ہیں۔

مختار صدیقی۔ نام مختار الحق۔ تخلص مختار۔ آبائی وطن سیالکوٹ تھا۔ لیکن والد نے گوجرانوالہ میں رہنا شروع کر دیا۔ لہٰذا
اب وہی وطن بن گیا۔ صدیقی صاحب یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ کلرک رہے۔ پھر ریڈیو
پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ متعین ہو گئے۔ آج کل راولپنڈی میں تعینات ہیں۔ فن شعر میں سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں۔ ان کی
شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بات کو ایک نئے ڈھنگ سے نظم کرتے ہیں۔ جس سے نظم کی دلکشی اور دلچسپی میں نمایاں اضافہ
ہو جاتا ہے۔

آنند نرائن ملا۔ پنڈت آنند نرائن متخلص بہ ملا پنڈت جگت نرائن ملا کے فرزند اور لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔
اکتوبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔
اردو فارسی کی تعلیم مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی سے پائی۔ پہلے انگریزی میں شعر کہنے شروع کیے پھر اردو میں۔ مگر کسی سے اصلاح
نہیں لی۔ کلام کے مجموعے کا نام "جوئے شیر" ہے۔

میراجی۔ نام ثناء اللہ ڈار تھا۔ ایک بنگالی طالبہ میرا سین کے عشق میں ایسے بیخود اور از خود رفتہ ہوئے کہ اس کے
نام پر اپنا نام میراجی رکھ لیا۔ اور باقی ساری عمر اس کی یاد اور محبت میں گزار دی۔ شروع شروع میں لاہور کے ادبی رسائل میں مضامین
اور نظمیں لکھیں جو اپنی ندرت، سلاست، عمدگی اور خوبی کے باعث نہایت درجہ مقبول ہوئیں اور بہت جلد ایک نوجوان ادیب اور
شاعر کی حیثیت سے لاہور کی ادبی مجالس کی رونق بن گئے۔ بعد میں انھوں نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی
بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک "ادبی دنیا" کے نائب ایڈیٹر رہے۔ پھر ریڈیو میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے۔ وہاں سے بمبئی
گئے اور اختر الایمان کی شراکت میں "خیال" جاری کیا۔ شراب کی کثرت نے صحت کا بالکل ستیاناس کر دیا۔ یہاں تک کہ نہایت بے بسی
بے کسی اور کس مپرسی کی حالت میں ایک ہسپتال کے اندر چند روز بیمار رہ کر ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو انتقال کیا۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے
بقول بعض ۱۹۱۲ء میں۔ ان کی تصانیف میراجی کی نظمیں، میراجی کے گیت۔ اور نگار خانہ وغیرہ ہیں۔

ناصر کاظمی۔ ناصر رضا نام ہے اور ناصر تخلص۔ انبالہ میں ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد سلطان تھا۔
جو فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر صاحب نے لاہور میں بی۔ اے تک پڑھا مگر امتحان نہ دے سکے۔ سر عبد القادر مرحوم کی یادگار میں
ان کے لڑکوں نے جو رسالہ "اوراق نو" کے نام سے نکالا تھا۔ اس کے مدیر تھے۔ پھر ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے۔ آپ نہایت

سلجھے ہوئے غزل گو شاعر ہیں۔ کلام کا مجموعہ "برگ نے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نوجوان شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔

احمد ندیم قاسمی۔ احمد شاہ نام ہے اور ندیم تخلص کرتے ہیں۔ میر غلام نبی عرف چن پیر کے فرزند ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ پردادا کا نام محمد قاسم تھا۔ اسی نسبت سے قاسمی کہلاتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو چچا اپنے ساتھ کیمبل پور لے گئے جہاں وہ ملازم تھے۔ ان کے چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ عربی کے عالم، فارسی کے فاضل اور شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہیں ان کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور تفسیر حقانی کا درس بھی چچا سے لیا۔ ۱۹۲۹ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہوگئے۔ جہاں ان کے چچا ریاست کے مشیر مال ہو کر چلے گئے تھے۔ مگر ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کے باعث ان پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور جس طرح بھی بن پڑا ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کر لیا۔ اب حصول معاش کا سوال تھا۔ چار سال اسی تگ و دو میں گزرے۔ آخر ۱۹۳۹ء میں ملتان کے انسپکٹر آبکاری مقرر ہوئے۔ مگر نوکری نہ طبیعت کے موافق تھی نہ ذوق کے مطابق۔ اس لیے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے۔ اور پھول و تہذیب النسواں میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کام کیا۔ اسی دوران میں کچھ مدت ماہنامہ ادب لطیف کو بھی ایڈٹ کیا۔ اسی اثنا میں ادب لطیف کے ایک مضمون کی بنا پر آپ پر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ جو ایک سال تک چلتا رہا۔ اس سے آپ مئی ۱۹۴۵ء میں بری ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء سے مارچ ۱۹۴۸ء تک پشاور ریڈیو میں ملازمت کی۔ اس ملازمت کے دوران میں رسالہ سویرا کی ایڈیٹری بھی کرتے رہے۔ پھر لاہور آگئے اور محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغ اردو سے مل کر رسالہ نقوش نکالا۔ اس کے ابتدائی دس پرچے ان کے اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں شائع ہوئے۔ ماہ مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند رہے۔ وہاں سے آئے تو مختلف ادبی اور علمی مشغولیتوں میں معروف رہنے کے بعد ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو روزنامہ امروز لاہور کے ایڈیٹر ہوئے اور اب وہاں استعفیٰ دے دیا ہے۔ شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ جس سے دو بچیاں نشاط اور ناہید ہیں۔

ملک کے نامور انشاپردازوں، معروف شاعروں اور مشہور فسانہ نگاروں میں آپ کا خاص مقام ہے۔ آپ کا منظوم کلام نہایت شستہ و شائستہ اور لطیف و دلکش ہوتا ہے۔ شعر و سخن کی ہر مجلس میں آپ کی غزلیں اور نظمیں گہری دلچسپی اور پورے ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں۔

ذاتی لحاظ سے نہایت درجہ خلیق۔ بیحد ملنسار۔ بہت متواضع اور بڑے منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ دوستوں کے ہمدرد، عزیزوں کے بہی خواہ۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے۔ دشمن کے بھی وقت پڑنے پر مدد کرنے والے۔ تکلیف پر صبر کرنے والے۔ مصائب سے نہ گھبرانے والے۔ ہر وقت خوش رہنے والے۔ تکلف سے بری، ریا سے دور، دکھاوے سے علیحدہ۔ فیاض طبع، سیر چشم، فراخ دل، نیک طینت، نیک سرشت، یہ ہیں احمد ندیم قاسمی۔

آپ کی منظوم تصانیف جلال و جمال، شعلۂ گل اور رم جھم ہیں۔

نثری تصنیفات اور فسانوں کے مجموعے اب تک حسب ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

اختتامیہ

میں شعرائے کرام کے حالات لکھ چکا تھا کہ ماہ پرچہ "نقوش" نے "غزل نمبر" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور اس میں کچھ مزید شعراء کی غزلیں بھی شامل کیں۔ ان بعد کے شعراء کے حالات (جہاں تک دستیاب ہو سکے) اس اختتامیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں سے کچھ سات شعراء کے حالات میرے محترم دوست مکرمی پیام صاحب شاہجہان پوری ایڈیٹر حمایت اسلام لاہور نے میرے لیے فراہم کیے۔ جو مجھے نہیں مل رہے تھے۔ اس عنایت کے لیے میں ان کا نہایت ممنون ہوں۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد ۔ نہایت فصیح و بلیغ ۔ نہایت لطیف و شیریں اور نہایت سلیس و دلنشین اردو لکھنی مولانا محمد حسین آزاد پر ختم ہے۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد ایسی شاندار اردو لکھنے والا جس کا ہر فقرہ دل میں بیٹھتا چلا جائے۔ کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ آپ ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جو ایک علم دوست اور ذی علم انسان تھے اور غدر ۱۸۵۷ء میں مارے گئے۔ آزاد بھی دہلی کی تباہی کے بعد گھر سے نکلے اور تلاش معاش میں جگہ جگہ کے دھکے کھاتے ہوئے لاہور پہنچے۔ یہاں کے ڈائرکٹر سے نوکری کی درخواست دی تو جواب ملا کہ ایک ماہ تک بلا تنخواہ کام کرو۔ کام اچھا کیا تو رکھ لیے جاؤ گے۔ مصیبت کے مارے آزاد نے یہ بھی کیا اور نوکر ہو گئے۔ بعد میں لالہ پیارے لال آشوب کی سفارش سے محکمہ تعلیم میں جگہ مل گئی۔ جہاں رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے آپ گورنمنٹ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ دو مرتبہ علمی تحقیقات کے لیے ایران گئے۔ اور وہاں سے بڑے نوادرات ساتھ لائے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ محکمہ تعلیم کے سرکاری پرچوں "اتالیق پنجاب" اور اس کے بعد "پنجاب میگزین" کے نائب مدیر رہے۔ کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایما سے آپ نے "انجمن پنجاب" کے جلسوں میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی ایک موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ مشاعرے جدید شاعری کی سب سے پہلی بنیاد تھے۔ اس قسم کا سب سے پہلا مشاعرہ ۹ مئی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں آزاد نے اپنی مثنوی "شب قدر" سنائی۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے بھی ان مشاعروں میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیا اور اپنی چار ابتدائی مثنویاں انہی مشاعروں میں پڑھ کر سنائیں۔ آخر میں اپنی ایک جوان اور لائق بیٹی کی وفات کے باعث مولانا آزاد کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور یہ عارضہ جان کے ساتھ گیا۔ ۲۲ جنوری

سنہ ۱۹[illegible]ء کو اردو فارسی اور عربی کے اس لاثانی ادیب کا انتقال ہو گیا۔ اور اُردو ایک ایسے انشا پرداز سے خالی ہو گئی جس کا مثیل و نظیر پیدا نہ ہو سکا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ استاد کا دیوان آپ ہی نے بڑی تلاش کے بعد فراہم کر کے شائع کیا تھا۔ آپ کا کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ آپ نے آب حیات کے نام سے لکھی۔ نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ سخندان پارس۔ نگارستان فارس۔ سپاک و ناک وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ بچوں کی ابتدائی ریڈریں آپ نے کئی لکھیں۔

جاں نثار اختر۔ جاں نثار اختر تخلص بہ اخترؔ سنہ ۱۹[illegible]ء میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ آبائی وطن خیر آباد ہے مشہور و معروف شاعر مضطرؔ خیر آبادی آپ کے والد تھے۔ اخترؔ خاندانی لحاظ سے ایک بہت بڑے ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد مولانا فضل امام۔ مولانا فضل حق اور مولانا عبدالحق جیسے فاضل یگانہ روزگار رہتے۔

اختر انٹرنس پاس کرنے کے بعد علیگڈھ میں تکمیل تعلیم کے لیے بھیج دیئے گئے۔ جہاں سے آپ نے سنہ ۱۹[illegible]ء میں ایم اے پاس کیا۔ اور وکٹوریہ کالج گوالیار میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

شاعری کا شوق علی گڈھ میں پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ علیگڈھ کی زندگی میں آپ عرصہ تک کالج کی ادبی انجمن مدعی۔ بقیۃ الشعراء اور انجمن اردوئے معلیٰ کے معتمد رہے "علیگڈھ میگزین" کی ادارت بھی آپ نے عرصہ تک کی۔ مجموعہ کلام "سلاسل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

علی اختر۔ آپ کا نام سید علی اختر ہے اور آپ نے اپنے نام کے آخری حصے کو بطور تخلص اختیار کیا۔ ان کے والد کاس گنج (ضلع ایٹہ) یو۔ پی کے متوطن تھے مگر آپ کی پیدائش علی گڈھ میں ہوئی اور تعلیم بھی وہیں پائی۔ تعلیم کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور وہاں محکمہ آبکاری میں ملازم ہو گئے۔ مدت تک وہیں مقیم رہے۔ مگر سقوط حیدر آباد کے بعد کراچی چلے آئے۔ اور اب وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ فارسی ادب میں بہت کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اصناف سخن میں غزل سے بالخصوص طبیعت کو نہایت لگاؤ ہے۔ کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اختر تلہری۔ آپ کا نام سید اختر علی ہے اور نام ہی کے ایک حصہ کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ مضافات شاہجہانپور میں ایک مشہور قصبہ ہے تلہر۔ آپ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے اختر تلہری کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بی اے تک تمام امتحانات نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اپنے لیے معلمی کے پیشہ کو پسند فرمایا اور گورنمنٹ ہائی سکول شاہجہانپور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ شاعری کا شوق آپ کو شروع سے تھا۔ نثر میں مضامین بھی خوب لکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

امجد حیدر آبادی۔ آپ کا نام سید امجد حسین ہے نام کا پہلا جز امجدؔ آپ نے اپنا تخلص اختیار کیا۔ حیدر آباد دکن

آپ کا وطن ہے۔ جہاں آپ ۱۸۸۶ء (?) میں پیدا ہوئے۔ والد صوفی سید رحیم علی کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ امجد نے بڑے ہو کر حیدر آباد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مولانا نادر الدین اور نواب سند الملک آغا سید علی شوستری سے عربی اور فارسی پڑھی۔ تعلیم کے بعد مقامی مدرسہ دار العلوم میں مدرس ہو گئے۔ مگر جلد ہی اُسے چھوڑ کر محکمہ محاسبی میں ملازم ہو گئے اور ۲۵ سال تک نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

ان کی زندگی کا بڑا المناک واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں ۱۹۰۸ء (?) میں ایک بڑا قیامت خیز طوفان آیا۔ اور ان کا مکان بھی اچانک اس طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدہ۔ اہلیہ اور چھوٹی بچی ان کی آنکھوں کے سامنے پانی میں غرق ہو گئیں۔ اس ہولناک اور جگر پاش واقعہ نے اُن کی زندگی کو سراسر بدل دیا۔ اور اُن کی شاعری درد و اندوہ اور تڑپ سے لبریز ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ان کے استاد مولوی نادر الدین نے اپنی دختر کی شادی ان سے کر دی۔ یہ خاتون نہایت قابل اور لائق، منتظم، سمجھدار اور شوہر سے بے حد محبت کرنے والی تھیں۔ مگر سفرِ حج سے واپسی کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس کا صدمہ دل پر ایسا پڑا کہ امجد بالکل تارک الدنیا بن گئے۔ اور ان کی زندگی ہر دلچسپی اور ہر خوشی سے خالی ہو گئی۔ فنِ شعر میں حبیب کنتوری کے شاگرد ہیں۔ فارسی اشعار ترکی کو دکھایا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں نہایت زور دار۔ نہایت پُر اثر اور نہایت بلیغ ہوتی ہیں۔ بالخصوص رباعی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ ڈاکٹر اقبال۔ مولانا گرامی۔ عظمت اللہ خاں اور پروفیسر مناظر احسن گیلانی نے نہایت عمدہ اور شاندار الفاظ میں ان کی شاعری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ نذرِ امجد۔ جمالِ امجد۔ حجِ امجد۔ گلستانِ امجد۔ ریاضِ امجد۔ خرقۂ امجد۔ آپ کی نظم و نثر کے مجموعے ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آپ کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اور آپ کی شاعری پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔

برق دہلوی۔ منشی مہاراج بہادر نام تھا۔ اور برق تخلص۔ منشی ہرنرائن داس حسرت کے فرزند تھے۔ قدیمی وطن سکیٹ ضلع ایٹہ (یو۔ پی) تھا۔ مگر بزرگوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور وہیں برق ۱۸۸۴ء (?) میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۰۵ء میں والد کا انتقال ہو گیا جس سے ان پر آئندہ تعلیم کے دروازے بند ہو گئے اور یہ روزی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو بھی چھوٹی موٹی نوکری ملی کر لی۔ مگر معاشی مجبوریوں کے باوجود تعلیم جاری رکھی۔ ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کا امتحان دیا اور ۱۹۲۰ء (?) میں پرائیویٹ طور سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں محکمانہ امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی کے ڈاکخانہ میں سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے جب جا کر معاش کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا۔

فنِ شعر میں آپ آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے اور غزل گوئی اور نظم نگاری کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ پانی پت میں اپنے ایک دوست لالہ شگن چندر روشن کی لڑکی کی تقریب میں آئے ہوئے تھے کہ یکایک حرکتِ قلب بند ہونے سے ۹ فروری ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ "مطلعِ انوار" ان کے کلیات کا نام ہے جو بہت شگفتہ نظموں کا مجموعہ ہے۔

بیتاب عظیم آبادی۔ آپ کا نام سید کلب علی تھا۔ اور آپ سید فیاض علی کے فرزند تھے۔ پٹنہ عظیم آباد وطن تھا۔ بزرگ

ساری عمر کیمیا کی تلاش اور جستجو میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ مگر افسوس گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اور ہمیشہ ایک سا کاؤ کی کسوری۔

(تذکرہ ذکاء بحوالہ یادگار شعرا صفحہ ۲۳۱)

بے نظیر شاہ۔ ان کا نام سید محمد بے نظیر شاہ ہے اور نام ہی کا پہلا حصہ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ یعنی بے نظیر ان کا تخلص ہے۔ شاہ صاحب ایک صوفی منش کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ کڑا مانک پور ضلع الٰہ آباد اُن کا وطن ہے۔ مگر وطن کی سکونت ترک کرکے حیدر آباد چلے گئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ مولانا شاہ احسان علی قادری ان کے والد اور بہت بڑے صاحبِ طینت بزرگ تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز بیدوی کے خلیفہ ہونے کا ان کو شرف حاصل تھا۔

بے نظیر شاہ عربی و فارسی کے ماہر کامل اور بہت اعلیٰ پایہ کے غزل گو شاعر ہیں۔ مگر جتنے اچھے غزل گو ہیں مثنوی لکھنے میں بھی ان کا پایہ اتنا ہی بلند ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور عالم مثنوی "الکلام" جو ایک صوفیانہ رنگ کی نظم ہے۔ نہایت درجہ مقبول ہوئی اور بقول عبد القادر سروری ادارۂ دکن کی کوئی مثنوی اس کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے اکثر حصے اردو شاعری کے جدید انتخابات کے بیچ سرمایۂ زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر منازل طویل ہیں۔ مگر تسلسل کے اعتبار سے تقریباً سب کے سب حسن و خوبی کے بلند ترین معیار پر واقع ہیں (جدید اُردو شاعری صفحہ ۱۹۷)

ثاقب۔ آپ کا نام ابو محمد ہے۔ اور تخلص ثاقب۔ کان پور کے رہنے والے ہیں۔ جہاں آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور بہت جلد یو۔ پی اور پنجاب میں مشہور ہو گئے۔ "متاعِ درد" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

جگر بریلوی۔ کنور کنہیا لال کے فرزند منشی شام موہن لال المتخلص بہ جگر۔ ۱۸۹۰ء میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال تک گھر ہی پر اُردو۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر سکول میں داخل کر دیئے گئے۔ تعلیم کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ اور نائب تحصیلدار بن گئے۔ اور اسی عہدہ سے قبل از وقت ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ فنِ شعر میں آپ کے استاد مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی تھے۔ آپ کی نظمیں اور مضامین رسالہ زمانہ۔ کانپور، نگار لکھنؤ اور ہمایوں لاہور میں اکثر چھپتے رہتے تھے "اُردو اور ہندو" اور رسالہ صحتِ زبان آپ کی تالیفات ہیں۔ مضامین کے بھی تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات۔ رباعیات اور مثنویاں بھی انھوں نے بہت سی کہی ہیں۔ آپ کی تالیفات اور تصنیفات میں دو کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ایک "یادِ رفتگاں" جو ایسے ہندو مشاہیر ادب کا تذکرہ ہے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسری "بہارِ جاوداں" جس میں موجودہ ہندو ادیبوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔

آپ کا جنوری ۱۹۵۶ء کے آخری دنوں میں انتقال ہوا۔

جلیل قدوائی۔ جلیل قدوائی عصرِ حاضر میں قدیم غزل گو شعرا کے نمائندے ہیں۔ حسرت موہانی کے دوست ہیں اور شاعری میں انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ احسن مارہروی کے شاگرد ہیں۔

راسخ عظیم آبادی۔ شیخ غلام علی نام، راسخ تخلص۔ ۱۱۷۲ھ (۱۷۴۹ء) میں بمقام پٹنہ عظیم آباد پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مرزا فدوی اور مرزا اشرف سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر میں میر تقی میر کی شاگردی کی۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں وطن سے نکل کر کلکتہ، غازی پور، دہلی اور لکھنؤ کی خوب سیریں کیں۔ اور ہر جگہ شعر و سخن کے خوب چرچے رہے۔ پھر پٹنہ واپس آ گئے۔ اور وہی مشغلہ یہاں بھی زور و شور کے ساتھ جاری رکھا۔ بہار کے نامور اور مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ مؤلف تاریخ ادب اردو کی ان کے متعلق یہ رائے ہے کہ زبان پاکیزہ اور طرزِ بیان صاف و سادہ ہے۔ ان کے کلام میں سادہ اشعار کے ساتھ رنگین اشعار بھی ملتے ہیں۔ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) یا ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں وفات پائی۔

رسوا۔ نام محمد ہادی۔ مرزا اور رسوا تخلص۔ آغا محمد تقی کے فرزند۔ ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ پہلے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ پھر ریاضی۔ اقلیدس۔ حساب اور علم ہیئت کی تعلیم اپنے فاضل باپ سے پائی۔ لکھنؤ کے مختلف علما سے عربی پڑھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور بلوچستان میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ مگر اس نوکری سے علم دوست طبیعت کو کیا مناسبت۔ ایک دفعہ کیمسٹری کی ایک کتاب مل گئی جسے دیکھ کر کیمسٹری کا ایسا شوق دل پہ غالب ہوا کہ نوکری سے استعفیٰ دے۔ کوٹھی کا سامان نیلام کر گھر آ بیٹھے اور ولایت سے کیمسٹری کے آلات اور کتابیں منگوا کر تجربات شروع کر دیئے۔ علم کا شوق دیکھو کہ ایک لوہار کے لڑکے کو اس بات پر پڑھنا منظور کیا کہ وہ اپنی بھٹی فارغ اوقات میں ان کو تجربات کے لیے دے دیا کرے۔ آخر عمر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ اور اپنے پیچھے اپنی بہت سی تصنیفات بطور یادگار چھوڑ گئے۔ جن میں سے امراؤ جان ادا سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس کا ایک ایڈیشن ادارہ فروغ اردو نے بھی گذشتہ دنوں شائع کیا تھا۔

رسوا کو فارسی، عربی، عبرانی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت پر پورا عبور تھا۔ اور وہ اپنی علمی تصنیفات میں ان سب زبانوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ مغربی اور مشرقی علوم پر حاوی اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کے اعلےٰ درجے کے ماہر تھے۔ اسلام اور مذہب کے عقائد کا بھی انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۲۵ کے قریب اعلیٰ پایہ کی علمی اور ادبی کتب انھوں نے لکھی ہیں۔ جیسے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ویسے ہی بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ لطفِ زبان اور شگفتگی بیان کوئی ان کی کتابوں سے سیکھے۔ طبیعت کے نہایت بھولے بھالے۔ سادہ مزاج۔ تکلف اور تصنع سے دور، صاف دل۔ مخلص۔ غیور اور بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ ان کی شہرت بہ نسبت ایک شاعر کے بطور نثر نویس زیادہ ہے۔ علاوہ امراؤ جان ادا کے اختری بیگم۔ ذات شریف۔ طلسمات بہرام کی رہائی۔ خونی بھید۔ خونی جورو۔ مثنوی لذتِ فنا۔ مثنوی بہارِ ہند۔ مثنوی امید و بیم۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں اور کلیات اردو ان کی تصانیف ہیں۔ خالص علمی اور سائنٹیفک کتابیں بھی انھوں نے متعدد لکھی ہیں۔

رواں ۔ نام چودھری جگت موہن لال اور تخلص رواں تھا۔ ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اُناؤ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا۔ ابھی رواں کی عمر ۹ سال ہی کی تھی کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی چودھری کنہیا لال نے اُن کی تعلیم کا انتظام کیا۔ رواں نے ذہن اعلیٰ اور حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات نہایت اعزاز سے پاس کئے اور وطن ہی میں وکالت کرنے لگے۔ جلد ہی سارے اُناؤ میں ان کی لیاقت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور وہ شہر کے مشہور وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ فنِ شعر میں آپ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ کلام نہایت شگفتہ، مؤثر اور زوردار ہوتا ہے۔ سید اعجاز حسین اعجاز ایم اے اپنی تاریخ ادب اُردو میں اُن کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"اُن کی نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ صاف گوئی و بے گرد کردار نگاری اُن کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ وارداتِ حسن و عشق کو جہاں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود انہی کے دل پر کیفیت گزر رہی ہے۔ مناظرِ قدرت کے بیان میں خاص امور کو نہایت پُراثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ غیر مادی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت نہایت بلند مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظموں میں عام طور سے روانی ہے۔ لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔" اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بعمر ۴۵ سال انتقال کیا۔
"روحِ رواں" ان کے کلام کا مجموعہ ہے "رباعیاتِ رواں" لاہور سے عرصہ ہوا چھپی تھیں۔

سراج دکنی ۔ آپ کا نام سید سراج الدین تھا اور سراج تخلص کرتے تھے۔ شاہ سراج دکنی یا سراج اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے اور ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۴ء) میں بمقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔ تعلیم اورنگ آباد ہی میں پائی اور بقول میر تقی میر فنِ شعر میں سید حمزہ کے شاگرد ہوئے۔ طبیعت پر تصوف کا رنگ بیحد غالب تھا اور تمام عمر اسی رنگ میں رنگین رہے۔ شاعری کی ابتدا فارسی اشعار سے ہوئی مگر جو کچھ کہتے تھے لاپرواہی کے باعث لکھتے نہیں تھے۔ اس لیے وہ سب کلام ناپید ہو گیا۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر کے طریقہ چشتیہ میں منسلک ہوئے تھے۔ نہایت صاحبِ دل بزرگ اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کلام تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر کے تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کلام سادہ مگر دلنشین اور پُراثر ہوتا ہے۔ اور بالعموم تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ایک دیوان فارسی اشعار کا اور ایک دیوان اردو کلام کا یادگار چھوڑا۔ فارسی شعراء کے کلام کا ایک نہایت عمدہ انتخاب بھی "منتخب دیوانہا" کے نام سے کیا تھا۔ مضامینِ تصوف پر مشتمل ایک مثنوی "بوستانِ خیال" بھی لکھی تھی۔ اُن کا کلیات انجمن ترقی اردو نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ ۶ اپریل ۱۷۶۳ء مطابق ۴ شوال ۱۱۷۷ھ کو وفات پائی۔

سردار جعفری ۔ علی سردار آپ کا نام ہے۔ اور نام ہی کی مناسبت سے سردار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں بمقام ریاست بلرام پور (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ شروع میں لکھنؤ کے "سلطان المدارس" میں داخل ہو کر کچھ دینی تعلیم حاصل کی۔ مگر طبیعت کو مولویت سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لیے اُسے چھوڑ کر بلرام پور کے ہائی اسکول میں انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں عربک کالج دہلی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں سبط حسن اور مجاز کے ساتھ لکھنؤ سے رسالہ "نیا ادب" جاری کیا۔ طبیعت میں آزادی کی بے پناہ تڑپ تھی اور تمام سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس لیے ۱۹۴۰ء میں گرفتار کر لیے گئے جب

بمبئی تو بمبئی چلے گئے اور اب تک وہیں قیام ہے۔ علی سردار جعفری موجودہ زمانے کے ہونہار اور کامیاب شاعر ہیں۔ اور بعض بعض نظمیں الفاظ سے بڑی پرزور لکھی ہیں۔ ان کی رومانی شاعری بھی اچھی خاصی بلند ہے۔ اپنی شاعری میں جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ پرواز۔ خون کی لکیر اور ایشیا جاگ اٹھا۔ ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

اصغر سلیم ۔ محمد اصغر آپ کا نام ہے اور سلیم تخلص کرتے ہیں۔ اصغر سلیم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۱۹ء کو گجرات میں ہوئی۔ گجرات اور لاہور میں تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد لاہور کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے جہاں آپ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

جب آپ قریباً ۱۳ سال کی عمر میں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس وقت سے آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس لحاظ سے آپ کی شاعری کی عمر قریباً ۲۵ سال ہے۔ اس تمام عرصہ میں ملک کے مشہور ادبی رسائل میں آپ کا کلام شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتا رہا ہے۔ لاہور کی متعدد علمی اور ادبی مجالس میں بھی آپ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ "متاع ہنر" زیر طبع ہے۔

شعلہ ۔ ان کا نام منشی ہزاری لال تھا اور شعلہ تخلص کرتے تھے۔ منشی موتی لال ان کے والد کا نام تھا۔ ۱۸۴۲ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔ مگر آبائی وطن حصار تھا۔ بچپنے ہی میں والد کا انتقال ہو جانے سے بڑے ہوتے ہی معاش کی فکر دامنگیر ہو گئی۔ کچھ دنوں علیگڈھ کے محکمہ بندوبست میں نوکری کی۔ بعد ملازمت کی پابندیوں سے اکتا کر وکالت کا امتحان دیا۔ اور علیگڈھ میں وکالت کرنے لگے۔

فن شعر میں منشی بال مکند صبر اور غالب کے مشہور شاگرد مرزا تفتہ کے شاگرد تھے۔ آپ کا کلام ۱۹۳۶ء میں آگرہ یونیورسٹی کے ایم اے کے امتحان میں شامل تھا۔ نظموں اور غزلوں کا بہت سا مجموعہ یادگار چھوڑا جو کچھ طبع ہو گیا۔ کچھ نہ ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں انتقال ہوا۔

پروفیسر شور علیگ ۔ آپ کا نام منظور حسین ہے اور شور تخلص کرتے ہیں۔ جولائی ۱۹۱۰ء میں بمقام اسرار تی (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڈھ چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۶ء میں ایم اے ایل ایل بی ہو کر فارغ ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو و فارسی مقرر ہوئے اور تقسیم ملک تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ازاں بعد پاکستان آکر مختلف کالجوں میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل گورنمنٹ کالج لائلپور میں ہیں۔ شاعری کا آغاز علیگڈھ کی علمی فضا سے ہوا جو عمر اور وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں ایک ہیں۔

عظیم قریشی ۔ محمد عظیم آپ کا نام ہے۔ عظیم تخلص کرتے ہیں اور عظیم قریشی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ والد کا نام احسن قریشی ہے جو خود بھی شاعر ہیں۔ یعنی عظیم صاحب کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ آپ کا آبائی وطن قادیان (مشرقی پنجاب) ہے مگر آپ

۲۴ مارچ ۱۹۱۰ء کو کشمیر کی حسین و جمیل وادی اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ ہوش انبالہ میں سنبھالا۔ تعلیم لاہور میں پائی اور یہیں جنرل پوسٹ آفس میں ملازمت کا آغاز ہوا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی۔ اگرچہ آپ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی مگر آپ نے نظم کے میدان میں شہرت حاصل کی۔ مختصر نظم لکھنے میں آپ کو خصوصیت حاصل ہے۔ یعنی ان کی اکثر نظمیں ایک ایک دو شعروں پر مشتمل ہیں۔ "رادھا کے گیت" اور "آج کے نغمے کل کے شعلے" اُن کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات کا دیوان زیر طبع ہے۔

نظم کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی آپ کا اشہب قلم تیز دوڑتا ہے۔ چنانچہ "رادھا کے محبت نامے" ان کی دلچسپ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اور دوسری "جب جبینیں مسکراتا ہے" عنقریب چھپنے والی ہے۔

کلیم ـ آپ کا نام نکین احسن اور تخلص کلیم ہے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۳ء کو ریاست محمود آباد (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محمود آباد سیتا پور اور لکھنؤ میں پائی۔ گورنمنٹ کالج الہ آباد سے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ اور ایم۔ اے کی ڈگری بھی ۱۹۴۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات و نشریات میں ملازم ہو گئے۔ مگر ادبی ذوق اور علمی شوق کا پورا ہونا اس محکمہ میں ممکن نہ تھا اور طبیعت کو شاعری اور صحافت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے ایک ہی سال بعد اس ملازمت کو چھوڑ کر روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں چلے گئے اور تقسیم ملک تک اسی میں کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے۔ چونکہ طبیعت کو اسی پیشہ سے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ لہذا یہاں آ کر بھی اسی کو اختیار کیا۔ [illegible] روزنامہ "ملت" لاہور میں کام کرتے رہے۔ اور آج کل روزنامہ "نوائے وقت" کے شعبہ ادارت سے منسلک ہیں۔

آپ کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۲ء سے ہوا۔ اس فن میں کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں۔ مگر علامہ اقبال، مولانا سہیل، ڈاکٹر متاثر اور فراق گورکھپوری کے کلام سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ احباب میں سے مجروح سلطانپوری کے اشعار آپ کو خاص طور پر پسند ہیں۔ جہاں تک معلوم ہے آپ کا کوئی مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔

مائلؔ دہلوی ـ "مجموعہ نغز" میں اُن کا نام مرزا محمد یار بیگ لکھا ہے اور تخلص مائل ہے۔ یہ نہایت صاحب حیا۔ بہت باخلاق، متواضع، منکسر المزاج۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حلیم الطبع شخص تھے۔ فن شعر میں ان کو میاں قلندر بخش جرأت سے تلمذ تھا۔ اسی تخلص کے ایک شاعر دہلی ہی میں اور گزرے ہیں۔ جن کا نام میر محمدی شاہ تھا۔ یہ میاں قیام الدین علی قائم۔ استاد میر ظہورے خاں آشفتہ اور محمد نصیر الدین نصیر کے شاگرد تھے۔ حکیم ابو القاسم میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "بزیور علم و حیا آراستہ و بحلیہ مروت پیراستہ۔ بسیار درویش نہاد و آزادانہ ایام بسر می بود" (ص ۱۵۲) شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔

مجنوںؔ گورکھپوری ـ احمد صدیق نام اور مجنوں تخلص ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام موضع پلدہ ضلع بستی (یو۔ پی) میں

پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے کا امتحان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے کا سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور سے پاس کیا۔ اور وہیں اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ پھر علیگڈھ اور گورکھپور کے کالجوں میں پروفیسر رہے۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم، مشہور افسانہ نگار، اور مقبول شاعر ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں۔ ساحری۔ خواب و خیال۔ من پوش، افسانہ (فن افسانہ نگاری کی تاریخ)، شوپنہار۔ ہندوستان کی بہادر عورتیں، مجنوں کے افسانے۔

مہر دہلوی۔ منشی سورج نرائن نام۔ مہر تخلص۔ اصل وطن دہلی تھا۔ جہاں کے ایک معزز کائستھ خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بی۔ اے کی ڈگری آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لی اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ جہاں آپ مدت دراز تک راولپنڈی اور دہلی میں انسپکٹر تعلیمات رہے۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے زمانہ میں پرلوڈر آف کیس بھی رہے۔ بچوں کے لیے درسی کتب بھی آپ نے محکمہ کی طرف سے لکھیں۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ سب سے پہلے ماہوار رسالہ "کائستھ مترا" میں آپ کی نظمیں چھپیں۔ اس کے بعد رسالہ زمانہ کانپور میں بھی آپ اپنا کلام بھجواتے رہے۔ اپنے پیر اور مرشد مہاتما شیو برت لال کے رسالہ "سادھو" کو آپ ہی ایڈٹ کرتے تھے اور اس میں اپنی نظمیں بھی شائع کرتے تھے۔ آپ کی نظموں میں تصوف کا رنگ بہت غالب ہے جسے سنسکرت میں ویدانت کہتے ہیں۔ آپ کی تمام نظمیں پاکیزہ خیالات اور اخلاق و موعظت سے بھری ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی آپ نے بکثرت نظمیں لکھی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ کلام مہر کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں تھیں۔ وہ دو علیحدہ حصوں میں شائع ہوئی ہیں۔

نشتر جالندھری۔ آپ کا نام محمد عبدالحکیم خاں ہے اور نشتر تخلص کرتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء سال پیدائش ہے۔ اور مقام ولادت میانوالی۔ جو کہ ضلع جالندھر کے مضافات میں ایک مشہور موضع ہے۔ یہ گاؤں آپ ہی کے بزرگوں کا آباد کیا ہوا ہے جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں افغانستان سے یہاں آئے تھے۔

نشتر نے ابتدائی تعلیم شاہ کوٹ، نکودر اور جالندھر میں پائی۔ پھر اپنے بھائی مولوی عبدالغفور کے پاس کوئٹہ چلے گئے۔ جہاں انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہیں ایک اسلامیہ سکول کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اردو ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے ایک فوجی کالج میں تعینات ہو گئے۔

آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ وکیل امرتسر سے ہوا۔ جس کے بعد لاہور آ کر تہذیب النسواں۔ پھول۔ زمیندار۔ انقلاب۔ ادیب۔ دلگداز۔ پیام ادب اور اخبار حمایت اسلام میں کام کرتے رہے۔ اور مختلف پبلشرز کے لیے درسی کتب لکھتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں نظم طباطبائی کو اپنا استاد بنا دیا۔ پاکستان کے غزل گو شعرا میں خاصے مشہور ہیں۔ نہایت خلیق۔ متواضع اور سادہ طرز رکھنے والے بزرگ ہیں۔ غزل کے علاوہ تمام اصناف سخن پر حاوی ہیں۔

اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور شعبدہ بازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا اس قدر شہرہ ہوا کہ غازی الدین حیدر فرمانروائے اودھ نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ انہوں نے مصحفی اور انشا سے لے کر وزیر اور صبا تک کا زمانہ دیکھا اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ خیالات کی بلندی، مضامین کا تنوع، بندش کی چستی، فارسی ترکیبوں کی دل آویزی اور بیان کی شائستگی ان کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔ انہوں نے ۱۸۵۵ء میں انتقال کیا۔

اختر اورینوی - اختر احمد نام، اختر تخلص ہے۔ علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل اور پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ صوبہ بہار کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا ممتاز درجہ ہے۔ کلام میں صفائی پائی جاتی ہے۔

ازل - ابو الاعجاز منشی عبد المجید ازل لاہور کے ایک شریف راعی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی جس سے سلاست زبان اور صفائی بیان کی خوبی آپ کے کلام میں پیدا ہوگئی۔ آپ کی غزلیں عام طور پر استاد کے رنگ میں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔

اسد - سلیمان خاں نام، نواب خطاب، نواب محبت خان منغو کے نواسے، امیر کے شاگرد اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خواجہ آتش کا زمانہ دیکھا تھا، رند اور صبا کے معاصر تھے۔ کچھ دنوں کے لئے ٹونک چلے گئے تھے۔ نواب صاحب ٹونک اور ان کے صاحبزادے ان کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر یہیں قیام کر لیا۔ امیر کے شاگردوں میں ان کا رنگ خاص ہے۔ زبان بہت صاف، ترکیب سلجھی ہوئی، بندشوں میں مضامین پیدا کرتے ہیں۔

اشک رامپوری - واجد علی خاں نام، اچھے صاحب عرف تھا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والئے رامپور کی اولاد سے تھے۔ جوانی میں بڑے بانکے چھبیلے تھے۔ بڑی آن بان، بڑے ٹھاٹ باٹ اور کر و فر سے رہتے تھے۔ چودہ برس انگلستان اور جرمنی میں گزارے۔ انقلاب زمانہ سے طبیعت نے پلٹا کھایا تو فقیر گوشہ نشین ہوگئے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد گولڑہ (راولپنڈی) کی خانقاہ میں رہتے تھے۔ پھیپھڑوں میں کینسر ہوگیا تھا۔ آپریشن کرانے پر حرکت قلب بند ہوگئی۔ اس طرح ۱۹۵۸ء کے آخر میں یہ بڑا شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔

اظہر امرتسری - خدا بخش نام، اظہر تخلص، امرتسر وطن تھا۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم باقاعدہ حاصل نہ کر سکے لیکن کثرت مطالعہ سے عربی، فارسی اور اردو میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ تحریک خلافت کے بعد سیاست میں دخل دینے لگے۔ کئی بار قید ہوئے۔ راولپنڈی سے ہفت روزہ ترجمان سرحد جاری کیا۔ ان کی نثر میں مولوی محمد حسین آزاد کے استعارے اور تشبیہات اور مولانا ظفر علی خان کا سا طنز پایا جاتا تھا۔ عرصہ دراز تک زمیندار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور انتقال سے پہلے [illegible]۔ نظمیں بھی لکھتے تھے اور غزلیں بھی۔ کلام بلند، زبان فصیح اور اسلوب بیان اچھوتا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں ۵۷ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔

اعظم ـ مرزا اعظم علی نام، الہ آباد کے رہنے والے، منشی محمد رضا کے فرزند اور آتش کے شاگرد تھے۔ آگرہ میں عرصہ تک سرکاری ملازم رہے۔ پنشن لے کر الہ آباد آئے تو خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۲۸۲ھ میں ان کا دیوان چھپا۔ جو نایاب ہے۔ اعظم نے آتش کے رنگ کو خوب نباہا ہے۔ بے ساختگی اور لطف زبان ایک ایک شعر میں نمایاں ہے۔

بیتاب ـ سنتوکھ رائے نام، قائم چاند پوری کے معاصر تھے۔ ان کے کلام میں پختگی، سوز و گداز اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ (جواہر سخن)۔

بسمل ـ (پروفیسر) عبد المنان نام، بسمل تخلص ہے۔ صوبہ بہار کے نغز گو شاعر ہیں۔ کلام میں رنگینی پائی جاتی ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ فارسی ادب پر بھی آپ کو قدرت حاصل ہے۔ نظم کے علاوہ اردو ادب کے ایک بلند پایہ نثر نویس بھی ہیں۔

پیام شاہجہانپوری ـ نام محمد مبین خاں۔ تخلص پیام ہے۔ پیدائش ۱۶ راگست ۱۹۲۰ء کو شاہجہانپور کے ایک پٹھان رئیس خاندان میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہو کر اردو، انگریزی اور فارسی کی تحصیل کی۔ کتب بینی کا شوق ابتدائے عمر سے ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں کلرک تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے۔ کچھ عرصہ آزاد کشمیر فورسز میں ملازم رہ کر محاذ جنگ پر خدمات انجام دیں۔ کشمیر سے واپس آکر ادبی زندگی شروع کی۔ شعر و شاعری کا شوق تو شاہجہانپور ہی سے تھا۔ اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کی شاگردی اختیار کر کے شاہجہانپور کے علاوہ بریلی۔ بدایوں۔ سہارنپور۔ پیلی بھیت۔ ہردوئی اور دیوہ شریف وغیرہ کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دے چکے تھے۔ پاکستان آکر ان کی نثر نگاری کی ابتدا ہوئی۔ مختلف اوقات میں ہفت روزہ آشیانہ اور برق لاہور میں ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ آج کل ہفت روزہ حمایت اسلام کے ایڈیٹر اور ماہنامہ معاشرتی بہبود کے مدیر اعزازی ہیں۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق ہے۔ تاریخ اسلام کا نیوین صدی کی اسلامی نثر۔ جنوبی ہند میں اردو۔ میخانہ نجم۔ روح نگارش (علمی و ادبی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ) مقام حسین۔ علی اور ان کی خلافت وغیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری میں غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور رنگینی پن ہے۔ تیوروں کی شاعری کی جان ہیں۔ پامال اور فرسودہ خیالات سے اکثر دامن بچاتے ہیں۔

عبد الرشید تبسم ایم اے ـ آپ کا تعلق ضلع گورداسپور کے ایک علمی خاندان سے ہے۔ ۲۹ رجون ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور انعامات حاصل کئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ کالج سے فارغ ہو کر اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ بعض روزانہ اخبارات اور ماہوار رسالوں کی ادارت کی۔ ۲۵ راپریل ۱۹۴۱ء کو مرکزی حکومت ہند کے محکمہ دفاع میں ملازم ہو کر گیارہ سال دہلی۔ سیالکوٹ۔ احمد آباد۔ بمبئی۔ شاہجہانپور اور لاہور میں متعین رہے۔ ۱۹۵۲ء میں استعفیٰ دے کر دو سال ادارہ ثقافت اسلامیہ کے پبلسٹی افسر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کی علمی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ یہاں مولانا رومی کی فارسی تصنیف فیہ مافیہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو "ملفوظات رومی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ گذشتہ چار سال سے ہفت روزہ کوآپریشن کے ایڈیٹر ہیں۔ ایک ناول "وزیر اعظم"

اور کہانیوں کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں ۔ افسانوں کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے ۔ غزلیں اور نظمیں بھی کہتے ہیں ۔ زبان کے متعلق ابتدا ہی سے مولانا عبدالمجید سالک سے مشورہ کرتے ہیں ۔

تشنہ بلند شہری ۔ حافظ محمد یوسف خاں تشنہ بلند شہر کے رہنے والے اور نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے ۔ آپ ملا گڑھ کے مقام پر ایک پٹھان سپاہی پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے ۔ کچھ عرصہ سوداگری کرتے رہے پھر ایک برس کے قریب دکن میں داغ کے پاس مقیم رہے ۔ فطری جولان اور عشق کی وجہ سے شعر بہت اچھے کہتے تھے ۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی ۔ ان کا دیوان طبع ہو گیا تھا مگر اب نایاب ہے ۔ تشنہ نے عمر طبعی پا کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا ۔ آپ کے بیٹے ضمیر الدین ضمیر استاد ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے ۔ تشنہ بالکل اپنے استاد کے رنگ میں شعر کہتے تھے ۔ روزمرہ کی صفائی بندش کی چستی اور زبان کی شیرینی ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں ۔

تعشق ۔ سید مرزا نام ، لکھنؤ کے رہنے والے ، ناسخ کے شاگرد تھے ۔ مگر غزل میں ان کا رنگ سب سے نرالا تھا ۔ زبان کے ساتھ طرز ادا ۔ سادگی کی خوبی اور سوز و گداز کے مضامین اس طرح ادا کرتے ہیں کہ دل کھنچ جاتا ہے ۔

تمنا عمادی مجیبی (پھلواری) محی الدین نام ، تمنا تخلص ہے ۔ آپ عظیم آباد کے بڑے پرگو شاعر ہیں ۔ کلام میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے ۔ بہار کے سے آپ کا دم بس غنیمت ہے ۔

ثاقب زیروی ۔ محمد صدیق نام ہے ۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں وادیٔ ستلج کے ایک گاؤں ماہی والہ (تحصیل قصور) میں پیدا ہوئے لیکن دو سال بعد اراضی کے تنازعات کے نتیجے میں سارا خاندان زیرہ ضلع فیروز پور میں منتقل ہو گیا جس سے نسبت خصوصی کے باعث ۱۹۴۷ء میں بالجبر نکال دئے جانے کے باوجود اب تک زیروی کہلاتے ہیں ۔ وہیں ۱۹۳۴ء میں انٹرنس پاس کیا ۔ پھر کلرکی ، نظارت ، سب انسپکٹری اور نہ جانے کیا کیا کچھ حصول معاش کی خاطر کیا ۔ لیکن فکر سخن نوری جماعت سے لے کر ہمیشہ ہم رکاب رہی ۔ ثاقب تخلص آپ کی والدہ کا عطا کیا ہوا ہے ۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں لاہور آ کر روزنامہ انقلاب کے عملہ میں شامل ہوئے ۔ ۱۹۴۷ء کے وسط میں زیرہ لوٹے تو تعصبات تقسیم کے جنگل میں جا پہنچے تمام انسان ہندو مسلم اور سکھ بن چکے تھے ۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی ۔ اس لہو کے سمندر میں ڈوب کر ساڑھے چودہ میں سے صرف ڈیڑھ ۶ افراد کے ساتھ لاہور پہنچے ۔ کچھ عرصہ روزنامہ احسان میں جہاں گشت کے نام سے "مطائبات نویسی" کرتے رہے ۔ ساتھ ہی ساتھ پرائیویٹ طور پر بی اے تک تعلیم مکمل کی ۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو سال مختلف جرائد و رسائل میں کالم نویسی کرنے کے بعد ہفت روزہ "لاہور" جاری کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے ۔

۱۹۴۷ء سے قبل قومی منظومات کے تین مجموعے "ہمارے نغمے" "ماہ کامل" اور "دورِ خسروی" شائع ہوتے ۔ ۱۹۵۸ء میں اردو اکیڈمی لاہور نے ثقافتی منظومات کا ایک مجموعہ "اس بازار میں" شائع کیا ۔ اور اب پہلا حاصل فکر سخن ۔ "شہاب ثاقب" ——— زیر طباعت ہے ۔ غزل میں ان کا اپنا رنگ ہے ۔ اور بہت خوب ہے ۔

جالب ۔ سید بشارت علی نام اور جالب تخلص تھا ۔ دہلی کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے ۔ نہایت پختہ مغز اخبار نویس تھے
بہت عرصے لاہور میں پیسہ اخبار کے ایڈیٹر رہے ۔ معلومات کے لحاظ سے چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے ۔ آخری عمر میں لکھنؤ جاکر تعلقہ داران اودھ
کے روزنامہ اخبار ہمدم کے ایڈیٹر ہو گئے تھے ۔ بعد میں اپنا اخبار ہمت جاری کر لیا تھا ۔ وہیں ساٹھ ستر برس کی عمر پاکر جولائی ۱۹۳۱ء میں فوت ہوئے

جگر بسوانی ۔ نام حکیم محمد افتخار علی تخلص جگر تھا ۔ آپ کے والد شیخ امیر علی خاں جو حضرت آتش لکھنوی کے شاگرد تھے ۔
جگر ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۸۷۲ء بسواں ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے فارسی کی تکمیل کے بعد اسکول میں انگریزی کی تعلیم حاصل
کرنے کے لئے بھیجے گئے ۔ لکھنؤ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۸۹۶ء میں رامپور جاکر حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا ۔ جہانگیر آباد کے
راجہ نوشاد علی خاں آپ کے خاص قدر دان تھے ۔
۱۸۹۷ء میں تجارت شروع کی لکھنؤ میں ان کا کاروبار خوب چمکا ۔ لیکن ۱۹۰۷ء میں مستقل طور پر بمبئی کاروبار کرنے کی نیت سے چلے گئے
چونکہ فطرتاً عزلت پسند تھے ۔ اس لئے ترقی کی بیل افسردہ ہوکر رہ گئی ۔ ۱۹۱۰ء میں وطن واپس آئے ۔ کلکتہ بھی تشریف لے گئے ۔ لیکن وہاں بھی
کام نہ چلا ۔
آپ کی شاعری میں قدیم رنگ نمایاں ہے ۔ دیوان ۱۹۲۳ء میں طبع ہو چکا ہے ۔
۱۹۵۵ء میں وفات پائی ۔ اور اپنے وطن بسواں ہی میں سپرد خاک ہوئے ۔

جگر بہاری ۔ سید شاہ نصیر الدین نام ، جگر تخلص ہے ۔ شاعری میں شاہ شفیع سے تلمذ حاصل ہے ۔ یہ صوبہ بہار کے دردمند
شاعر ہیں ان کی زندگی سرتاپا شعریت اور درد و الم کی تصویر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر شعر میں درد اور تڑپ ہے ۔

جمیل مظہری ۔ آپ صوبہ بہار کے مقبول شاعر اور ادبی دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔ قیام زیادہ تر کلکتہ میں رہتا ہے ۔ وحشت
کلکتوی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے ۔ (بہار اور اردو شاعری ص ۳۲)

جوشش ۔ احمد حسن خاں نام ، نواب خطاب ، اچھے عرف عام ، لکھنؤ کے رہنے والے تھے ، ابتدا سے طبیعت شاعری کی طرف
راغب تھی ۔ پہلے نواب عاشق علی خاں عاشور اور راسخ مرحوم سے مشورۂ سخن کیا ۔ آخر میں امیر کے شاگردوں میں داخل ہوئے ۔ مگر راسخ اور امیر
دونوں سے مختلف رنگ ہے ۔ غزل میں سلاست اور روانی کے ساتھ درد بھی ہے ۔ انداز بیان میں تاثیر اور شگفتگی ہے ۔
۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی ۔

جوشش ۔ شیخ محمد روشن نام ، جسونت رائے ناگر کی اولاد سے تھے ۔ علم عروض میں کافی دخل تھا ۔ خواجہ میر درد کے پیرو کہے
جاتے ہیں لیکن ان کا کلام درد کی خصوصیات سے خالی ہے ۔ بہرحال اپنے رنگ میں اچھا کہتے ہیں ۔ ان کے کلام میں خاص طرح کی چاشنی ضرور ہے ۔

جوہر ۔ مادھو رام نام ، جوہر تخلص ، لالہ جواہر مل ساہوکار کے بیٹے ، فرخ آباد کے رہنے والے ، منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ، مستند اور قادر الکلام شاعر تھے ۔ ایک دیوان یادگار ہے ۔ چودھویں صدی ہجری کے شروع میں وفات پائی ۔ کلام دلچسپ ، صاف اور شستہ بے تکلف لکھتے ہیں ۔ معاملہ بندی ان کا خاص طرز ہے جو جدت سے خالی نہیں (خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۹۷ جواہر سخن جلد ۴ ص ۱۳۹)

جوہر ۔ جوہر سنگھ نام ، جوہر تخلص ، منشی بختاور سنگھ راقم کے بیٹے ، لکھنؤ کے رہنے والے ، قوم کے کائستھ اور راجا لال جی کے حقیقی بھتیجے تھے جو امجد علی اور واجد علی شاہ کے زمانے میں فوج کے بخشی تھے ۔ قل محمد خاں ناطق اور خواجہ وزیر سے اصلاح لیتے تھے ۔ (سخن شعراء ص ۹۱۸ و خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۱۲) اور مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے ۔ اردو کے پانچ دیوان ان سے یادگار ہیں ۔ غالباً ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی ۔ زبان کی خوبی اور سلاست کے علاوہ کلام میں تصوف غالب ہے ۔ اکثر جگہ مسئلہ وحدۃ الوجود کو تغزل کے مقبول رنگ میں بیان کیا ہے ۔ (جواہر سخن جلد ۴ صفحہ ۱۸۲) ۔

جنوں ۔ علی محمد خاں نام ، نواب سراج الدولہ سردار جنگ خطاب ، فیض آباد کے رئیس تھے ۔ ان کے والد نواب محتشم الدولہ مدبر الملک مرزا باقر علی خاں بہادر فتح جنگ مشہور تھے ، دادا رضیا کمنڈ کے صوبیدار تھے ۔ جنوں نے ابتدا میں آتش سے مشورۂ سخن کیا ۔ آتش کی وفات کے بعد اسیر کو اپنا کلام دکھایا ۔ ان کے دو دیوان سراج النظم اور مصباح التکلم کے نام سے چھپے ۔ دونوں دیوان غزلوں کے مجموعے ہیں ۔ کلام میں لفظی شان و شوکت زیادہ ہے ۔

حامی ۔ پیر وزیر علی شاہ حامی ہمارے عہد کے مشہور علم دوست بزرگ پیر غلام دستگیر نامی کے بڑے بھائی اور حلیم کے شاگرد تھے ، آپ غزلیں ، نظمیں ، قصیدے ، مرثیے ، قطعے اور رباعیاں سب ہی کچھ کہتے تھے مگر آخری عمر میں نعتوں کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا تھا ۔ آپ نے دو دیوان ، ایک غزلوں کا اور دوسرا نعتیہ اپنی یادگار چھوڑے ہیں ، نعتیہ دیوان چھپ چکا ہے مگر غزلوں کا غیر مطبوعہ ہے ۔ وسط ۱۹۳۰ء میں بعمر ساڑھے ترپن سال فوت ہوئے ۔

حرماں خیر آبادی ۔ فرید احمد نام ، حرماں تخلص ہے ۔ ولادت ۱۹۱۰ء میں خیر آباد میں ہوئی ۔ آپ کے والد کا نام وحید احمد اور پیشہ زمینداری ہے ۔ حرماں چھ سات سال کی عمر میں اپنی ننہیال سندیلہ چلے آئے اور پندرہ سولہ برس تک وہیں پرورش پائی مگر تعلیم سے محروم رہے ۔ بے علمی نے آوارگی پر مجبور کیا ۔ سندیلہ سے کانپور ، آگرہ ہوتے ہوئے حیدر آباد دکن پہنچے اور مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد کے حضور باریاب ہوئے ۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں مولانا حمید الدین قمر فریدی کی کوشش سے آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور چلے آئے اور میٹرک تک انگریزی پڑھی اس وقت سے پاکستان ہی میں قیام ہے ۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "کلام حرماں" کے نام سے لاہور میں شائع ہو چکا ہے ۔

حسن ۔ خواجہ حسن نام، خواجہ ابراہیم کے بیٹے اور بخاری مودودی کے نواسے تھے۔ دہلی ان کا وطن تھا۔ وجیہ اور خوبصورت تھے۔ بذلہ گوئی اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ لکھنؤ کی بخشی نام طوائف کو دل دے بیٹھے تھے۔ اشعار میں جا بجا اپنے خیال میں اس کے نام کا نگینہ جڑا ہے۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ اکثر اشعار دل کی زبان سے کہتے ہیں۔ جذبات عشق کے اظہار میں محاورات اور زبان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ شاعری میں جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ (جواہر سخن، سخن شعرا، خمخانۂ جاوید)

خاموش ۔ شاہ معین الدین نام، حیدر آباد (دکن) کے رہنے والے تھے۔ صابریہ طریقے کے فقیر تھے، کلام میں تصوف کا رنگ ہے۔ اس کی خاص خاص اصطلاحیں موزوں طریقے سے لاتے ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں انتقال ہوا۔ (دکن میں اردو۔ جواہر سخن جلد اول ص ۲۹۲)

خلیل ۔ دوست علی نام، سید جمال علی کے بیٹے، باڑی (اودھ) کے رہنے والے آتش کے شاگرد تھے۔ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں چکلہ دار تھے۔ اس لیے زندگی عیش و راحت سے بسر کی۔ ۱۲۷۱ھ میں کلکتہ گئے۔ غزلوں کا دیوان چھپ چکا ہے۔ کلام میں تصوف کا رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں ابتذال بھی ہے۔ دل نشینی کم ہے البتہ الفاظ کا اہتمام زیادہ ہے۔

راقم ۔ بندرابن نام، قوم کائستھ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ بعض انہیں مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں، بعض سودا کا اور بعض میر کا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ میر ہی کے شاگرد تھے کیونکہ خود میر نے ان کو اپنے تذکرہ میں اپنا شاگرد بتایا ہے۔ آخر میں سودا کو بھی کلام دکھاتے تھے۔ فن شعر کے ماہر تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کے اشعار میں روانی ہے، غزل میں رنگ کسی قدر پھیکا ہے تاہم لطف سے خالی نہیں۔ جواہر سخن جلد اول ص ۲۸۷۔ مخزن نکات، چمنستان شعرا، نکات الشعرا)

رسا جالندھری ۔ کبیر خاں نام، رسا تخلص، جالندھر وطن ہے۔ تقسیم کے بعد جالندھر سے پاکستان آ گئے ہیں اور لاہور میں رہتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ زبان نہایت شیریں اور شگفتہ۔ بندش چست اور استادانہ اور تخیل بلند اور ارفع ہے۔

ریحان ۔ دیا کرشن نام، گنگا بخش عزیز کے بیٹے اور قوم کے کائستھ سریواستو تھے۔ مولد شاہ آباد تھا مگر لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ عام طور پر مصحفی کے شاگرد مشہور ہیں مگر صاحب خمخانۂ جاوید نے موجی تید مصحفی کا شاگرد لکھا ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں راجہ الفت رائے کے بخشی تھے۔ نازک مزاج، وضعدار اور خوش تقریر تھے۔ علمی استعداد معقول تھی۔ غزل میں اخلاقی مضامین کا عنصر غالب ہے۔ سوز و گداز اور صفائی بھی ہے۔ لفظی پابندیوں سے دامن بچاتے ہیں۔ انداز بیان دلنشیں ہے۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی (جواہر سخن) دوسری جلد ص ۱۳۸

ذاکر ۔ ذاکر علی نام، ذاکر تخلص، شاہ پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے، آگرے کی کمشنری میں سر رشتہ دار اور حاتم علی بیگ مہر

کے شاگرد تھے ۔ ۱۳۱۳ھ کے بعد وفات پائی ۔ ان کا دیوان جس کا تاریخی نام "نغمۂ بہار" (۱۳۰۳ھ) ہے مطبع بہار ہند آگرہ میں ۱۳۰۴ھ میں چھپا ۔ فارسی کا بھی ایک مختصر مجموعہ ان سے یادگار ہے ۔ ذاکر پرگو شاعر تھے ۔ کلام میں سادگی ، روانی اور صفائی کا عنصر کم ہے ۔ انداز بیان پاکیزہ ہے اور تغزل میں ناسخ کا رنگ معلوم نہیں ہوتا بلکہ آتش کا گداز موجود ہے ۔ (جواہر سخن جلد چہارم ص ۹۴ ، خمخانۂ جاوید ج ۳ ص ۲۳۰)

ذکی ۔ مہدی علی خاں نام ، کرامت علی خاں کے بیٹے ۔ آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر ان کا مولد و مسکن مراد آباد تھا ۔ محمد سعید خاں والئ ریاست رام پور سے وظیفہ ملتا تھا ۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے کچھ دنوں دہلی ، بہار ، نپور اور حیدر آباد دکن میں بھی رہے اور ہر جگہ ان کی قدر ہوئی ۔ واجد علی شاہ کے عہد میں پھر لکھنؤ آئے اور ملک الشعرا کا لقب حاصل کیا ۔ غدر کے بعد خانہ نشین ہو گئے تھے ۔ لیکن نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کا شہرہ سن کر رام پور بلایا ۔ وہیں ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی ۔ ان کے کلام میں درد و گداز بھی ہے اور زبان و بیان کی خوبیاں بھی ۔ اکثر اشعار دلنشین ہیں ۔

سجاد علی انصاری ۔ سجاد علی انصاری بی اے ۔ ایل ایل بی (علیگ) گدیہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے ۔ بڑے خوش شمائل ، خوش فکر اور خوش باش تھے ۔ جوانی میں انتقال ہو گیا ۔ وہ ادب برائے ادب کے نظریے کی پیداوار آزاد خیال صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے ۔ ان کا اشہب قلم بعض اوقات تو ایسی دوشیزہ زمینوں کو پامال کرتا تھا کہ "رسم و رہ عوام" کے پابند جھجک کر رہ جاتے تھے ۔ ان کی نظم و نثر کا مجموعہ "محشر خیال" کے نام سے ان کے دوست خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) نے ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء میں مرتب کیا تھا اب لاہور میں دوبارہ طبع ہوا ہے ۔

سحر ۔ راجہ نواب علی خاں نام ، بہادر جنگ خطاب ، ریاست محمود آباد کے والی ، واجد علی شاہ کے خاص مصاحب تھے ۔ ابتدا میں ناسخ کے شاگرد ہوئے ۔ پھر مرزا فرخ کے ۔ لیکن رنگ دونوں سے جدا ہے ۔ ۱۲۷۶ھ میں وفات پائی ۔ کلام سے مضمون آفرینی اور طباعی کا پتہ چلتا ہے ۔ محاورہ بندی بھی ہے اور سلاست بھی ۔ لفظی رعایات ، تشبیہ اور استعاروں کے استعمال سے سوز و گداز پیدا کرتے ہیں ۔

سحر ۔ شیخ امان علی نام ، لکھنؤ کے رہنے والے ، شیخ امین علی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے ۔ کچھ عرصہ ناسخ کے شاگرد برق سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا ۔ شہرت نے واجد علی کے دربار تک رسائی کر دی ۔ بڑے چھبیلے اور جامہ زیب تھے ۔ غدر کی آندھی میں کچھ دنوں فرخ آباد ، بلگرام ، کاکوری وغیرہ بھٹکتے رہے ۔ آخر لکھنؤ آ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے ۔ انہوں نے اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر واسوخت میں زیادہ شہرت پائی ہے ۔ زبان سلیس اور با محاورہ ہے ۔ لفظی صنائع بدائع کی پابندی کبھی کبھی ضلع جگت تک پہنچ جاتی ہے

سحر ۔ اقبال بہادر ورما نام ، سحر تخلص ، وطن ہنگام ضلع فتح پور ہے ۔ ان کے والد منشی شیو نرائن اپنے قصبہ کے باقاعدہ

اور سنجیدہ مزاج رئیس، مذہبی اور شاعر تھے۔ سحر نے پہلے مکتب میں اردو فارسی پڑھی، پھر انگریزی۔ ۱۹۰۲ء میں انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا اور [illegible] میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا، مگر آگے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ اسی دوران میں صحت خراب ہو گئی۔ قدرے آرام ہوا تو [illegible] میں کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ (مثنوی سحر) ختم کیا جو زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا، کچھ عرصہ بعد عمر خیام کی تقریباً پانچسو رباعیوں کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا جسے انڈین پریس الہ آباد نے [illegible] میں بیج در بیج سے مصور شائع کیا۔ سحر کے اردو کلام میں جدت، نازک خیالی اور سوز کے اثرات موجود ہیں۔

سرور جہاں آبادی ۔ منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص، جہان آباد (ضلع پیلی بھیت) وطن تھا۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے فارسی مولوی کرامت اللہ سے پڑھی اور شاعری میں جان یزدانی میرٹھی سے اصلاح لی۔ کثرت بادہ نوشی کی وجہ سے ۳۷ سال کی عمر پا کر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ بہت زود گو تھے۔ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مزاج میں حزن و یاس اور رنج و الم غالب تھے۔ اسی لئے کلام میں جذبات نگاری اور درد و سوز زیادہ ہے۔ ان کا مجموعہ کلام خمخانۂ سرور کے نام سے چھپ چکا ہے۔

شاعر ۔ میر کلو نام، میر درد کے عزیز اور مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مرزا مظہر کے شاگردوں کا جو رنگ ہے۔ ان کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے جواہر سخن، گلشن ہند، خم خانۂ جاوید، تذکرہ میر حسن، تذکرہ مصحفی میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

شرف ۔ نام سید سادات حسین، عرف آغا مجو، سید محمد میر عرف میرن صاحب کے بیٹے لکھنؤ کے رہنے والے تھے غزلوں میں جا بجا آتش کا رنگ جھلکتا ہے۔ لفظی رعایات کے ہیر پھیر میں نہیں پڑتے۔ معنوی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شمس مینائی ۔ شیخ عبد الرحمن نام، ابو المعانی کنیت، تخلص اردو میں شمس فارسی میں مینائی تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں بمبئی چلے گئے اور چاندی کے برتن بنانے والے ایک کارخانہ میں ملازم ہو گئے۔ وہاں حاجی تجمل حسین، مرزا مفتون لکھنوی، عاشق دہلوی اور حفیظ جونپوری کی صحبت میسر آ جانے سے شعر کہنے لگے اور مطالعہ و مزاولت کی بدولت فارسی میں اچھی خاصی استعداد بہم پہنچالی۔ آپ نے قدیم و جدید طرزوں میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ آخری زمانے میں ضعف پیری کے سبب بینائی کی دولت سے محروم ہو گئے تھے [illegible] میں اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ "جام مینائی" کے نام سے مرتب کر کے امرتسر میں چھپوایا مگر وہ تقسیم ملک کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ [illegible] کو لاہور میں انتقال کیا۔

شمس منیری ۔ (حافظ) شمس الدین نام، شمس تخلص، خانوادہ منیری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے منیری کہلاتے ہیں۔

صوبہ بہار کی چند محترم ہستیوں میں ہیں۔ شعر و ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں، ہر صنف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثر نویسی میں بھی آپ کا ممتاز درجہ ہے۔

شوق ۔ پنڈت جگموہن ناتھ رینہ نام، شوق تخلص، پنڈت دشیشور ناتھ رینہ کے بیٹے تھے جن کا آبائی تعلق ریاست جاورہ سے تھا۔ شوق کے جد امجد کو نواب غفور خاں نے ریاست جاورہ کا دیوان مقرر کیا تھا۔ شوق ۱۸۶۳ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے اور تلاش معاش میں شمالی ہندوستان آئے اور ۱۸۹۰ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ آپ نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے تیرہ ضلعوں میں خدمات انجام دیں اور ۱۹۲۰ء میں پنشن لی۔ شعر و شاعری کی دنیا میں آپ کو پہلے امیر مینائی۔ پھر سید محمد نوح صاحب نوح ناروی اور آخر میں تاباں بدایونی جیسے استاد ملے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "پیام شوق" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔

شوق نیموی ۔ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی ضلع پٹنہ کے قریہ نیمی میں پیدا ہوئے سنہ ولادت ۱۲۷۸ ہجری ہے۔ شوق صوبہ بہار کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی اردو دانی کا لوہا لکھنؤ اور دہلی والے بھی مانتے ہیں۔ آپ کی تالیف آثار السنن علم حدیث کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے دیوان ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اصلاح، ازاحۃ الاغلاط اور تذکرہ یادگار وطن بھی آپ کی چند تصانیف ہیں۔

صاحب و شفیق ۔ لچھمی نرائن نام، اورنگ آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد لالہ منسا رام مرہٹہ سلطنت دکن میں صدر الصدور کے پیشکار رہے۔ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی شیخ عبدالقادر سے کتب درسی پڑھیں۔ فن شعر میں علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پہلے صاحب تخلص کیا۔ جب میر محمد مسیح "صاحب" کا شہرہ ہوا تو آزاد کے مشورے سے شفیق تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان میں صاحب اور دوسرے میں شفیق ملتا ہے۔ ان کی زبان دکن کے ہمعصروں کے مقابلے میں صاف ہے لیکن شاعری میں کوئی خاص درجہ نہیں لفظی رعائتیں زیادہ ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۷۷)

ضیا جعفری ۔ سید عنایت علی شاہ نام، ضیا تخلص ہے۔ آپ کے والد سید مرتضےٰ شاہ کیمبل پور میں انسپکٹر تھے۔ وہیں بمقام جاتری ۱۹۰۵ء میں ضیا پیدا ہوئے ابتدائی زمانہ کیمبل پور میں گزرا۔ والد کی پنشن کے بعد پشاور چلے گئے۔ دسویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے کہ پولیس میں سب انسپکٹر ہو گئے۔ افتاد طبع کے باعث زیادہ دن ملازمت نہ کر سکے مستعفی ہو کر شعر و ادب کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے بعد روزنامہ "سرحد" اور "انگارہ" ہفت روزہ "شرر" "اصلاح سرحد" اور "تعمیر نو" کے اداروں میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ بزم سخن پشاور آپ کی ادبی زندگی کا پہلا گہوارہ ہے جہاں آپ کی شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ آپ نے دائرہ ادبیہ کی داغ بیل ڈالی جس نے ترقی یافتہ ادب کی طرف قدم اٹھایا۔ پشاور میں انجمن ترقی اردو کا قیام بھی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شعر و سخن کی طرف آپ کا فطری رجحان ہے۔ اگرچہ نظم، قصیدہ قطعہ غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مگر غزل سے خاص لگاؤ ہے۔ تنقید نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ فارسی کے بھی بے بدل شاعر ہیں آپ کی رباعیات کا ایک مجموعہ "صبوحی" کے نام

سے چھپ چکا ہے۔ ریڈیائی مضامین "لہروں پر" اور مجموعہ کلام "ویرانے" زیر طبع ہیں۔

طالب باغپتی ۔ کنور محمد لطافت علی خاں طالب باغپتی بقول جگر مراد آبادی "سلیم الفطرت، وسیع المشرب، لطیف الخیال انسان واقع ہوئے ہیں۔ متلاشی پہلو والا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ رنگینی و رعنائی کے ساتھ ساتھ بہت سادہ مزاج، تکلفات، وتصنعات سے بڑی حد تک کنارہ کش ۔ ان کی زندگی راز دار حسن و عشق بھی ہے ۔ ان کے کلام میں یہ تمام صفاتی خصوصیات زندگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔ انہوں نے شعر کو حسن و عشق کی نازک نازک واردات، لطیف لطیف جذبات و محاکات، نفسیات و خیالات تک محدود رکھا ہے ۔ ان کے کلام میں حکیمانہ حقائق و معارف بھی ہیں ۔ کلام کا مجموعہ شاخ نبات کے تاریخی نام (۱۳۵۳ھ) سے چھپ چکا ہے ۔

طالب انصاری ۔ طالب انصاری گنور بدایوں کے رہنے والے ہیں ۔ آپ کے والد شیخ برکت اللہ وہاں کے قدیم شہرفا سے تھے ۔ تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی ۔ طالب ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے ۔ عربی تعلیم مولوی محمد یوسف ہزاروی سے حاصل کر کے باقی تعلیمی طلب اور تشنگی خود ہی پوری کی ۱۹۲۶ء میں تلاش معاش میں لاہور پہنچے ۔ یہیں منشی فاضل اور میٹرک کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے ۔ کئی سال سے گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ (لاہور) میں مدرس ہیں ۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے ۔ فن عروض اور شاعری کی درس و تدریس کی پانچ چھ کتابوں کے علاوہ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ سرود حیات کے نام سے چھپ چکا ہے ۔ زبان پاکیزہ، انداز بیان سلجھا ہوا اور جذبات کم سے کم پھیکے ۔ حسن کی پوشیدہ خدوخال کا نام نہیں ۔ ایک پرسکون ندی ہے کہ خاموشی سے بہتی چلی جاتی ہے ۔

عابد شاہجہان پوری ۔ عابد حسین نام ۔ عابد تخلص ۔ وطن شاہجہان پور عمر ۷۰ سال کے قریب ہے ۱۹۱۸ء میں اعتبار الملک حضرت دل شاہجہان پوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں فارغ الاصلاح ہو گئے ۔ اب کئی خوشگو شعرا آپ کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں آپ کو تمام اصناف سخن پر قدرت ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ آپ کا میدان غزل قطعہ اور رباعی ہے ۔ مرثیہ میں بہت اچھا دخل ہے ۔ زبان میں لوچ اور حلاوت اور انداز بیان میں ندرت اور شگفتگی ہے ۔

عاصی کرنالی ۔ جناب عاصی کرنالی بقول ماہر القادری "ان ممتاز شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے معاشرے کو پاکیزہ فکر، شعر و ادب کو حسین اسلوب اور زبان کو ندرت و روانی دی ہے ۔ عاصی کے کلام میں متوازن فکر، مقصدیت اور عمل و حرکت کی قوت پائی جاتی ہے عاصی نے زبان کو بگاڑا نہیں سنوارا ہے اور گیسوئے اردو کی مشاطگی کی ہے" رگ جاں ان کے کلام کا مجموعہ ہے ۔

عبرت صدیقی ۔ محمد تبارک علی نام عبرت تخلص ہے ۔ اردو ہندی کی تعلیم سرکاری مدارس سے حاصل کی ۔ عربی فارسی مکاتب کے علاوہ اپنے والد ماجد منشی مبارک علی صدیقی سے پڑھی جو فارسی عربی کے متبحر عالم تھے ۔ ۱۹۲۷ء سے سررشتہ تعلیم میں ملازم ہیں اور گزشتہ سولہ سال سے شاہ آباد بریلی میں ہیڈ ماسٹر ہیں ۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے ۔ بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے ۔ اعتبار الملک

حکیم المشرق حضرت دل شاہجہانپوری کی توجہ نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا - قدرت نے درد بھرا دل ودیعت کیا ہے عام طور پر صوفیانہ خیالات نظم کرتے ہیں - خوفِ الٰہی کا دامن کسی عالم میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا - ترقی پسند ہیں - لیکن اس کے گمراہ کن اثرات سے متاثر نہیں - حقیقی کیفیت سرور سے [illegible] اندر زندہ ہونے کے لئے شعر کہتے ہیں - ان کی شاعری انہیں پاکیزہ جذبات اور گہرے حیات کی آئینہ دار ہے -

---

عبدالعلیم آسی - سکندر پور ضلع بلیا کے رہنے والے، ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے طالب علمی کے زمانے ہی سے طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی جانشین علی اعظم سے تلمذ تھا پچاسی برس کی عمر پا کر ۱۳۳۵ھ میں وفات پائی یہ اپنے وقت کے باکمال بزرگ جید عالم اور حاذق طبیب بھی تھے - ایک مختصر سا دیوان عین المعارف ان کی وفات کے بعد اسی سال مطبع سلیمانی بنارس سے شائع ہوا - کلام تغزل کے رنگ میں ہے جس میں شوخی بلند پروازی، بے ساختگی، مناسب و موزوں الفاظ کا اہتمام پایا جاتا ہے - تغزل میں جابجا تصوف کا فلسفہ نظر آتا ہے
دیباچہ عین المعارف (دیوان آسی) خمخانۂ جاوید ج ۱ ص ۶۳ - ۶۵، جواہر سخن چوتھی جلد ص ۲۱۴)

عزیز صفی پوری - منشی ولایت علی خاں عزیز کے والد محمد یحییٰ علی خاں، دادا ثابت علی خاں اور پردادا رونق علی شاہان اودھ نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر محمد علی شاہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں میر منشی تھے منشی ولایت علی خاں ۱۸۴۱ء یا ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے - نو برس کی عمر تک مکتب میں پڑھتے رہے - بعد ازاں مولوی محمد حسن بنگالی اور مولوی محمد رضا باگرمؤی سے عربی فارسی پڑھی - ۱۴ یا ۱۵ برس کے ہوئے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ گیا - واجد علی شاہ ٹیا برج چلے گئے - اس کے بعد غدر ہو گیا اور عزیز کے مکانات جو شاہی محل کے قریب تھے لوٹ کر کھود ڈالے گئے - عزیز جان بچا کر صفی پور ضلع اناؤ (اودھ) میں پہنچے گئے جہاں ان کا ننہال تھا اور باقی عمر وہیں گزار دی -

اسی زمانے میں عزیز نے پنج رقعہ فارسی میں لکھا، شعر کہنے شروع کئے اور غالب کو اصلاح کے لئے لکھا - غالب نے نثر تو پسند کیا اور اصلاح کلام منظور کی - اس کے بعد عزیز نے سرور کے فسانۂ عجائب کو فارسی میں نظم کیا اور غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا - غالب نے لکھا کہ فسانۂ عجائب کو اگر میں خود بھی فارسی میں لکھوں تو سرور سے زیادہ دلچسپ نہ ہو گا پھر میری ۶۶ برس کی عمر ہے اتنا کثیر کلام (بارہ ہزار اشعار) دیکھنے سے معذور ہوں عزیز نے دوبارہ لکھا کہ اگر آپ نہ دیکھیں گے تو میں کتاب چاک کر ڈالوں گا - چنانچہ عزیز نے اپنے پاس کا نسخہ چاک کر ڈالا -

عزیز فارسی کے شاعر ہیں اور ان کی کل تصانیف نثر و نظم فارسی زبان میں ہیں جن میں سے ارمغان و نور رہا اور رسالہ اشعار الاشعار شبلی اور حالی پسند فرما چکے ہیں - اردو کلام کا مجموعہ حاجی محمود علی انصاری نائب ناظم و مجسٹریٹ درجہ اول ریاست بھوپال کے اہتمام سے نظم دلفریب کے نام سے چھپ چکا ہے - (شباب اردو مارچ ۱۹۲۳ء)

عشق - رکن الدین نام، مگھیا عرف تھا - دہلی کے مشہور درویش شاہ فرہاد کے نواسے تھے - شروع جوانی میں دہلی سے مرشدآباد گئے - جب تک وہاں رہے دنیوی اعزاز حاصل رہا - وہاں سے عظیم آباد آئے تو فقر و درویشی ساتھ لائے اور توکل کے سوا کوئی سرمایہ پاس نہ

تھا۔ غزلوں میں تصوف کی چاشنی بھی ہوتی ہے، انداز بیان دل نشین، زبان سلیس اور اثر انداز ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۲۱۱)

عیش فیروزپوری ۔ جان محمد خاں نام، عیش تخلص ہے۔ آپ کے بزرگ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ عیش ۱۸۸۸ء میں فیروزپور چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ عیش و آرام کے سامان مہیا تھے۔ تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ تقسیم ہند (اگست ۱۹۴۷ء) تک فکر معاش سے بے نیاز رہے۔ صرف شعر و شاعری اور شکار کا شغل تھا۔ ابتدا میں حکیم کوثر حیدرآبادی سے بعد میں مولانا رضا فرنگی محلی لکھنوی سے پھر علامہ نظم طباطبائی سے مشورۂ سخن کیا۔ اور غزل گوئی میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آپ کی زبان شیریں اور پرکیف، انداز بیان پرزور اور تخیل بلند ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد وہ اسیرانِ غفلت فیروزپور ہی میں رہ گیا اب خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔

عیشی ۔ طالب علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے۔ فارسی میں قتیل سے اصلاح لیتے تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے مگر دونوں دیوان نایاب ہیں۔ بعض اور کتابیں بھی ان کی تصنیف سے تھیں مگر اب [illegible] ملتیں۔ بیان میں زور، بندش میں چستی اور خیالات میں رفعت کے باوجود کلام پر تکلف ہے۔ کہیں کہیں مصحفی کا رنگ جھلک جاتا ہے (جواہر [illegible]

غافل ۔ منور خاں نام، میر محمد خاں گویا کے دوست، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد [illegible] خوش گو شاعر ہیں ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہے ان کی زبان میں شیرینی اور طرز بیان میں دل نشینی ہے۔ ان کی شاعری درد سے خالی نہیں مگر احساسی کیفیت غالب ہے۔ ان کی بعض غزلیں عوام میں مشہور ہیں (جواہر سخن)

غضنفر ۔ غضنفر علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، جرأت کے شاگرد تھے۔ کلام میں صفائی اور روانی ہے۔ محاورہ بندی کا خیال زیادہ ہے۔ واردات عشق کے علاوہ دوسرے مضامین بہت کم نظر آتے ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۴۹۳)

فیض ۔ میر شمس الدین نام، دکن کے رہنے والے، امیر اور فارغ البال فاضل اور صوفی تھے۔ اشعار میں ہندی الفاظ اور محاورات اکثر لاتے ہیں، تاہم دہلی کے رنگ میں صاف اور سلیس کہتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی دیوان چھپ چکے ہیں۔ ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ (دکن میں اردو۔ جواہر سخن)

منشی محمد الدین فوق ۔ محمد الدین نام، فوق تخلص تھا۔ فروری ۱۸۷۷ء میں موضع گوٹلی ہرناتھ میں پیدا ہوئے جو سیالکوٹ سے جنوب کی جانب دو تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آبائی وطن کشمیر تھا مگر کاروبار کی وجہ سے اکثر لاہور میں رہتے تھے۔ آپ ایک کامیاب اخبار نویس، مایۂ ناز مورخ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ شاعری میں پہلے احسان شاہجہان پوری کے، بعد میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ اخبار کشمیری کی ادارت کے علاوہ بےشمار کتابیں تصنیف کیں۔ کلام فوق اور نغمہ و گلزار نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے یادگار ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو

[illegible] میں انتقال ہوا۔

کامل ۔ علی میاں نام، کامل تخلص، محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔ ان کا خاندان [illegible] میں علم و فضل کے لئے مشہور و ممتاز ہے۔ لکھنؤ کے شعراء ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ کلام کا مجموعہ ان کے اعزا کے پاس موجود ہے۔ کامل معمولی مضمون کو بندش کی خوبی اور ترکیب کی چستی سے بہت بلند کر دیتے ہیں۔ تازہ مضامین بھی پیدا کرتے ہیں (جواہر سخن جلد ۳ ص ۱۴۴)

کسریٰ منہاس ۔ نام غلام حسن، تخلص کسریٰ ہے۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۱۲ء کو راولپنڈی کی ایک قدیم مردم خیز بستی سہد میں پیدا ہوئے۔ [illegible] تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ سکول میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں خالصہ نیشنل ہائی سکول سے (جو اب کا ظمیہ ہائی سکول کے نام سے مشہور ہے) میٹرک [illegible] کیا۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے عم بزرگوار میاں فضل الدین منہاس سے حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں امام الفن نواب فصاحت جنگ بہادر [illegible] تلمذ حاصل کیا۔ ان کی عدیم الفرصتی کے باعث اپنا کلام اعتبار الملک حضرت دل شاہ جہان پوری کو بھی دکھایا اور لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کی ذات گرامی سے بھی بہت سا فیض حاصل کیا۔ فن تاریخ گوئی کے متعلق بہت سے شکوک ان ہی کی توجہ سے حل ہوئے۔ مطالعہ زندگی کا خاص شغل ہے۔ تاریخ گوئی، علمی مباحث اور تنقید کا خاص شوق ہے۔ ہزاروں کتابیں خود خریدیں۔ قدیم مطبوعات اور قلمی نسخے سینکڑوں روپیہ صرف کر کے مختلف مقامات سے حاصل کئے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا ادبی سرمایہ ہے۔

کلیم ۔ محمد حسین نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر تقیؔ سے قرابت تھی، نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ فضل و کمال علمی میں بھی شہرت تھی۔ بیدلؔ کے طرز کی پیروی کرنے کی وجہ سے کلام صاف اور سلیس نہیں البتہ مضمون کے اعتبار سے بلند ہے۔ فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا، عروض و قافیہ پر ایک رسالہ اردو میں لکھا نثر رنگین میں بھی ایک کتاب یادگار چھوڑی (جواہر سخن، نکات الشعرا، مخزن نکات، تذکرہ میر حسن، سخن شعرا)

کوثر نیازی ۔ محمد حیات خاں نام، کوثر تخلص نیازی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نیازی کہلاتے ہیں۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۴ء کو موسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابھی عربی اور انگریزی کی تحصیل جاری ہے۔ دو سال تک سہ روزہ کوثر لاہور کی ادارت کرتے رہے ہیں گذشتہ پانچ سال سے ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور اور دو سال سے روزنامہ تسنیم لاہور کے عملہ ادارت سے وابستہ ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے۔ کلام کا ایک مجموعہ زندگی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ [illegible] کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ آپ کی غزلوں میں انداز حسرت کا اور جذبات محمد علی جوہر کے ہوتے ہیں۔

کیفی حیدرآبادی ۔ سید رضی الدین حسن نام، کیفی تخلص، حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ ان کی

طبیعت ایک (؟) پر اطمینان تھی، کئی دو غزلے اور سہ غزلے کہہ ڈالتے تھے۔ الفاظ و نزاکت کلام ان کر ہاتھ باندھے چلے آتے تھے۔ مگر غزلوں میں الفاظ کی شستگی زیادہ ہوتی تھی گویا مصحفی و داغ کے طرزِ تحریر کا تتبع ہوتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ کلام کمیٹی کے نام سے ۱۳۲۲ھ میں حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔

قبول ۔ مرزا مہدی علی خاں نام، مقبول الدولہ خطاب، محمد مرزا کے بیٹے، وطن لکھنؤ تھا۔ واجد علی شاہ کے مصاحب اور توپخانہ کے مادر المہام تھے۔ شاہ اودھ کے ساتھ کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ ناسخ کے شاگردوں میں صاحب دیوان تھے۔ کتاب "شمشیر خانی" کا ترجمہ بھی اردو نظم میں کیا ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ اشعار میں صفائی اور گداز ہے۔

گرفتار ۔ منگی بیگ نام، قوم کے مغل، فوج میں ملازم، حاتم کے شاگرد تھے۔ کلام میں تغزل کی شان ہے۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۴۰۵، مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی)

لطف ۔ مرزا علی نام اور لطف تخلص تھا کاظم بیگ کے فرزند اور استرآباد (ایران) کے رہنے والے تھے مرزا کاظم بیگ نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور دربار میں داخل ہو گئے، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔
لطف نے تھوڑے ہی عرصہ میں اردو دیکھ کر استادوں میں قدم رکھا اور غزلیں کہیں۔ انہوں نے اکثر تراکیب اور مضمون فارسی سے لے کر اردو کو مزین کیا دیوانِ لطف میں سلاست کے ساتھ ساتھ جذبات تغزل کا اظہار بھی ہے اور زبان و محاورہ کا لطف بھی تذکرہ گلشن ہند نہایت تحقیق سے لکھا ہے (جواہر سخن جلد اول ص ۳۴۴، گل رعنا، دیوان لطف)

لطیف انور گورداسپوری لطیف انور نام، انور تخلص، وطن گورداسپور ہے۔ تعلیم و تربیت سرحد میں ہوئی جہاں ان کے والد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اسلامیہ کالج میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورداسپور میں مقیم ہو گئے۔ جہاں سے اگست ۱۹۳۲ء میں آپ نے ماہنامہ پاسبان جاری کیا جو سرمایہ کی کمی کے باعث بند ہو گیا۔ تقسیم کے بعد انور لاہور چلے آئے۔ پہلے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر بچوں کا پروگرام مرتب کرنے پر ملازم تھے۔ اب اخبار نویسی کرتے ہیں۔ نظم کم اور غزلیں زیادہ کہتے ہیں۔ آپ کے رنگ تغزل میں میر اور فانی بدایونی کی سی جھلک پائی جاتی ہے زبان با محاورہ گو بہت سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ شعر یوں کہتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں۔ باتیں بھی ایسی جنہیں ہم گویا بھول گئے تھے اور اب وہ ہمیں یاد کرا رہے ہیں۔

مائل ۔ میر مہدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ غزل گوئی میں ایک خاص انداز کے مالک تھے۔ قدرت اللہ قدرت سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۳۲۴)

مدہوش ۔ سنت پرشاد نام، مدہوش تخلص، قوم کے کائستھ ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں بمقام باندہ (یوپی) پیدا ہوئے ۔ بی اے الہ آباد اور ایم اے آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں رادھا سوامی سنگت کے سکریٹری۔ بعد میں وہاں بانی انٹرمیڈیٹ کالج اور پریم ودیالہ ڈگری کالج میں اقتصادیات کے شعبہ کے صدر بنائے گئے۔ مدہوش کو فلسفہ اور روحانیات سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ عربی میں استعداد حاصل کی کہ قرآن شریف پڑھ سکیں، سنسکرت میں عبور حاصل کیا کہ وید اور گیتا کا مطالعہ کر سکیں۔ فارسی میں دستگاہ رکھتے ہیں اور مثنوی مولانا روم بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تصوف سے آپ کو اتنا شغف ہے کہ ہر وقت نانک، کبیر، سرمد، حافظ، اور مولانا روم کا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ اسی تحقیق اور مطالعہ کی برکت ہے کہ آپ کے کلام میں انسانیت اور روحانیت بھری ہوتی ہے۔ مدہوش کی شاعری کا انداز محض عاشقانہ نہیں بلکہ والہانہ ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں۔ جنہیں بقول فراق سپردگی، خستگی اور گداز کہتے ہیں۔ (دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء ص ۱۵۲ - ۱۵۱)

پیر مراد شاہ ۔ پیر مراد شاہ سادات قریشی کے ایک واجب التعظیم بزرگ تھے۔ آپ کے مشہور اسلاف میں سے ایک تو حضرت شیخ ابوالحسن بکاری (متوفی یکم محرم ۴۸۴ھ/۱۰۹۲ء) تھے جو حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے دادا پیر تھے۔ دوسرے سلطان التارکین شیخ حمید الدین حاکم والئے یکہ کران جنہوں نے سلطنت چھوڑ کر ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں فقر اختیار کیا اور ۱۹۷ برس کے سن میں ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء میں واصل بحق ہوئے۔ مزار آپ کا قلعہ مو مبارک ریاست بہاولپور میں ہے۔ تیسرے بزرگ قطب العالم حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی داماد سلطان بہلول لودھی تھے جو مو مبارک سے ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں لاہور آئے اور ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کی خانقاہ میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔ ان کے پوتے عبدالجلیل ثانی بن ابوالفتح ثانی کی پشت میں مراد شاہ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر ۱۳ برس کی ہوئی تو آپ کے والد پیر کرم شاہ عرف میتا شاہ ۱۱۷۱ھ میں پنجاب کی بدنظمی سے تنگ آکر اپنے خسر شیخ نور الحسین عقیلی الہاشمی سے ملنے لکھنؤ گئے۔ مراد شاہ نے نامہ مراد (۱۲۰۳ھ) میں اور ان کے چھوٹے بھائی پیر فرخ بخش (متوفی ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء) نے اذکار قلندری میں اس سفر کی تفصیل بیان کی ہے۔ کچھ عرصہ کی اقامت کے بعد ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں یہ قافلہ لاہور واپس آرہا تھا کہ شاہ جہان پور کے قریب قزاقوں نے پیر کرم شاہ کو شہید کر دیا۔ وہاں سے مراد شاہ ہانسی بریلی پہنچے اور راجہ صورت سنگھ دیوان مرزا امانی لکھنوی کے پاس چھ سال مقیم رہے۔ یہیں آپ نے مولوی بدر الدین رہتکی کے ہاتھ پر بیعت کی اور شاعری میں شاہ اجمل کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ۱۲۰۵ھ کے بعد آپ لاہور چلے آئے۔ یہیں آپ نے ۲۸ برس کے سن میں نامہ مراداں لکھی اور یہیں رمضان ۱۲۱۲ھ میں میر آمن سے پانچ سال قبل قصہ چہار درویش اردو نظم میں لکھنا شروع کیا مگر مکمل نہ ہوا تھا کہ ۳۰ رمضی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کو بعمر تیس سال اپنے مریدوں کے گاؤں مرمانہ تحصیل شاہدرہ ضلع شیخوپورہ میں انتقال کیا۔

مراد شاہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے لفظ اردو کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ بات کم از کم اہل پنجاب کے لئے باعث فخر ہے کہ اس کے ایک بزرگ نے اردو زبان کی خدمت کی اور ہندوستان میں رہ کر اس کو صاف کیا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے دیوان مراد انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۴۶ء میں چھپوا دیا ہے۔

محسن ۔ محمد محسن نام، خان آرزو کے بھانجے اور میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ بقول قائم نوجوانی ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے۔

محمود عالم رسا۔ ضلع پٹنہ میں بہآء ایک بستی ہے، وہیں کے رہنے والے ہیں حضرت نوح ناروی کے شاگردوں میں رنگین طبیعت، دردمند دل اور شاعرانہ انداز پایا ہے۔ لکھتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں ترقی پسند شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل میں آپ کا ممتاز رنگ ہے۔ نکہت گل اور سحر لیلیٰ دو مجموعے آپ کے شائع ہو چکے ہیں۔

مخمور۔ محمد جعفر نام، لکھنؤ کے رہنے والے مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی ان کی زبان کی صفائی اور روانی ہے۔ ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم ملتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے (جواہر سخن)

مسرور۔ شیخ میر بخش نام، کاکوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے، شیخ مصحفی کے شاگرد تھے۔ دہلی کی سیاحت بھی کی تھی غزل کا رنگ اچھا ہے۔ بلند مضامین پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضمون آفرینی میں مصحفی کا انداز اختیار کیا ہے۔ حتی الوسع کوئی لفظ بیکار نہیں لاتے۔ زبان شستہ، ترکیب صاف اور بندش چست ہوتی ہے۔ بے ساختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔

ممتاز۔ حافظ فضلو نام، سودا کے شاگرد تھے۔ وطن دہلی تھا مگر دکن میں قیام کر لیا تھا۔
ممتاز کی زبان میں صفائی اور روانی، بیان میں درد و اثر اور تشبیہات و تمثیلات میں جدت و ندرت ہے (جواہر سخن)

مجذوب۔ مرزا غلام حیدر نام، دہلی کے رہنے والے، مرزا رفیع سودا کے متبنیٰ اور شاگرد ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

بدکہنے کو کسی کے معیوب جانتے ہیں - اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لاوے میرا سخن کہ مجذوب - سودا کا بیٹا جو کو مجذوب جانتے ہیں

مجذوب کی غزل میں بھی سودا کا رنگ نمایاں ہے "صفائی میں سودا سے زیادہ، درد اور گداز میں کم ہیں" (جواہر سخن)

ماہر۔ فخر الدین خاں نام، آباو اجداد دہلی کے رہنے والے تھے مگر ماہر نے لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔ اشرف علی فغاں کے بیٹے اور سودا کے شاگرد تھے۔ (جواہر سخن)

ماہ۔ مرزا عنایت علی بیگ نام، حاتم علی مہر کے چھوٹے بھائی اور خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے اکبر آباد میں قیام کر لیا تھا۔ کلام میں معنوی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مضامین بلند اور پرکیف ہوتے ہیں اکثر اشعار کی گرمی میں آتش کا شعلہ موجود ہے۔

منتہی۔ مرزا مہتاب بیگ نام، لکھنؤ کے رہنے والے، آتش کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد باندہ چلے گئے۔ نواب باندہ

[illegible] خاص مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ پہلا دیوان غدر کی افراتفری میں ضائع ہو گیا۔ بانڈہ میں جب دوسرا دیوان تکمیل کے قریب پہنچا تو وہاں [illegible] ہو گئی اور دوسرا دیوان بھی غدر کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آخری عمر میں حیدر آباد چلے گئے۔ نواب میر خیرات علی خاں نظام کے جانی نے انہیں [illegible] دینی اور مشورہ کرنے لگے حیدر آباد کے قیام میں جو دیوان مرتب ہوا گلزار ستان فصاحت کے نام سے شائع ہوا۔ غالباً ۱۳۱۱ھ سے پہلے وفات پائی۔ [illegible] کے کلام میں کمی نہیں۔

منظور ۔ چودھری منظور احمد، ٹھیٹ پنجابی ہیں۔ وہ وسط پنجاب کے ایک ممتاز گھرانے میں نومبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا چودھری حیات محمد منڈی آباد میں آنریری مجسٹریٹ اور ذیلدار تھے۔ آپ کے والد چودھری سلطان علی اور چچا خان بہادر چودھری نادر خان ریٹائرڈ پی سی ایس پنجاب کے زمیندار طبقہ میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ منظور صاحب بی اے ایل ایل بی کی ڈگریاں پاس ہونے کے بعد میونسپل بورڈ کے سیکرٹری ہیں۔ ان کے دماغ میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔ تخیل بلند اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے جذبات داخلیت کی روح رواں اور احساسات خارجیت کی جان ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ دیر و حرم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

منیر نیازی ۔ محمد منیر خان نام ہے۔ نیازی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہوشیار پور کے نواح میں پھیلی ہوئی ایک پٹھان بستی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بی اے تک امر سنگھ کالج سرینگر (کشمیر) میں حاصل کی۔ نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "تیز ہوا اور تنہا پھول" چھپ چکا ہے۔ دو مزید مسودہ مجموعے زیر طبع ہیں۔ آج کل لاہور میں فلمیں لکھ رہے ہیں۔

بشیر منذر ۔ یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چوتھی جماعت ہی میں شعر گنگنانا شروع کر دیئے تھے۔ آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کیا اور پہلی مکمل نظم بھی کہی۔ نویں جماعت میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے امتحان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ابتدائی زندگی مصائب کا مقابلہ کرتے گزری۔ حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے بی اے کے مراحل طے نہ کر سکے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد زمیندار ہائی سکول گجرات میں مدرس ہو گئے۔ بعد میں کچھ عرصہ گجرات کے ہفت روزہ "محب کسان" کی ادارت کی۔ جون ۱۹۴۳ء سے ایک سرکاری محکمے سے منسلک ہیں۔ شاعری میں نظمیں، غزلیں اور گیت سبھی کچھ کہتے ہیں۔ نثر میں ایک ناول "عالیہ" لکھا ہے۔

نصرت ۔ نصرت تخلص تھا۔ جرأت کے شاگرد تھے۔ ثقیل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا میلان سلاست اور صفائی کی طرف معلوم ہوتا ہے (جواہر سخن)

ناظم لکھنوی ۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی سادات بارہ کے مشہور بادشاہ گر خاندان کی یادگار تھے۔ بڑے خوش وضع، خوش گو اور خوش باش شاعر تھے۔ وہ مرثیہ میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اور اس فن میں انہیں میر انیس کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ناظم نے وطن کو خیرباد کہہ کر لاہور میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے کوہ نور کی ادارت کی۔ پھر اپنا ہفتہ وار اخبار ناظم الہند جاری کیا اور لاہور کے مشاعروں میں خوب دھاک بٹھائی۔ ابتدا میں غزلیں بہت اچھی کہتے تھے لیکن آخری عمر میں صرف مرثیہ کے ہو گئے تھے۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لاہور ہی میں وفات پائی۔

نظیر لودھیانوی ۔ اصغر حسین خاں نام، نظیر تخلص، وطن لودھیانہ، منشی محمد نجیب خاں نشاط کے فرزند ہیں جو اردو فارسی کے نامور شاعر تھے۔ نظیر [illegible] میں پیدا ہوئے۔ [illegible] میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ [illegible] میں مولانا تاجور مرحوم کے ایما پر لاہور آکر اردو مرکز سے منسلک ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت اختیار کرکے شیخوپورہ، گوجرانوالہ، فیروزپور رہے۔ اور [illegible] میں ملازمت چھوڑ کر پھر لاہور آگئے۔ اس دوران میں ماہنامہ پاسبان گورداسپور، ماہنامہ صبح امید لودھیانہ کی ادارت بھی کی۔ اسی اثنا میں بیست سالہ کلام کا مجموعہ "صبح نشاط" کے نام سے بھی شائع کیا۔ لاہور آکر پہلے ادارۂ زمیندار سے منسلک ہوئے۔ پھر نوائے وقت سے وابستہ ہوگئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد روزنامہ شہباز کے ادارے سے منسلک ہوکر پشاور چلے گئے۔ وہیں سے ہفت روزہ تنویر بھی جاری کیا۔ آغاز [illegible] میں پھر لاہور واپس آگئے اور اب روزنامہ امروز کے مجلس ادارت میں ہیں۔ آپ کے کلام پر علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کا رنگ غالب ہے۔

نور ۔ میر وزیر علی نام، نور تخلص، میر بادشاہ لکھنوی کپتان فیروزپور کے بیٹے، فتح پور میں دیوانی کے سررشتہ دار تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں امین ہوگئے۔ ان کے والد اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ نور کو ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے نور تخلص تجویز کرکے اپنے شاگرد مرزا محمد رضا برق کے سپرد کیا۔ ان کا دیوان "ضیائے نور" کے نام سے ۱۲۹۶ء / ۱۸۷۹ء میں چھپ چکا ہے۔ تغزل میں ناسخ کا رنگ ہے۔ رعایت لفظی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ (جواہر سخن جلد ۴ ص ۸۹ سخن شعرا)

حکیم نیر واسطی ۔ سید علی احمد نام، نیر تخلص ہے۔ [illegible] میں ضلع بجنور کے قصبہ نہٹور کے واسطی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید مظفر حسین نگینہ ضلع بجنور کے ممتاز لیڈر تھے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی امتیاز حسین اور مولانا حامد حسن گنگوہی سے حاصل کی اور طب کی چند کتابیں حکیم کفایت اللہ سے پڑھیں۔ پھر تکمیل علوم کے لئے دہلی اور لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج سے سند فراغت حاصل کی نیز حکیم مظفر حسین، حکیم منے آغا صاحب، حکیم محمد تقی اور شفاء الملک حکیم عبد الحمید کی شاگردی اختیار کرکے عملی تجارب حاصل کئے۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں لاہور آکر اپنے مطب کا آغاز کیا۔ تھوڑے عرصہ میں مرجع خلائق بن گیا۔ اور اس وقت سے اب تک آپ کو طبی اداروں اور طبی سیاسیات میں بہت اونچا اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ علمی تحقیقات کے سلسلے میں آپ ایران، ترکی، انگلستان وغیرہ کی سیاحت بھی کر چکے ہیں اور طب عرب اور ترکی نظام طب کی تاریخ پر دو کتابیں بھی شائع کر چکے ہیں۔

شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن ہی سے ہے۔ شاعری کی ابتدا میں سید نقی حیدر سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد دہلی پہنچ کر نواب سراج الدین سائل، مولانا وحید الدین بیخود اور میر ناصر نذیر فراق کی صحبتوں سے اکتساب فیض کیا۔ جب لکھنؤ پہنچے تو حضرت عزیز لکھنوی اور صفدر مرزا پوری کی علمی مجلسوں سے فائدہ اٹھایا۔

تیس سال گزرے آپ کی ایک کتاب میکدہ کے نام سے شائع ہوئی تھی جو آپ کی نظموں کا ابتدائی مجموعہ تھی۔ چند سال ہوئے آپ نے ایک کتاب اختر و سلمیٰ لکھی تھی جو اختر شیرانی کی حیات معاشقہ سے متعلق تھی۔ اب آپ کا مجموعہ کلام شعر و حکمت کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

نیرنگ ۔ میر غلام بھیک نیرنگ دوراہہ ضلع انبالہ کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ آپ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے، غزل، نظم، مضمون، تقریر سب پر قادر تھے۔ آپ کا شمار پنجاب اسکول کے اس گروہ سے ہوتا ہے جو مولانا حالی کے بعد سرسید سے متاثر ہوا اور جس نے شاعری میں زندگی کے مسائل داخل کئے۔ کلام نیرنگ (۱۹۰۷ء) اور غبار افق دو کتابیں یادگار ہیں۔ آخری عمر میں آپ نے شعر گوئی چھوڑ کر قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد کراچی چلے آئے پاک دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو لاہور میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔

واسطی ۔ سید فضل رسول خاں نام، سندیلہ کے رئیس تھے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ ان کے مورث میر علاؤالدین واسطی نے علاؤالدین کے عہد میں سندیلہ فتح کر کے وہاں سکونت اختیار کی تھی۔ فضل رسول ۱۹ رجادی الاول ۱۲۷۶ھ میں

پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم امیٹھی میں ہوئی۔ عربی مشہور طالب علموں سے پڑھی۔ علم طب اپنے والد سید عبدالشکور سے پڑھا۔ شاعری میں امیر کے شاگرد تھے ان کے کلام کا مجموعہ دیوان کی صورت میں طبع ہوا۔ کتاب تنبیہ الغافلین غدر کے ہنگامے میں ضائع ہوگئی۔ اخلاقی اشعار غزل سے بہتر ہیں۔ الفاظ کا اہتمام زیادہ معانی کا لحاظ کم ہے۔

وسیم خیرآبادی ۔ سید محمد عسکری نام، وسیم تخلص خیرآباد کے رہنے والے امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ سایہ لغات کی ایک جلد کی ترتیب انہی نے کی ہے۔ مدت تک مہاراجہ جونپور کے درباری شعرا میں شامل رہے۔ تحقیق و صحت الفاظ کا ان کو بہت شوق ہے۔ رسالہ گلچیں آپ کی ادارت میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ تغزل کا رنگ ریاض خیرآبادی سے ملتا ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ (آب بقا)

وفا ۔ نول رائے نام تھا، خوش گزران اور خوش اوقات تھے۔ بعضوں کے قول کے مطابق خواجہ حسن کے معاصر تھے۔ کلام میں قدرت اور مہارت کا رنگ ہے اس کے ساتھ ضروریات غزل بھی ہیں۔ سلاست اور روانی بھی ہے، طرز بیان میں خوبی بھی ہے لیکن اثر کم ہے (جواہر سخن جلد اول ص ۳۸۳ مخزن نکات)

وفا ۔ پنڈت میلارام سیالکوٹ کے موضع دیوکے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن گھر کے ڈھور ڈنگر چرانے میں گزرا۔ دیہاتی سکول کی پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ شعر موزوں کرنے لگے۔ سکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں آئے یہاں آپ کی شاعری نے اور ترقی کی بی اے پاس کرنے کے بعد اخبار نویسی شروع کی۔ لاہور کے کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ وقتاً فوقتاً اپنے اخبار بھی نکالے جو چل نہ سکے پاکستان کے قیام کے بعد بھارت چلے گئے۔
آپ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ زبان نہایت شستہ، پاکیزہ اور رواں استعمال کرتے ہیں۔

ولی ۔ سید شاہ ولی الرحمٰن نام، ولی تخلص ہے ۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بہاری شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں فارسی پر بڑی قدرت حاصل ہے ۔ اردو کے بھی بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں ۔ آپ ضلع گیا کی ایک بستی کاکو کے رہنے والے ہیں ۔ نظم اور غزل دونوں اصناف پر قادر ہیں ۔

ہادی مچھلی شہری ۔ ہادی مچھلی شہری علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور اردو فارسی نظم و نثر کے ایک ممتاز اور نہایت ہی پرگو ادیب ہیں ۔ طبیعت بحر بیکراں ہے ۔ وفات کر چکے ہیں ۔

ہوش ۔ نیاز احمد خاں نام، نواب خطاب تھا؛ بریلی کے رہنے والے تھے برسوں تک لکھنؤ میں رہے، وہاں طب اور

شاعری دونوں کی مشق ساتھ ساتھ جاری رکھی ۔ معقولات اور منقولات کی تعلیم مشہور اساتذہ سے حاصل کی ۔ فن شاعری میں حکیم محمد محسن علی خاں جوشش بریلی سے استفادہ کیا ۔ آخر میں آتش کے شاگرد ہوئے ۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۱۲۸۹ھ میں وفات پائی ۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ۔ کلام صاف اور سلیس ہے ۔ لیکن قصیدوں کے مقابلے میں غزلیں زیادہ کامیاب نہیں ۔

یکرنگ ۔ مصطفیٰ قلی خاں نام تھا، خان جہاں لودھی کے نواسے اور سلسلہ ملازمت شاہی میں وابستہ تھے ۔ اشعار میں آمد کا رنگ غالب ہے، تغزل میں سوز و گداز موجود ہے ۔ اکثر اشعار سلیس اور صاف ہیں، بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ آبرو کا، اور بعض نے آرزو کا شاگرد لکھا ہے ۔ نیز مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں ۔ (جواہر سخن، مخزن نکات، نکات الشعرا، چمنستان شعرا، گلشن ہند)

تازہ پیشکش

خالدؓ

حضرت خالد بن ولید کے مجاہدانہ کارناموں سے کون واقف نہیں۔ مگر اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس سپہ سالار کی شخصیت میں بحیثیت انسان کے کیا کیا عظمتیں تھیں ذاتی کردار کیا تھا اور اس نے اس کی جنگی فتوحات پر کیا اثر ڈالا۔ یہ کتاب عربی کے مشہور شخصیت نگار عباس محمود العقاد کی لکھی ہوئی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی پیشکش ہے۔ قیمت فی جلد ۔/۱/۴

عرب کے تین مدبر

اسلام نے کئی صاحب تدبیر شخصیتیں پیدا کیں۔ مگر مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن ابی سفیان، عمرو بن العاص ایسے مدبر اسلام کی پوری تاریخ میں کم ملیں گے۔ یہ کتاب آپ کو بتلائے گی کہ کیسے کیسے کٹھن موقعوں پر ان صاحبان تدبیر نے وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ عمر ابو النصر کی تصنیف ہے جس کے قلم کا لوہا اردو دان طبقہ بھی مان چکا ہے۔ قیمت ۔/۱/۳

بھابی

"مجھے میرا بھائی گلی گلی بیچ جائے"۔ یہ کہاوت تو نہ جانے کب سے سننے میں آ رہی ہے۔ مگر ناول بھابی کے ہیرو نے اس کو واقعہ کر دکھایا ہے کہ جب کبھی ملے ایک نئی خاتون کے ساتھ ملے اور ہر مرتبہ اس خاتون سے یہی کہہ کر تعارف کرایا کہ "ان سے ملئے یہ آپ کی بھابی ہیں"۔ ایسا باغ و بہار کردار اور شوکت تھانوی کا شگفتہ انداز بیان میں مزا آ گیا۔ قیمت ۔/۸/۴

خدیجہؓ

اسلامی تاریخ کے لکھنے میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ کتاب اس پاکباز اور اعلیٰ شخصیت خاتون کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ عبدالحمید الزہراوی کی اس کتاب کا مطالعہ ہدایت کا موجب ہوگا۔ قیمت ۔/۱/۴

نیلوفر

شوکت تھانوی کا یہ ناول بہترین ناول ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک اسے نہیں پڑھا تو آپ عام ادب کی ایک نادر کتاب کے مطالعہ سے محروم ہیں۔ قیمت ۔/۶/۱

نمک مرچ

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر مضمون جانِ ظرافت ہے۔ قیمت ۔/۱/۳

ادارہ
فروغِ اردو، لاہور

باغ و بہار

عبدالمجید عدم کے تازہ ترین قطعات کا مجموعہ قیمت ۔/۱/۳

ہماری کتابیں

نیلوفر	شوکت تھانوی	۶/-	بی اتی	عمر ابوالنصر	۵/-
مولانا	"	۲/۸	خلفائے مصر	"	۱۰/-
غزالہ	"	۶/-	شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	۷/۸
خدانخواستہ	"	۲/-	امراؤ جان ادا	رسوا	۴/-
سودیشی ریل	"	۳/-	مغشو	ابوسعید قریشی	۲/۴
کتیا	"	۳/۸	قول و قرار	عدم	۲/۸
سالی کو آنا	"	۳/۸	پیچ و خم	"	۲/-
سسرال	"	۲/۴	سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
کارٹون	"	۳/۸	آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
مایہ دولت	"	۳/۸	بازاریات	"	۳/-
بقراط	"	۲/۸	نقوش لطیف	"	۶/-
جوڑ توڑ	"	۴/-	عزیزوں کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
مضامین شوکت	"	۲/۸	ید بیضا	عابد علی عابد	۵/-
قاضی جی [illegible]	"	۱۰/۸	سیاست الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
غالب کے اڑنے	"	۲/۸	مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
ذخیرہ وغیرہ	"	۳/-	پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۴
بھابی	"	۴/۸	صاحب	محمد طفیل	۳/-
روزن	قتیل شفائی	۳/-	انتقاد	عابد علی عابد	۳/-

ادارہ فروغ اردو، لاہور

نقوش
کا
غزل نمبر

ادارۂ فروغ اُردو۔ لاہور کی وہ بیش قیمت پیش کش تھی، جسے ادبی حلقوں نے وقت کی سب سے بڑی ادبی خدمت قرار دیا۔ اب یہی ادارہ شعرائے اُردو کی غزلوں کے بہترین انتخابات کئی جلدوں میں شائع کر رہا ہے، جن کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کے لیے صرف اتنا کہہ دینا غالباً کافی ہے کہ وہ ادارۂ فروغ اُردو۔ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو رہے ہیں۔ یہ انتخابات آپ پر شعرائے سلف کے متغزلانہ کمالات ہی واضح نہیں کریں گے، بلکہ نصف صدی پہلے تک کی غزل کے تمام ارتقائی مدارج اور موڑ بھی آپ کے سامنے آئینہ کر دیں گے۔

شائع ہونے والے انتخابات یہ ہیں

(۱) انتخاب میر　(۲) انتخاب سودا　(۳) انتخاب درد　(۴) انتخاب میر حسن

(۵) انتخاب جرأت　(۶) انتخاب مصحفی　(۷) انتخاب غالب　(۸) انتخاب مومن

(۹) انتخاب ذوق　(۱۰) انتخاب آتش　(۱۱) انتخاب امیر　(۱۲) انتخاب داغ

(۱۳) انتخاب نظیر　(۱۴) انتخاب حالی　(۱۵) انتخاب شیفتہ　(۱۶) دہلی اسکول

(۱۷) لکھنؤ اسکول

اور [illegible]

صحت کے علاوہ، فنِ طباعت کی بھی تمام تر خوبیوں کی آئینہ دار ہیں

اگر آپ

ہمارے ہاں درج کرا دیں گے، تو جیسے جیسے انتخابات چھپتے جائیں گے۔ آپکو ملتے رہیں گے۔

ادارۂ فروغ اُردو ، لاہور